



PDFBOOKSFREE.PK

سیرت محمد علی

مرتبہ

رئیس احمد جعفری - ندوی

بِسْمِ اللّٰهِ

سیرت محمد علی

مُرتَبَّہٗ

رئیس احمد جعفری - ندوی

شائع کردہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

قیمت ۱۷

۱۳۳۶ھ

مطبوعہ جامعہ برقی پریس، دہلی



پہلی شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ، علی گڑھ
(سنہ ۱۹۲۲ء)

فہرست

عرض نامہ

دیباچہ - از مولانا عبدالمجید صاحب بی۔ اے۔ - دیر "جج"

اشارات

حصہ اول

۱۲۳	اخلاق و رواداری	باب ۱	صفحہ ۱	تمہید	
۱۲۸	ایشیا و ہستنا	۲۰	۸	ابتدائی حالات	۱
۱۳۳	رہائے عامہ پر لکھئے۔	۲۱	۱۱	علی گڑھ	باب ۱
۱۳۶	مایوسی	۲۲	۱۴	اگسفر	۳
۱۴۰	ہندوؤں سے دل برداشتگی	۲۳	۲۰	انگریزی قابلیت	۴
۱۴۴	علاقت	۲۴	۲۸	ذوق نقض اور وسعت مطالعہ	۵
۱۵۳	وفات	۲۵	۳۳	قیادت کا عصب اعتراف	۶
۱۵۶	قابل رشک نامش	۲۶	۴۲	حق گوئی	۷
۱۵۹	سیکھین و تدفین	۲۷	۵۳	تہ تبر	۸
۱۶۲	جلوس اور جلسے	باب ۲	۵۹	کردار	باب ۹
۱۶۶	عام اظہار آرا (۱)	۲۹	۶۶	غرم دستمال	۱۰
۱۶۹	عام اظہار آرا (۲)	۳۰	۶۹	مذہبیت	۱۱
۱۷۲	مذہبیت	۳۱	۷۹	شوخی طبع سے	۱۲
۱۸۰	کچے جیند	۳۲	۹۰	قومیت اور ملیت	۱۳
۱۸۲	یادگار کی تجویزیں	۳۳	۹۲	وطن پروری	۱۴
			۹۶	جمہوریت جہنیت عقیدہ	۱۵
			۱۰۰	شاعری	۱۶
۱۸۴	ملازمت	باب ۳	۱۱۴	طول نویسی	۱۷
۱۹۶	کامریڈ	۲	۱۱۴	رفق و محبت	باب ۱۸

حصہ دوم

۳۰۰	جج و حجاز	باب ۲۰۱	مسلم یونیورسٹی	باب ۳
۳۰۲	آویزش نجد و حجاز	۲۹	مسلم لیگ	۴
۳۹۰	مؤتم عالم اسلام	۳۰	طبی وفد	۵
۴۰۲	حدیث حسن صحیحہ	۳۱	ٹرنز مارسین کمپنی	۶
۴۱۲	ایپیل خلافت کانفرنس	۳۲	ہمدرد	۷
۴۲۲	قانون جج	۳۳	ہنگامہ کانپور	۸
۴۲۵	دوبلہ بچوں کی عیدی	۳۴	جوائس آف دی ٹرکس	۹
۴۲۹	غبن	۳۵	نظر بندی	۱۰
۴۳۱	کتاب باجیل	۳۶	چھند وارڈ کے ایام اسیری	۱۱
۴۴۰	آل پارٹیز کانفرنس	۳۷	چھند وارڈ سے مقبول	۱۲
۴۴۴	چودہ نکات	۳۸	مقبول سے امرتہ	۱۳
۴۵۱	سائن کمیشن	۳۹	دہلی	۱۴
۴۶۰	سفر یورپ	۴۰	واٹر لے کے ہاں وفد	۱۵
۴۶۵	نہرو رپورٹ	۴۱	وفد خلافت یورپ	۱۶
۴۷۴	کلکتہ کانگریس	۴۲	جامعہ طیبہ	۱۷
۴۸۵	آل مسلم پارٹیز کانفرنس دہلی	۴۳	ناگیور کانگریس	۱۸
۴۹۴	وائٹ لے کا بیان	باب ۲۱۹	تحریک خلافت	۱۹
۴۹۹	جنوبی افریقہ	۴۵	معانی کا افسانہ	۲۰
۵۰۴	ساردا ایکٹ	۴۶	کراچی خلافت کانفرنس	۲۱
۵۱۰	علماء کانفرنس	۴۷	مقدمہ کراچی	۲۲
۵۱۸	لاہور کا قومی ہفتہ	۴۸	سفر کے بعد	۲۳
۵۲۱	گول میز کانفرنس	۴۹	رہائی اور کانگریس کی صدارت	۲۴
۵۲۴	تقریر	۵۰	عہد تعطل یا رد عمل	۲۵
۵۳۲	خراج تحسین	۵۱	کانگریس سے وفاداری	۲۶
۵۳۴	محمد علی بحیثیت قائد کے !	۵۲	یونٹی کانفرنس	۲۷

عرض بنشر

شہید ملت مولانا محمد علی مرحوم کے سوانح حیات کا ایک مختصر خاکہ ناظرین کی خدمت میں پیش ہے۔
انسان کی زندگی کائنات کا سب سے پوشیدہ راز ہے۔ اور انسانی شخصیت کو سمجھنا اور سمجھ کر
دوسروں کو سمجھانا اسی نسبت سے دشوار ہے کہ جب شخصیت محمد علی حبیبی جامع حیثیات ہو تو اس شواہد
کا کیا ٹھکانا ہے!

محمد علی کی زندگی کا بیان دراصل ایک قوم اور ایک ملت کے حال و مستقبل کی تفسیر کرنا ہے کہ
محمد علی اسلامی ملت اور ہندی قوم کا قائد تھا اور نمائندہ بھی۔ ایک بیدار ہونے والے ملک ایک خواب
گراں سے جاگنے والی ملت کی ساری بیانی، سارا اور شوق، ساری سرگرمی، ساری خود فراموشی
اس ایک پیکرِ خاکی میں جلوہ گر تھی۔ یہی نہیں اس کی ذات آغاز کار کی تمام تکلیفوں اور پریشانیوں،
بے ترتیبیوں اور ہنگاموں کا منظر بھی تھی نا مساعد حالات سے جنگِ یم، بے سرو سامانی، بے یاری و
بے مددگاری، ہمرہوں کی خفہ پائی، ہم نواؤں کی کج فہمی، غرض کو نہی چوت تھی جس نے اس کی روح
کے گوشہ گوشہ کو گھائل نہ کر دیا ہو، وہ ہماری قومی اور ملی زندگی کی اجمالی تصویر تھا، ان صفحات میں اس
تصویر کا ایک عکس ضرور ہے، مگر بس ایک خاکہ، دھندلا سا اور نامکمل اس کی تکمیل کا پورا حق بیویں
صدی میں اسلام اور ہندوستان کی سرگذشت لکھنے والا مورخ ادا کر سکے تو کر سکے۔

مگر اس نمائندہ اور قائد کے سینہ میں ایک گگ تھی جس کی چنگاری سے خفہ ملیں بیدار اور مردہ
قومیں زندہ ہو جاتی ہیں۔ وہ آگ جو کبھی ٹپسل دوستوں کے لیے بہت ناگوار شعلہ نوائی کی شکل میں ظاہر
ہوتی، کبھی آنسو بن کر اس کی سرشار محبت آنکھوں سے ڈھلتی تھی اپنے سینہ کے اس دھندلے آتش سے

وہ اپنی قوم کے نوجوانوں کے سینوں میں کچھ چنگاریاں منتقل کر گیا ہے۔ جو اس کے ان خوابوں کی تعبیر کی ضمانت میں انھیں نادان سمجھتے ہیں کہ اس کے ساتھ ختم ہو گئے۔ اس سیرت کے مرتب مولوی رئیس احمد صاحب جعفری انھیں نوجوانوں میں ہیں۔ انھیں اپنے موضوعات محبت ہی، عشق ہی، اور اس سے کیا عجب کہ یہ اس کیمیا اثر چنگاری کو دوسرے سینوں تک منتقل کرنے میں کامیاب ہوں۔ اگر یہ ہو تو ہم اپنی سعی کو مشکور سمجھیں گے۔

بہار

دیباچہ

از مولانا عبدالمجید صاحب بنی، لے، مدیر ”سیح“

بعض قریب ہیں سلامی ہند کی سرزمین نے جو چوٹی کے اکابر و مشاہیر پیدا کیے، اگر یہ سوال ہو کہ یہ کجاں
جامعیت ان میں سے کس کو بنایا جائے، اور کون ایک ایسا شخص انتخاب کیا جائے جس کی سوانح
حیات کے اندر جلال پوری عصر حاضرہ کی تاریخ آجائے تو جواب میں صرف ایک ہی نام لیا جاسکتا ہے، اور وہ
نام امت کے محبوب ترین ناموں ”محمد“ اور ”علی“ کا مجموعہ ہوگا !

اس نے دینے یقیناً بعض بڑے اور جلیل القدر علماء دین پیدا کیے، لیکن ان کی ناموری صرف
دینداروں کے طبقہ تک محدود رہی، بعض نامی و گرامی مشائخ طریقت پیدا کیے، لیکن ان کا نام بس مریدوں
اور معتقدوں ہی کی زبان تک رہا، بعض مشہور فارم پیدا کیے، لیکن ان کی اور ان کے ”رفارم“ دونوں کی
شہرت، انگریزی تعلیم یافتہ گروہ کے حدود سے لگے نہ بڑھی، بعض زبردست خطیب اور لیڈر پیدا کیے، لیکن
انہیں کانفرنسوں کے پلیٹ فارم اور کانگریسوں کے ڈائس کے باہر کسی نے نہ جانا، یہ جدید مشاہیر اور اکابر کجاں
دوسروں کی آوازیں اور بھی اپنی ترنگیں اور ان سے بھی تنگ تر دائروں میں گونج گونج کر رہیں، ملک
کے طول و عرض میں بس ایک ہی ہستی ایسی تھی جس کی آواز مشرق نے بھی سنی اور مغرب نے بھی، شمال نے
بھی اور جنوب نے بھی، ہمالیہ کی بلندیوں نے بھی اور گنگا کی لہروں نے بھی، پڑتے لکھوں نے بھی اور ان پر تو
نے بھی، عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی، بڑوں نے بھی چھوٹوں نے بھی، سرداروں نے بھی اور خاکساروں
نے بھی، شہر کے مندوبوں نے بھی اور دیہات کے گنواروں نے بھی۔ واسطے لاج کی حکمتی اور جگہ گاتی ہوئی

اس کا کلام سن سنکر ڈرائنگ روم کے کوچ اور صفوں کے کھلکھلا کر بہنے، اس کا پیام سن سنکر مسجد کے محراب منبر بلبل بلبل کر روئے، خانقاہیں اور مدرسے، پارک اور شاہ خانے، کھنڈراور ویرانے قوم پروروں کی کانگریس اور فرقہ پروروں کی کانفرنس، پریس اور پیسٹ فارم، دیوبند اور ندوہ، مذہبی خل او علی گڑھ جمیعۃ العلماء اور مسلم لیگ سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف سب کے سپر چیف پریس کے نقش قدم کے نشان سب کا ذرہ ذرہ اس کے خیر مقدم سے نطفہ اندوز!

معاصر و حریف بہت سے تھے پر قبول خدا و اور محبت تمام کی دولت سے وہی ایک نمائندہ ملک
 ”زور بازو“ کا نتیجہ نہیں، ذلک فضل اللہ، تو تید من یشاء۔

کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کا ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ اُس کا ہو جاتا ہے۔ بزرگوں کا قول ہے: یتیمنا صحیح ہوگا، لیکن آنکھوں کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ جو اللہ کے بندوں کا ہو گیا تھا اللہ کے بندے اُسکے ہو گئے تھے، محمد علی نے اپنے کو اللہ کی خاطر، اللہ کے دین کی خاطر خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دیا تھا، خلق نے بھی اپنے تئیں محمد علی کے لیے وقف کر دیا، وعدہ ربّانی کہ

ان الذين آمنوا وعملوا الصالحات | یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے ہیں

سَيَجْعَلُ اللَّهُ الرِّحْمَنَ وَدَّاءً (مہربوع) ﴿۱﴾

کی تفسیر لفظ و عبارت میں بہت دلچسپی تھیں گوشت و پوست میں محکم تفسیر محمد علی کی زندگی میں نظر آئی!

اس نل و دماغ کا، ایسا جامع الصفات سر دار کسی قوم کو خوش نصیبی ہی سے کہیں مدتوں میں ہاتھ آتا
ہے جنہیں نعمت ملی انھوں نے قدر نہ کی۔۔۔۔۔ وقت پر نعمت کی قدر دنیا نے کب کی ہو؟
دولت کیا ٹھہرنے والی اور نعمت کیا رکھنے والی تھی؛ ایک آبی دولت اور فانی نعمت تھی، آبی اور گری
تو نظیری زلفاک آمدہ بودی چو مسیح باز پس رفتی تو کس قدر تونہ شناخت یرفع

اور پھر مسلمان! انہوں نے اپنی تیرہ سو سال کی تاریخ میں قدر کس کی پہچانی ہو؟ شیر خدا علیؑ رضی اللہ عنہ کی خلیفہ رسول عثمانؓ غنی کی؟ جو انسان جنت کے سردار حسینؑ کی؟ جب اپنی شور و خبیثوں سے ایسے ایسے سرداروں کی قدر نہ پہچانی تو اسے کیا غم و ماتم کہ ان کے غلاموں کے غلام، محمد علیؑ کی ناقدری رہی؟ اور اسے خواہ مخواہ شور و خبیث ہی کیوں قرار دیجیئے؟ صنعتی کا مل کی مصلحتوں کی تھاہ، اور حکیم علیؑ الاطلاق کی حکمتوں کے بھید کو نہ پاسکا ہو؟ کم تھے جنہوں نے محمد علیؑ کو پہچاننے کی کوشش کی، کمتر تھے جو اس کوشش میں کامیاب ہوئے،

ادب و سیاست، خطابت و صحافت، قیادت و دانش پر داری، طرح طرح کے گہرے گہرے نقاب کچھ اس طرح تہ بہ تہ پڑے ہوئے تھے کہ چہرے کے اصلی خط و خال اور بشرہ کے حقیقی حسن و جمال کا مشاہدہ شواہ ہو گیا تھا، مبارک تھے وہ جنہوں نے قریب کر دیکھ لیا، مبارک تر تھے وہ جنہوں نے دور ہی سے فراست ایمانی کی روشنی میں بھانپ لیا، اور جتنی جی نہ سہی، مرنے کے بعد یوں فاش و بر ملا کہہ دیا،

بدین مصطفیٰ دیوانہ بودی	فدائے ملت جانانہ بودی
بہ بزم مائیس عشق بازاں	بہ بزم دشمنان سرزبانہ بودی
بدل بودی فقیہ ربے نوائی	بد قالب سپیکر شاہانہ بودی
سیاست را نقاب چہرہ کردی	وگر نہ عاشق مستانہ بودی
سیاست تہمتی بر حسن پاکت	زائین خسرو بے گانہ بودی
چہ دانستی کجا سوزم نہ سوزم	آتشم نہ بینا بہرہ انداز بودی
بایمانہ از تو زور سے دشواری	بہیمانہ بہت مردانہ بودی
رمیدی از رہ اغیار نایار	عجب مستے عجب دیوانہ بودی

محمد علیؑ کی بہت سی تصویریں کھینچی گئیں، لیکن صحیح ترین مرتع ہی ہو، محمد علیؑ پہلے جو کچھ بھی ہے ہوں علیگڑہ کے ایک مشہور کھلنڈے "اکسفرڈ" کے ایک بہترین طالب علم، انگریزی کے ایک انجی انشا پر دانا ایک بہترین ایڈیٹر، شیکسپیر کے ایک ماہر نقاد، ایتھلو، میسکیتہ وغیرہ کے ایک اعلیٰ مبصر، ایک بہترین مترجم، ایک بلند پایہ لٹراٹور ہوں، مولانا مہر حسن صاحب نے یہ یونیورسٹی حیدر آباد کی طرف پیشا صاحب صوفی مولانا محمد علیؑ کے انتقال پر کہے تھے۔

شاعر، ملک کے ایک نامور رہنما، ایک ممتاز ترین سیاسی سردار، لیکن آخر میں؟ آخر میں یہ ساری حیثیات سمٹ سنا کر صرف ایک ہی حیثیت میں جمع ہو گئی تھیں، اور جو کبھی اپنی عقل و فزائلی کے لیے مشہور تھا، وہ بچے خبط و دیوانگی کے لیے بدنام ہو کر رہ گیا! مرنے پر کانوں میں آوازیں آئیں کہ ملک ملت کا سیاسی رہنما ہیں لیکن دل سے صدا اٹھی تو بس یہی کہ آج ”محمد“ کا دیوانہ دنیا سے رخصت ہو گیا!

ہاں، وہ محمد کا شیدائی، دین منصف کا دیوانہ، اور امت محمدی کا بن داموں کا غلام تھا۔ ہندوستان ہی میں نہیں عالم اسلام میں کسی کلمہ گو کے پھانس چھتی، اور اُس کی چہن محمد علی کے ہونے لگتی، مصیبت کسی مسلمان پر بھی آئے اور درد سے بیتاب محمد علی، اسلام پر، قانون اسلام پر، شعائر اسلام پر، کہیں کوئی حملہ ہوا اور ٹرپ محمد علی کے دل و جگر میں پیدا! مقابلہ انگریزوں سے آپڑے، ہندوؤں سے پڑ جائے، حکومت ہو، خود اپنے مسلمانوں سے ہو، محمد علی کا سینہ ہر وار کے لیے سپر بنا ہوا! مسئلہ میں حج اور شرکت مؤتمر اسلامیہ کے لیے جب جانے لگے، اور سلطان ابن سعود کی حکومت ابھی نئی نئی ہوئی تھی، تو ہمدرد میں اپنے قلم خود دکھا ”اب نہ بنی امتیہ کا دور ہو سکتا ہے، نہ بنو عباس کا، نہ خاندان عثمان کا، اب حکومت اسلام ابن اسلام کی ہوگی۔“

دن رات اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، یہی دُھن تھی اور اسی کا کلمہ آخری سفر پر چب بھٹی سے روانہ ہونے لگے جو سفر آخرت کا پیش خمیہ تھا، تو اُس وقت بھی اسلام کے تحفظ ناموس پر کچھ ایسے ہی الفاظ زبان سے کہے جاتی تھیں کہ ایسے شخص کی جب موت آئے تو سارا عالم اسلام شرق سے غرب تک اُس کی عزا داری میں سیا پوش ہو جائے اور شمال سے جنوب تک ایک ماتم سرزن جائے، اور یہی ہو، پھر غریب الوطنی کی موت کے بعد جگہ بھی ملی تو کہاں؟ وہاں جہاں کے لیے آرزو اور تمنا بڑے بڑے صدیقوں شہیدوں نے کی ہے، خود بعض انبیاء کرام تک نے کی ہے! سلیمان و داؤد کا قبلہ موسیٰ و عیسیٰ کا قبلہ، خود نبی اقبلیتین کا پہلا قبلہ! اقبالؒ خاکِ قدس اور ابہ اغوشِ تمنا در گرفت سوسے گرد و سفتاں رہے کہ پیغمبر گزشتہ ”جسم“ کو جو عروج نصیب ہوا سب نے دیکھا، روح“ کو جو مقام حاصل ہوا ہوگا اُس کا اندازہ کون کرے؟ جسے آدمی کا ندھوں پر اٹھا کر لاسے اُسے سب نے دیکھا، جسے نور کے فرشتے ہاتھوں ہاتھ لے گئے اُسکے درجا و مرتبہ کو کو توڑ

ایک ایسا شخص جو ایک طرف وزیر ہند (مسٹر ٹانگ) اور وزیر عظم برطانیہ (مسٹر لائڈ جارج) کے سامنے لندن میں گھنٹوں مسئلہ خلافت پر آزادانہ تقریر کر سکتا ہو، جو عین ہجیان مخالفت کے وقت لندن اور پیرس کی بڑی بڑی مجلسوں میں ترکوں کی حمایت میں مدلل و مفصل ہشتاد و چوبیس گھنٹہ کا خطاب کر سکتا ہو، جو اسپرلے اور گورنروں کے سامنے ساروا ایکٹ اور دوسرے قوانین کے سلسلہ میں مخالفانہ بحث کر کے انھیں قائل و معقول کر سکتا ہو، کمزید میں سیاست حاضرہ اور مذہب دس دس میں میں کلام کے مضامین بہترین دب انشا کے ساتھ سپرد قلم کر سکتا ہو، انگریزوں کی کلب لائف میں شریک ہو تو ایسا گل بجائے کہ انھیں میں سے ایک معلوم ہونے لگے، دوسری طرف مسجد کے منبر پر غلط کلمے کھڑا ہو تو روتے روتے اپنی وارہی بھگولے، اور سننے والوں کی تو ہچکیاں بندہ بندہ جائیں، محفل سماع میں بیٹھے تو اس کا وجد و حال دیکھ کر دوسروں کو وجد آجائے، مسئلہ قتل مرتد پر جب استشہاد و استنباط شروع کرے تو اچھے اچھے فقہاء اس کا لوہا مان جائیں، آزاد خیال اتنا کہ ہر کلمہ گو کو اپنا حقیقی بھائی سمجھے، متشکک ایسا کہ مصطفیٰ کا امان اللہ خاں اور سلطان ابن سعود کو آخر تک محاف نہ کرے، نماز کا پابند اتنا کہ ایوان پارلیمنٹ کے برابر میں بھی جانا نہ بچا کر کھڑا ہو جائے اور اس عمارت میں شاید بالکل ہی پہلی بار رکوع و سجود کی ایک نظیر قائم کر جائے، دلیر اتنا کہ دشمنوں کے بٹے سے بٹے مجمع میں گھس جائے، سلطان ابن سعود کے منہ پر بھرے مجمع میں سب کچھ کہہ سن کر رکھ دے، ادیبوں کی محفل میں ادیب شاعروں کی مجلس میں غزل گو، اہل سیاست کی صف میں ممتاز، عوام و خواص دونوں کے اعتقاد و عقیدت سے سرفراز، ایسی ہمہ گیر، ایسی عامۃ الورد ہستی کی سوانح حیات مرتب کرنا کوئی آسان بات ہے؟

مذہب، سیاست، علم، ادب، تعلیم، صحافت، کانفرنسیں اور جلسے اس سچ پچیس سال کے اندر اسلامی ہند بلکہ ایک حد تک مملکت ہند اور عالم اسلامی میں جو بھی تحریک کسی بھی اداسے میں ہوئی محمد علی کی شخصیت اس کے اندر کار فرما، اور محمد علی کا اثر براہ راست نہ سہی بلکہ واسطہ سہی انھیں موجود ایسے شخص کی سیرۂ نگاری ایک شخص کی سیرۂ لکھنا نہیں، وقت کی پوری تاریخ مرتب کر دینا ہی کس پہلو کو لیا جائے، کس کو چھوڑا جائے، کون کون سے رخ نمایاں کیے جائیں اور کون سے مدہم ہی رہنے دیے جائیں، کیا کیا پھیلا یا جائے، اب

کیا کیا سمیٹ لیا جائے، ہر ہر موضوع ایک مفصل اور مربوط گفتگو کا طالب، ہر ہر عنوان ایک ضخیم دفتر کا متقاضی۔

ضرورت تھی کہ اچھے حیدر اہل قلم اور پختہ کار مصنفین کی ایک بڑی جماعت ترتیب سے انجکام کا کام ہاتھ میں لیتی، اور وہ بھی فی الفور نہیں ایک صد تک تلاشیں شخص جاری رکھنے کے بغیر اپنی فکر و کاوش کے نتائج ایک نہیں کئی ضخیم جلدات میں مرتب کر کے شائع کرتی، لیکن حالات سعد بنونے تھے نہ ہوتے، تفصیلات کو چھوڑتے، ان سبب کی شرح اگر کی جائے تو خود ایک مستقل سالہ ”شرح سبب“ تیار ہو جائے، جہود اور فخر کی کے اس منظر کو دیکھ کر جامعہ ملیہ کا ایک نو عمر و فخریہ ہونا ر اہل قلم کے بڑا، اور اپنی عمر و تجربہ کی کمی کو ہمت کی فراوانی سے پورا کر کے بلا تکلفا اور بے دھڑک اس با عظیم کے لیے اپنے سر و شانہ کو پیش کر دیا جس کے سبب خانہ کے لیے کئی کئی قوی الجشتہ اور نو مند پہلوان کشتیاں نکالے ہوئے، اور اکھاڑے جیتے ہوئے دکا تھوڑے آفرین و رحمت اسکی ہمت پڑا آفرین رحمت جامعہ کی مستعدی و کارگزاری پر، جامعہ ہاں ہی محمد علی کی لاگتا جامعہ ملیہ ————— وہ پودا جسے محمد علی نے اپنے ہاتھ سے زمین میں لگایا، بڑھایا، سینچا، پالا

منازل سفر کی دوریوں، اور راہ کی دشواریوں، زاد سفر کی بے سرو سامانیوں، دریا ران طریق کی کج ادا کی حکایت کیا، اور کس سے کیجیے؟ اور کیجیے بھی تو سننے والوں سے امید کیا رکھیے، خود جو ہر سی کے الفاظ میں، خضر کیا جانے بھلا راہ نمائی کے منے!

ہر کیفیت بہر حال چند ماہ کی مختصر مدت میں شوق و عقیدت کے جذبات اپنے نقوش جو کچھ کاغذ کے دامن پر پھیلا سکتے تھے، وہ حاضر خدمت ہیں، یہ تخت دل ہیں، اپنی زماں تجارت کا دھوکا نہ ہو۔
ان کے بڑھنے سے قبل معروضات ذیل کو ذہن نشین فرما لیا جائے۔

صاحب سیرۃ کی زندگی ہسپاہی کی زندگی تھی، ساری عمر دشمنوں سے اور کبھی کبھی دوستوں سے بھی لڑتے اور مقابلہ کرتے ہی گزری، ممکن نہیں کہ محمد علی کی سیرۃ دیانت کے ساتھ لکھی جائے، اور محض نرم و انہ کی درستان پر ختم ہو جائے۔ ”خالہ جانباڑ کے“ و قلع اور کارنامے کوئی ”حافظ شیراز کی زبان میں“ آخر کو نگر بن

کرے؟ بعض نازک دلوں کے جذبات کو جابجا صدمہ یقیناً پہنچے گا اس کے لیے شروع ہی سے تیار رہنا چاہئے۔
مؤلف نے سبجیل سنبھل کر اور بہتوں کے جذبات کی رعایت کر کے قلم اٹھایا ہے، پھر بھی واقعات میں تحریر
کے مجرم تو نہیں ہو سکتے تھے، علی مرضی کے سیرۂ نگار کے لیے، جنگ، صغین، اوحسین بن علی کے سوانح نویس
کے لیے میدان کر بلا کا ذکر زبان قلم پر نہ لانا کیونکر ممکن ہو؟

(۲) بعض بعض مقامات پر کم فرصتی کے باعث واقعات کی پوری تحقیق نہ ہو سکی، یا انداز بیان، اور
واقعات میں کچھ خلط ملط سا ہو گیا ہے مثلاً صفحہ ۳۸۹ پر ایک جلسہ لکھنؤ کا جو ذکر ہے وہ بعض جزئیات کے
محاط سے محتاج تصحیح ہے، علیٰ ہذا صفحہ ۳۹۴ کے بعض جزئیات، صفحہ ۲۰۸ پر علی گڑھ کی کورٹ کی ممبری کا ذکر
ہو، حالانکہ اس وقت تک علی گڑھ محض کالج تھا، اور کورٹ کی اصطلاح اس وقت تک وجود میں نہیں آئی
تھی، کالج کے اہل حل و عقد ”ٹرسٹی“ کہلاتے تھے۔ صفحہ ۲۱۳ پر لکھنؤ کی میٹنگ کے سلسلہ میں ڈاکٹر انصاری
کا نام آیا ہے، حالانکہ ڈاکٹر صاحب اس وقت ہندوستان میں موجود نہ تھے، اور نہ اس وقت تک ان تحریرات
میں ان کی کوئی نمایاں حیثیت تھی، ان کی حیثیت تین سال بعد شائع میں قائم ہوئی، صفحہ ۳۱۸ پر دلنشان
شرل کو ماہر سیاست و فلسفہ لکھا ہے، بجائے فلسفہ کے صحافت صحیح تھا، صفحہ ۲۷۵ پر ایک غیر مستند بیان
پر اعتماد کر کے یہ عبارت ”ج کر دی ہو کہ مالوی جی نے علی برادران کو کانگریس کا ڈیلیگیٹ بنایا، اسکے کوئی
معنی ہی نہیں، صفحہ ۳۷۲ پر تقریر کے الفاظ محمد علی کی جانب منسوب کیے گئے ہیں، یا الفاظ اصلاً مولانا شوکت
کے تھے محمد علی نے انھیں صرف دہرایا تھا۔

بس یہ اور اسی قبیل کی چند جزئی فروگزاشتوں کو چھوڑ کر کتاب بحیثیت مجموعی قابلِ داد ہو اور ہونا
مصنف کی سعی و کوشش مستحقِ ستائش۔ بلکہ جب یہ یاد ہوتا ہو کہ انکی یہ بالکل پہلی تصنیف کوشش ہے تو حیرت
کے ساتھ ان پر رشک کرنے کو جی چاہئے لگتا ہے، متعدد عبارتیں ایسی ادبیات ہیں کہ اچھے اچھے کہنے مشق اور پختہ کار
ادیبوں کے لیے باعثِ فخر ہو سکتی ہیں۔

پیشِ اول ہو، آئندہ ایدیشین نقش ثانی ہوگا، جو اہم واقعات اس میں درج ہوئے رہ گئے ہیں یا محض سرسری
اور نامہ درج ہوئے ہیں خدا کرے اس وقت پوری طرح مفصل و شرح درج ہوں، اور اللہ وہ وقت جلد لائے

بسم اللہ اشارات!

محمد علی جیسے زعیم ملت کی سوانح عمری کسی بڑے آدمی ہی کو لکھنی چاہیے تھی، نہ کہ اس کے لیے انتخاب ہوا ایک گمنام، کم علم، بیچ میرز شخص کا: میرانیس کی زبان میں، موضعیت و مرجع سلیمان ذی چشم! بہر حال جیسا کچھ بن آیا حاضر ہی! مفصل اور مطول ایڈیشن تو بعد کو بکلیگا، چند باتیں بغیر کسی تنہید کے ضروری طور سے قابل گزارش ہیں۔

(۱) کوشش اس کی کی گئی ہو کہ عبارت آرائی کو ذرا بھی دخل نہ دیا جائے، جہاں تک ہوسکے واقعات اور مواد پیش کیا جائے، کہ سوانح نگاری کا اصل اصول یہی ہے!

(۲) کسی عبارت یا جملہ پر اگر زور دینا مقصود ہوا تو اُس پر خطوط کھینچ دیے گئے ہیں، کتاب کے دو حصے کر دیے گئے ہیں، پہلے حصہ میں صاحب سیرت کے اخلاق و عادات، اور عام حالات زندگی سے بحث کی گئی ہے، اور دوسرے حصے میں ان کے کارنامہ ہلے حیات پر گفتگو ہے، اور اس کا بخاطر رکھا گیا ہے کہ کارنامے ترقیب اور تاریخ سے بیان ہوں۔

اس سلسلہ میں ایک بات قابل بخاطر یہ ہے کہ عنوان کا آغاز ترقیب تاریخی کے ماتحت کیا گیا ہے، اور پھر اس عنوان کے جتنے ادوار قائم ہو سکتے تھے وہ اسی عنوان کے ماتحت ذکر کر دیے گئے ہیں، تاکہ واقعات کا تسلسل قائم رہے۔

مثلاً . ہمدرد پر جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ شروع تو اُس وقت سے کیا گیا ہے جب وہ دہلی سے پہلی ہجرت ہوا، پھر اس سلسلہ میں ہمدرد کے تمام ادوار حیات پر (مضمون کا تسلسل قائم رکھنے کی غرض سے) بحث کی گئی ہے۔ مثلاً، اشاعت، خصوصیات، وغیرہ۔
شاید ایک عنوان ایسا بھی ملے گا جس میں تاریخی ترتیب میں ذرا فصل ہو گیا ہے، وہ بھی تسلسل ہی قائم رکھنے کی وجہ سے ہوا۔

کسی کسی عنوان میں شاید یہ خیال ہو کہ بعض باتیں غیر ضروری یا غیر متعلق ہیں، لیکن آگے چل کر معلوم ہو گا کہ ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ اس کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے کہ محمد علی کے کارنامہ ہا حیات کے ساتھ ہی ساتھ اگر ممکن ہو سکے تو ان کی خصوصیت مہترہ قیادت کو اجاگر کرنے کے لئے اس فضا اور ماحول کا تذکرہ بھی کر دیا جائے، جس میں محمد علی نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا، تاکہ ان کے کارناموں کی صحیح قدر و قیمت ذہن نشین ہو سکے۔

نوعی مسائل { محمد علی کا زندگی کا اکثر حصہ جنگ و جدل میں صرف ہوا، اپنے خیال میں انھوں نے کی ناگزیری } جسے برسرِ غلط سمجھا اُس کے مقابلہ میں انھوں نے اپنی پوری طاقت صرف کر دی، ایسے مسائل پر نہایت تکلیف کے ساتھ قلم اٹھایا گیا ہے، اور انے جلد از جلد گزرنے کی کوشش کی گئی ہے، صرف نفس واقعہ کو ملائم سے ملائم الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ان مختلف فیہ مسائل سے اعراض کیا جاسکتا تھا، یا ایسا انداز بیان اختیار کیا جاتا کہ محمد علی کے متعلق سب کچھ ہوتا، مگر ان مسائل پر کچھ نہ ہوتا، لیکن شاید سوانح نگاری کا یہ کوئی عمدہ اصول نہ ہوتا کہ بعض باتوں کو جو محمد علی کی زندگی میں خاص اہمیت رکھتی ہیں بالکل نظر انداز کر دیا جاتا، اسی لئے، بادل ناخوہستہ ایسے عنوانات پر نہایت حزم و احتیاط، اور ایہام و ابہام کے ساتھ عرض مطلب کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کی ترتیب تالیف کے وقت وہ تمام مواد پیش نظر رہا ہے، جو محمد علی پر مطبوعہ صورت میں موجود ہے، پھر مولانا عبدالمجید صاحب دریابادی کی عنایت سے بعض اخبارات کے محمد علی نمبر، اور

خاص خاص تراشے بھی حاصل ہو گئے، جنہے بہت قیمتی مدد ملی، اور جو خاص مواقع پر کام آئے۔
اس کتاب کی اشاعت کا ایک اہم مقصد یہ سمجھنا چاہیے کہ محمد علی کے عقیدہ مند، بد دل نہ ہو جائیں
یعنی یہ نہ سمجھ لیں کہ کام نہیں ہو رہا ہے۔

ان اوراق سے یہ تو بہر حال ثابت ہو گیا کہ کام ہو رہا ہے، لیکن نوعیت کا کو بہتر سے بہتر سے وقت
بنایا جاسکتا ہے جب محمد علی کے احباب اعزہ اپنے معلومات سے ہمیں مستفید فرمائیں، مولانا شوکت علی
سلسلہ شروع فرما چکے ہیں، اور مولانا عبد الماجد صاحب ظلمہ غفرلہ سلسلہ مضامین شروع
فرمانے والے ہیں، آئندہ ایڈیشن میں ان چیزوں سے بھی بہت کافی مواد حاصل ہو سیکے گا۔

اسکے علاوہ اگر محمد علی کے خلوت اور جلوت کے رفیق بے تکلف دوست عزیز اور شناسا اپنے اپنے
معلومات شائع فرمادیں تو بہت کچھ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے،

ہمارے مخاطب بالخصوص، جناب ڈاکٹر انصاری صاحب، جناب شعیب قریشی، جناب بی اے
ذوالفقار علی خاں صاحب، برادر اکبر مولانا مے مرحوم، جناب معظم علی صاحب چیف جج ریمپور سٹیٹ
برادر سببی حضرت مرحوم، جناب احسان الحق صاحب شش جج (پنجاب)، جناب ظفر عمر صاحب
جناب صفر باب جنگ صاحب جج ہائیکورٹ حیدر آباد، میاں سرفضل حسین صاحب، مولانا محمد عرفان
صاحب، جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب، سر وزیر حسن چیف جسٹس لکھنؤ چیف کورٹ، عبدالحجید خواجہ
صاحب پیر سترالہ آباد، مشر تصدق احمد خاں شروانی، مولانا سید سلیمان صاحب بی وی، چودھری
خلیق الزماں صاحب، جناب حسن محمد حیات صاحب سکریٹری لچیلینو کونسل بھوپال، مشر سعید محمد خاں
کشم افیسر بھوپال، جناب شاہ عترت حسن صاحب ایڈوکیٹ (بنارس)، سر جوزف بہو، جناب قاضی
عبد الغفار صاحب اور دوسرے احباب علی گڑھ اور سیاسی رفقاء، کار میں، اگر یہ حضرات ذرا بھی توجہ
فرمادیں تو سیرۃ کا آئندہ ایڈیشن نہایت کامیاب ہو سکتا ہے۔

اردو کے مشہور ادیب میر محفوظ علی صاحب، در سید سجاد حیدر صاحب یلدرم کا شکریہ یہ جب
ہو کہ ان بزرگوں کے مقالات سے سیرۃ کے اس نسخہ کی ترقیب تالیف میں کافی مدد ملی۔

خوش قسمتی سے ہمیں، محمد علی کی ڈائریاں، اور شوکت صاحب کی ڈائریاں (مبتوا جیل) اور انکے پراپوٹ کا غذات و خطوط، اور ہمدرد کے مقالات و مضامین بھی مل گئے۔ ان کے مطالعہ سے ہم نے کافی فائدہ اٹھایا اور ایسی چیزیں پیش کر سکے، جو اب تک منظر عام پر نہیں آ سکی تھیں۔

لیکن اس سلسلہ کو ابھی ختم نہ سمجھ لینا چاہیئے، ابھی اور بہت کافی مواد حاصل ہو سکتا ہے، اگر بڑے کوئی شخص جائے اور دوچار نہیں وہاں قیام کرے تو بہت معلومات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں سات سال تک محمد علی نے نہایت نیک نامی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کی، ایک ثقہ اور مستبر دوست کا بیان ہے کہ بڑے وہاں ابھی ایسے متعدد اشخاص ہیں جو محمد علی کے کارناموں سے واقف ہیں اور انھیں مزے لے لیکر بیان کرتے ہیں، اس لئے اگر وہاں تک کوئی پہنچ سکے تو نادر معلومات کا نہایت گراں بہا ذخیرہ حاصل ہو سکتا ہے۔

اسی طرح اگر گاندھی جی، ڈاکٹر انصاری، بیگم صاحبہ محمد علی وغیرہ کے پیچھے کوئی لگ جائے تو ان بزرگوں سے بھی نہایت گراں قدر مادہ مل سکتی ہے کثرت مشاغل کے باعث ان بزرگوں سے اس کی توقع عبث ہے کہ اپنے معلومات و تاثرات یہ خود قلمبند بھی فرما سکیں گے، یہی غنیمت ہے کہ انہیں کسی واقعہ کی روایت سن لی جائے، اور پھر خود ہی اسے لکھ لیا جائے۔

مولانا شوکت علی کے پاس ممبئی میں بہت سے کاغذات و خطوط ہیں، جن کے لیے مولانا یہ شرط پیش فرماتے ہیں کہ کوئی بھی آئے۔ اور وہاں کچھ روز رہے، پھر ان میں سے ضروری کاغذات چھانٹ لے اور ان سے فائدہ اٹھائے۔

ظاہر ہے یہ صورت بھی بہت فائدہ مند ہے، اگر اس پر عمل ہو سکے، تو پھر بہت نادر اور نایاب مسئلہ فراہم ہو سکتا ہے۔

اس متوقع مواد کے علاوہ ہمدرد کی پوری جلدوں کی ورق گردانی، ہزاروں خطوط و کاغذات کی ایک ایک سطر پڑھنے، اور مطبوعہ مواد سامنے رکھنے کے بعد جو کچھ ہو سکا، وہ پیش خدمت عالی ہے خامیوں اور غلطیوں سے نہ انکار ہے نہ انکار پر اصرار۔ اگر ان خامیوں سے مطلع کر دیا گیا، تو آئندہ ایڈیشن میں

ان کی تصحیح کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اُمید ہے کہ یہ چند اشارات اصل کتاب کے مطالبہ میں مدد و معاون ثابت ہوں گے۔
نیز جن بزرگوں کے اسماء گرامی لکھ کر اُمید ظاہر کی گئی ہے کہ وہ توجہ فرمائیں گے یقین ہے کہ یہ آواز صدابہ صحرانہیں ثابت ہوگی۔ مولانا عبد الماجد صاحب مظلّمہ دہریچ کا شکریہ واجب ہے کہ موصوفت اپنا بہت ساقمیتی وقت مسودہ کی نظر ثانی پر صرف فرمایا، اور مسودہ کی ایک ایک سطر کو ملاحظہ فرمایا، بعض غیر ضروری چیزوں کو حذف فرمایا اور بعض ضروری چیزوں کو جوڑ لیا، انہیں درج کرنے کی ہدایت فرمائی، لب و لہجہ میں اگر کسی جگہ سختی آگئی تھی وہ بھی مولانا کے نشان زدہ اور عطا کردہ ہدایات اور یادداشت کی بنا پر غور کر دی گئی۔! ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب شیخ الحداد نے بھی مسودہ کو شروع سے آخر تک ملاحظہ فرمایا۔

رئیس احمد جعفری

محمد علی میوزیم

جامعہ ملیہ اسلامیہ

دہلی

۲۶۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء

بِسْمِ الرَّسَنِ الرَّسِيمِ

حصہ اول

تمہید

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان از آدم تا اندیم، ہر صیص حکومت ہے، اپنی خداوندی چاہتا ہے اور اگر موقع مل جائے تو اپنی خدائی کا اعلان کرنے سے بھی باک نہیں کرتا، وہ ”زبون شہر یاری“ ہے، اسلئے وہ کبھی خواہش اقتدار ہے اور بس، پھر اپنا اقتدار، اپنی حکومت، اپنی شہر یاری وہ چاہتا کس پر ہے؟ اپنی ہی جنس پر اپنے ہی جیسے لوگوں پر، اسی لئے اقبالؔ کو تعجب ہے کہ انسان نوع انسان کا شکاری ہے!

حیات انسانی کی تاریخ کا مطالعہ کرو، جو ورق الٹو گے وہ اسی ”دستان قیصریت“ کو رنگین ہوگا، تخت حکومت ملا اور انسان نے خداوندی کو خدائی کے خواب دیکھتے شروع کئے! یہی جذبہ فاسد کبھی فرعون کی صورت میں رونما ہوا، کبھی نداد کی، کبھی نیرو کے روپ میں جلوہ گر ہوا کبھی نمرود کے، کبھی زار کے، دہشت انگیز نام سے دنیا میں آیا، کبھی قیصر جرمنی کے، کبھی سکندر کی ہیئت میں اس نے جنم لیا، کبھی جولیس سیزر کی، کبھی سیل تمارین گراڈا کے، کبھی نادر شاہ کاشکریں کر، کبھی ہلاکو خاں کے زلزلہ فکن نام سے متعارف ہوا، کبھی

حجاج بن یوسف کے۔

لیکن اس سیلاب اقتدار کا مقابلہ کس نے کیا؟ ہندی ملواریں کند ہو گئیں، یونانیوں کے بل مٹیہ گئے، روم کا پتہ پانی ہو گیا، ایران کے سوراؤں نے فرار پر قرار کیا، قوم مطیع و شتا ہو گئی، ملک میں غلامی کی فضا قائم ہو گئی۔

اس اقتدار کے بت نے ان جواں بہت، قوی بازو، شیر دل انسانوں کو اتنا نہ جھکا کہ چہیں سائی کے لئے مجبور کیا، جنہیں صرف اپنے خالق کی بارگاہ بے نیاز میں نیاز و عقیدت کی گردن جھکانی تھی۔

بت خانہ شہر یاری کی اس مزین و آرائش کے باوجود ہمیشہ ایسے مردان حق آگاہ و حق شناس پیدا ہوتے رہے جنہوں نے ظلم و عدوان، طغیان و تمرد اور نفس خود پرست کے قصر فلک بوس کو ہمیشہ ڈھایا، کبھی جلال الدین نے، کبھی مسطیٰ کامل نے، کبھی عبدالکریم مجاہد ریف نے، کبھی سعد پاشا زانغلر نے اور کبھی محمود الحسن نے، کبھی محمد علی نے، رضی اللہ عنہم۔

ان مجاہدین استقلال و حریت کے پاس نہ اثر و دم تو ہیں تھیں، نہ عقاب پرواز "ایر و طین" نہ مورد مخ سالشکر، نہ اعوان و انصار کی فوج، یہ داعیان حق و صداقت جب میدان عمل میں گام فرما ہوتے، تو یمن و یسار تبعین و مریدین کی کوئی جماعت جبر نہیں تھی لیکن جب ان کے نعرہ حق، شیر کی گرج بن کر فضا سے عدوان و تمرد میں زلزلہ انداز ہو تو لوگوں نے دیکھا کہ قصر ملوکیت کی دیواریں لرزنے لگیں، بتخانہ شہر یاری کے بت سزگوں ہو گئے۔ "کنگنم پلس" میں زلزلہ آگیا۔

ابھی تم نے انہیں بے یار و مددگار دیکھا تھا، اب نظر اٹھاؤ تو جہاں تاروں اور خدا کا روں

کی فوج نظر آئے گی، تم نے انہیں تہید ست و بے نوا پایا تھا لیکن غور کرو تو معلوم ہوگا کہ سیم و زر کے انبار ان کے قدم چوم رہے ہیں، عرصہ حریت میں تمہیں یہ سننا تھا نظر آئے تھے لیکن دیکھنا! ان کے گرد تو ٹٹھکا ٹٹھکا ہوا ہے! جس کے سینے نوک سنگین کھانے کے لئے کھلے ہوئے ہیں جس کے دلوں میں تنائے شہادت ہو اور جس کے سروں میں سودائے جہاد!

ان قازیان راہ آزادی کے تیر دیکھو! لوگ سجن و زندان کے نام سے لرزتے ہیں لیکن یہ ہیں کہ پروانہ دار اپنے تئیں قید و بند کے مصائب کے لئے پیش کر رہے ہیں، ”داروکن کا افسانہ کہن“ لوگوں کے حافظ سے محو ہو چکا ہے، لیکن ان شہیدان حق و صداقت کے چمکتے ہوئے، مسکراتے ہوئے، منور چہروں کو دیکھ لو، کس خوشی سے تختہ دار پر جلوہ فرما رہے؟ ”لال پگڑی“ بڑے بڑے امیروں اور رئیسوں کے لئے کتنی لرزہ انداز ہوتی ہے لیکن ذرا ان قیدیوں کے بے خوف چہروں کو دیکھو، جن کے ہاتھوں میں ہتکڑی بے پاؤں میں بیڑی ہے، عدالت کے کٹھرہ میں فوج اور پولیس کے جلو میں کھڑے ہیں، کس بے خونی سے ”مصائب“ سے ہم کلام ہیں، کس بے باکی سے ان کا نعرہ صداقت عدالت کے کمرہ میں گونج رہا ہے، اور کس بے پروائی سے اپنا حکم سنا سن رہے ہیں۔

دیکھتے دیکھتے یہ انقلاب کیسے پیدا ہو گیا؟ جو بزدل تھے وہ شیر دل کیسے بن گئے؟ جن کو پر تکلف مسہریوں پر اور ”بالش کخواب“ پر گرائی سر کی شکایت ہوتی تھی وہ آج جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں میلے کیلے کپڑوں میں، مائے کے بد قلمی برتنوں میں، سڑے گلے کھانے میں کتنے مگن ہیں؟ کتنے خوش ہیں؟

حق و صداقت کی چوٹ دیکھی؟ نعرہ حریت کا اثر دیکھا؟ جب کبھی بھی کسی ”یاجوج“ وقت نے اپنی خواجگی اور نصیریت کا پٹہ دوسروں کے گلوں میں ڈالنا چاہا تو ایک جماعت پیدا

ہونی جس نے اس بڑے ہوئے سیلابِ اقتدار کا مقابلہ کیا اور اپنی بے لنگی اور تہی دامنی کے باوجود بالآخر کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوئی!

اسی قسم کے داعیانِ استقلال و آزادی کے ایک بہت بڑے لٹل حریت محمد علی کا ذکر ان صفحات کا موضوع ہے۔

۱۸۵۷ء کے عالمِ آشوبِ غدر کے بعد ہندوستان کی حالت مددِ غدر کے بعد عام حالت سقیم ہو گئی تھی، غدر کے شریک کار ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں قوموں کے افراد تھے، اور ہر شریکِ غدر نے بقدر استعداد و ظرف اس ”کارِ ثواب“ میں اہم ترین حصہ لیا تھا، اس لئے کہ سور کی چربی میں ہاتھ لگا مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا، اور گائے کی چربی میں ہندو ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے، لیکن غدر کے فز ہونے کے بعد ہندوستان کی حالت بلکہ ذہنیت میں عظیم اُشانِ تغیر ہو گیا، برادرانِ وطن نے تلافیِ مافات کے طور پر گورنمنٹ سے پوسے طور سے تعاون کیا، انگریزی تعلیم انھوں نے حاصل کی، سرکاری اسائیو پر انھوں نے قبضہ کیا، گورنمنٹ کے ظلِ عاطفت کو انھوں نے سایہ ہا سمجھا، لیکن چونکہ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت ہی نکل گئی تھی دگودہ لاکھ کم مایہ سہی لیکن نام تو تھا کہ ”خسرِ ہندوستان“ یہی قوم ہے، اس لئے قدرۃً ان کے دل انگریزوں کی طرف سے صاف نہیں تھے، پھر اس وقت کے علما کی ایک بہت بڑی جماعت انگریزوں کی تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن، معاشرہ و خیالات، غرض ہر چیز کو پوسے طور سے ”بخسِ اعین“ سمجھتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان انگریزوں کی ہر چیز سے بھڑکنے لگے۔

ان حالات میں سید احمد خاں علمِ اصلاح و تغیر کے اٹھے، انھوں نے بتلایا سرسید کہ حکومت تو بہر حال تمہارے ہاتھ سے جا چکی، تمہیں اپنی زندگی اب اس

حکومت کے سایہ میں بسر کرنی ہے، ہندوؤں سے بازی لیا چکے تعلیم انھوں نے تم سے زیادہ حاصل کر لی، انگریزوں کی نظریں اپنی ”بے قصوری“ انھوں نے ثابت کر دی، سرکاری کامیوں پر ان کا قبضہ ہو گیا، اس کے عکس گورنمنٹ کی نظروں میں ”بغاوت“ کے مجرم صرف تم ثابت ہوئے، تعلیم انگریزی تم نے نہیں حاصل کی، انگریزوں کی نوکری تم نے حرام سمجھی، تو اب اگر حقیقت زندہ رہنا چاہتے ہو، تو کمر ہمت چست کرو، اور بسم اللہ کر کے اٹھ کھڑے ہو، جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا، جو تلافی کر سکتے ہو کرو، اگر باعزت زندگی بسر کرنا چاہتے ہو، تو انگریزی تعلیم حاصل کرو، گورنمنٹ کو اپنا ہمدرد اور مربی سمجھو اور پوسے امن و سکون کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرو۔

لیکن اس نسخہ کے ساتھ ہی اس حکیم دقت نے ایک سخت ترین ”پرہیز“
سر سید کی پالیسی بھی بتایا، اور وہ تھا، سیاسیات سے الگ رہنا، اس کی شرط یہ تھی کہ

جب تک تم اپنی تعلیمی خامیاں نہ پوری کر لو، اس وقت تک سیاسیات کو شجر ممنوعہ سمجھتے رہو، اگرچہ مسلمانوں میں ان کی عام مخالفت ہوئی، تکفیر کے فتوے شائع ہوئے، ہر طرح سے ان کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں لیکن اس مرد حق آگاہ نے ان تمام موانع کا نہایت خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور بلا خوف تردد کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی عام مخالفت کے باوجود اس کی رہنمائی قبول کی اور اس کے بتائے ہوئے اصول پر عمل کیا۔

سر سید کے انتقال کے بعد ان کے جانشین نواب محسن الملک مرحوم نے
سر سید کے بعد بھی سر سید کے نقش قدم پر قوم کو چلایا لیکن اب رفتہ رفتہ حالات بدلتے

گئے، اُدھر مسلمانوں میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بھی خاصی ہو گئی ادھر گورنمنٹ کے طرز عمل میں فرق آنے لگا، اب گورنمنٹ کی پالیسی عمل الا اعلان ”لٹاؤ اوڈو“
گورنمنٹ کی پالیسی حکومت کرو، کے اصول پر جاری تھی۔ پہلے اردو ہندی کا تھیں

پیدا کیا گیا، اور اس طرح سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات کی خلیج پیدا کر نیکی کو کشش کی گئی، پھر شملہ میں ایک وفد طلب کیا گیا جس میں ازراہ ”مراحم خسروانہ“ اس انعام سرمدی کا اعلان ہوا کہ جداگانہ انتخاب جب تک تم چاہو گے برقرار رکھا جائے گا، پھر انھیں نامحود حرکتوں پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ عالم اسلامی پر بھی برطانیہ کے دندان حرص و آرتیزر ہونے لگے، یہیم وعدہ خلافیاں کی گئیں اور مسلسل دروغ بیانیوں سے مسلمانوں میں ایک ہیجان عظیم پیدا ہو گیا، اور سب بڑھ کر یہ کہ ملکہ وکٹوریہ کے اس تاریخی اعلان کو ٹھکرایا گیا جس میں مسلمانوں کی مذہبی معاملات میں ”مکمل آزادی“ تسلیم کی گئی تھی، کانپور کی مسجد کا سانحہ خون چکاں ایسا نہیں ہے جو کبھی فساد ہو سکے، ادھر خلافت عظمیٰ عثمانیہ پر طرح طرح کی ریشہ دوانیاں کی گئیں، ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے جذبات میں ہیجان و تموج پیدا ہوا، اور وہ اپنے گوشہ عافیت سے باہر نکلے، اس عزم صمیم کے ساتھ کہ یا تو وہ ان درازدستیوں کا استیصال کریں گے یا خود فنا ہو جائیں گے، لیکن اس وقت زیادہ ضرورت ایک ایسے راہنما کی تھی، جو دول فرنگ کی ہوس استعمار سے واقف ہو جو ان کے عادات و اطوار، طینت و ذہنیت کا رفرنس ساس ہو، اور جو ان کی سیاسی فریب کاریوں کا ماہر خصوصی ہو اور ساتھ ہی ساتھ جس کا دل مضبوط ہو جس کا دماغ اپنا ہو، اور جس میں ہوس قیادت نہ ہو بلکہ جذبہ خدمت ہو۔

مسلمانوں میں حرکت

ایک لیڈر کی ضرورت

یہ ہمیشہ سے سنت اللہ چلی آتی ہے کہ ایسے نازک مواقع پر کوئی نہ کوئی محمد علی کاظمی

مرد مجاہد پیدا ہو جاتا ہے جو باطل کے تمام عزائم شومہ اور تہذیبیرسیہ کا قلع قمع کر کے رکھ دیتا ہے، چنانچہ اس وقت بھی جو ملت اسلامیہ کے لئے حد درجہ نازک بلکہ ہلاکت آفریں عہد تھا، ایک مرد مجاہد، اپنی تمام گہرائیوں اور خصوصیتوں، اپنی قابل شک،

قابلیتوں اور اپنی لائق فخر صلاحیتوں کے ساتھ نمودار ہوا، جسے دنیا نے محمد علی کے نام سے یاد کیا! میدانِ عمل میں اس نے قدم رکھتے ہی یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک محمد علی میدانِ عمل میں

بے نظیر مقرر ایک بہترین مدیر، اور ایک سحر نگار انشا پر داز ہی نہیں ہے بلکہ خدمتِ اسلام کا ایسا بے پناہ جذبہ اس کے سینہ میں کار فرما ہے جو مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر سکتا ہے، اور باطل کو غائب و خاسر کر سکتا ہے۔

پھر دنیا نے چند ہی دنوں میں دیکھ لیا کہ جو امیدیں اس سے قائم کی گئی تھیں وہ غلط نہیں ثابت ہوئیں، اس نے امتِ اسلامیہ میں ایک حیاتِ تازہ پیدا کر دی، اس نے خدمت گزارانِ قوم کی ایک جماعت کو میدانِ عمل میں لا کھڑا کیا، اور اس نے ملتِ اسلامیہ، بلکہ زیادہ واضح الفاظ میں عالمِ اسلام کے ایسے گرانہا خدمات انجام دے جو رہتی دنیا تک اس کا نام باقی رکھیں گے، لوگ اعزام و احترام سے اس کے کارنامے منیں گے، اور اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں گے جن لوگوں نے اس مبارک ہستی کو نہیں دیکھا ہے وہ حسرت کریں گے کہ کاش ان کی آنکھوں نے محمد علی کی نہیں، مجاہدِ اعظم کی زیارت کی ہوتی، جو آنکھیں شرفِ زیارت سے ممتاز ہو چکی ہیں ان کی آرزو ہوگی کہ کاش انھیں فخرِ حکمِ صلح ہوتا، اور جو خوبیِ بخت سے اس سے بھی مستفیض ہو چکے ہیں، ان کو تمنا ہوگی کہ کاش نعمتِ عظمیٰ ہم سے ابھی اور نہ جھپٹی جاتی لیکن مشیتِ ایزدی پوری ہو کر رہی، وہ گراں مایہ ہستی ہم سے جدا ہو کر رہی، اب اس کے رہنما اور زریں کارنامے ہیں، جو ہماری تسکین و رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔

باب اول

ابتدائی حالات

سلام!

گل حدیقہ بوبکر و شمع بزم علی	چراغ انجمن مصطفیٰ سلام علیک
امام خلق، سید ازل، عزیز وطن	قیل عشق شہید و فاسلام علیک
امیر حلقہ، خدام کعبہ یزداں	رئیس عسکر دین خدا سلام علیک
دیار ہند ز تو یافت عظمت ابدی	زعیم مملکت ایشیا سلام علیک
براہن عشق تو روح بلال می نازد	حبیب قلب سول خدا سلام علیک

خانہ دان کا مختصر تذکرہ | محمد علی کا خاندان ہمیشہ سے اپنے اقربان و ائیل میں ممتاز چلا آ رہا ہے محمد علی کے دادا علی بخش صاحب نے ہنگامہ ندر میں غیر معمولی شرافت و نجابت سے کام لے کر متعدد انگریزوں کی جان بچائی اور بالآخر اس سلسلہ میں مراد آباد کے علاقہ میں ایک ممتاز جاگیر بطور بخشش ملی، محمد علی کے والد عبدالعلی خاں صاحب کو نواب یوسف علی خاں نظام فرماں روا نے رامپور نے باصرار رامپور بلا کر اپنے مقربین و متمدین کے زمرہ میں شامل کیا۔ موصوف اپنی زندگی بھر نواب صاحب کے منظور نظر رہے، اور ہر اعتبار سے اپنے ہم عصر میں ممتاز۔

مرزبوم | محمد علی کا اصلی وطن کیا ہے؟ اس میں محمد علی کے واقف کاروں اور شناساؤں

کا خفیف سا اختلاف ہو، ایک جماعت کا خیال ہے کہ ان کا اہلی وطن مراد آباد ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ بجنور کی طرف کے تھے، لیکن ترجیح آخری قول کو ہو، خود مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ وطن کا تذکرہ کیا ہے اور اسے تسلیم کیا کہ وہ نیب آباد (بجنور) سے وطنی خصوصیت رکھتے ہیں۔

پیدائش ششہ کے اواخر کی ہے، اپنے بچائیوں میں سب سے چھوٹے محمد علی تھے، بڑے بھائی شوکت علی تھے، ان سے بڑے ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر۔

کچھ عجیب اتفاق ہے کہ جتنے اعظم رجال گزرے ہیں ان میں اکثر اپنے ایا م طفولیت ہی میں کم از کم سایہ پدری سے محروم ہو گئے ہیں، محمد علی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے انھوں نے بھی اپنے بچپن کی دوبہاریں دیکھی تھیں کہ داغ قہمی برداشت کرنا پڑا۔

لیکن خوبی قسمت سے آغوش مادر سے جدا نہیں ہوئے تھے ”بی اماں“ مرحومہ تسلیم نے جس بے نظیر استقلال و ایثار سے کام لے کر اپنے صاحبزادوں کو انگریزی تعلیم دلانی وہ یقیناً تاریخ نسیات کا ایک اہم باب ہے، پہلے معمولی اردو فارسی کی تعلیم تو مکان ہی پہنچی پھر بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کر دئے گئے، اور وہیں بورڈنگ ہاؤس میں قیام بریلی کا انتظام ہوا، اس وقت بریلی کے ہائی اسکول کی اونچی جماعتوں میں شوکت علی میر محفوظ علی وغیرہ تعلیم حاصل کر رہے تھے، ان بڑوں میں ایک موٹا تازہ چست چالاک، بھولا بھالا، لڑکا محمد علی بھی تھا، وہ اس وقت چھوٹا تھا، لیکن بعد کو سب سے بڑھ گیا!

میر محفوظ علی صاحب جو اس زمانہ میں خود بھی بریلی ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے فرماتے ہیں:-

”محمد علی (بریلی) میں بلا کے ذہین مگر کم محنت تھے، استاد سب خوش رہتے تھے

مزاج میں تیزی اور حاضر جوابی بہت تھی۔

میر صاحب موصوف کا بیان ہے کہ

بھائی کا احترام | رشوت خوش گپ اور یار باش ہونیکے ساتھ کابل اور خوراکرانی
ہو چلے تھے، طالب علموں کے مجمع میں بیٹھے، محمد علی، پانی پلاؤ، پانی لاؤ، کتاب
اٹھاؤ، اچکن رکھاؤ، کہا کرتے تھے ایک دن خطیب جی نے مولوی سخاوت حسین
مروم اسٹنٹ انسپکٹر مدارس، محمد علی کو رگ باش برادر خور و مباحث کے معنی
سجھائے میں نے کہا ایک دوسرا جملہ بھی ہے، خرباش برادر بزرگ مباحث
خطیب جی نے اس کے معنی بھی سمجھا کر کہا تو محمد علی تم رگ ہوئے اور رشوت خور
محمد علی نے فوراً جواب دیا، جناب! میں خود تو رگ بنا پسند کروں گا، مگر
رشوت بھائی کا خرباش پسند نہ کروں گا خطیب جی نے کہا شا باش۔

لیڈری | قیادت کا جو نہ بچپن ہی سے فطرت میں پوشیدہ تھا، بڑی میں ان کی باطنی کیا تھی، ایک
بچہ ابتدائی جماعت کا طالب علم، لیکن یہاں بھی انھوں نے بچوں ہی کی ٹولی میں
اپنے سردار ہونے کا لوہا منوالیا اور اپنی چھوٹی موٹی جماعت کے وہ ”لیڈر“ تسلیم کر لئے گئے۔

باب

علی گڑھ

سرسید کے ”مدرسۃ العلوم“ کا اس زمانے میں گھر گھر نیا شہرہ تھا، علی گڑھ کی عام فضا | چند ہی دنوں میں اس ”مدرسۃ العلوم“ نے مسلمانوں میں اپنی دھاک بٹھال لی تھی، عام مخالفت کے باوجود ہر شخص اس کے خصوصیات کا معترف تھا، حقیقت بھی یہ ہے کہ اس زمانہ میں علی گڑھ کی دنیا ایک دوسری دنیا تھی، بورڈنگ کا طرز معاشرت، طلبہ کا شوق تعلیم، کھیلوں اور ورزشوں میں طلبہ کا امتیاز، تحریر و تقریر میں ان کا کمال، گھریلو زندگی میں ان کی پچھپیاں، یہ وہ چیزیں تھیں جو علی گڑھ کے احاطے سے نکل کر دور دور پہنچ چکی تھیں، اب علی گڑھ کی طرف میلان عام ہو رہا تھا، جسے ”صاحب“ بننے کی ہوس تھی وہیں جانا چاہتا تھا، اور وہیں کے خصوصیات کا اپنے تئیں حامل بنانا ہر شخص کا انتہائی نظر تھا۔

اس زمانہ میں عجیب سحر آؤں فضا علی گڑھ نے قائم کر دی تھی، سیکڑوں ”مرزا پھو یا علی گڑھ“ میں داخل ہوئے لیکن جب ہاں سے نکلے تو تیز دطرار بن کر بات بات میں شوخی، چال و ڈھال میں رنگینی، کسی سادہ لوح کو دکھا ایک فقرہ پست کر دیا، ریل میں سوار ہوئے تو آفت مچا دی، ڈپٹی کلکٹری اور اسی قسم کے سرکاری عہدے تو اس زمانہ میں گویا ایک ”علی گڑھ“ کیلئے نہایت سہل الحصول ملازمت تھی، جب چاہتا تھا وہ ان پر قبضہ کر سکتا تھا۔

محمد علی کا داخلہ | یہ فضا تھی جس میں محمد علی علی گڑھ میں اپنے برادر بزرگ مولانا شوکت علی کی

گمراہی میں اُغل ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ معلوم ہو گیا کہ علیگر ٹھہ کے خصوصیات کو پورا پورا لگانے میں علیگر ٹھہ کی دلچسپیوں میں اضافہ کرنے میں محمد علی کا غیر معمولی حصہ ہے۔

علیگر ٹھہ میں آنے کے بعد بھی محمد علی کے اوضاع و احوال میں فرق نہیں آیا، بس طعن بریلی میں وہ سب سے زیادہ ذہین اور سب سے کم پڑھنے والے تھے، یہاں جی ان کی نشست قائم رہی۔

سر محمد یعقوب سابق پریسیڈنٹ لکھنؤ اسٹیج جو محمد علی کے رفیق درس و تہذیب ہیں، فرماتے ہیں:-

”سال کا بہت بڑا حصہ تقریبات اور کھیل کود میں گزرتا تھا، کورس کی تہمتیں کبھی شکل سے محمد علی کے پاس جمع ہوتی ہوں گی، مگر مبادا فیاض نے ان کو غضب کا حافظہ اور ذہن عطا کیا تھا، امتحان سے دو ہفتے پیشتر کتابیں ادھر ادھر سے جمع کر کے وہ پڑھائی پر پل جاتے تھے اور چند روز کی محنت سے وہ ہمیشہ اچھی طرح پاس ہوتے تھے“

میر محفوظ علی صاحب ان کی کم گفتی کا یہاں بھی اعتراف فرماتے ہیں، لیکن یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ:

”محمد علی قابل رشک اہلیت کے ساتھ کلاس میں لیکچر سننے، فیلڈ میں کرکٹ کھیلنے اور یونین میں تقریریں کرتے تھے“

سجاد حیدر صاحب یلدرم، سابق جرنل اسلام یونیورسٹی علیگر ٹھہ، جو محمد علی کے کلاس فیلو اور نہایت عزیز دوست ہیں، ان کے بیان کا ایک اہم اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے۔ اس میں سید صاحب نے اپنے قلم اعجاز رقم سے علیگر ٹھہ کی زندگی اور محمد علی

کی حالت کا پورا دلغریب نقشہ پیش کر رکھا دیا ہے۔

”خواجہ غلام نقی علی خاں، چودھری خوشی محمد ناظر حمید الدین (فرہی) اکلج کی کلاسوں میں پڑھ رہے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی علمی زندگی سے طلبہ اور اساتذہ کے محبوب بنے ہوئے ہیں، شوکت علی خاں کرکٹ کے کپتان ہیں اور کرکٹ کا کپتان اس وقت کے علی گڑھ میں اپنی قلم و دہر ڈنگ اکا مسوینی ہے طلبہ اس کے تابع فرمان، پروفیسر اس کے اقتدار کو ماننے والے اور بڑھانے والے، کپتانی اور دنوں نے بھی کی اور کر رہے ہیں لیکن شوکت علی کی کپتانی یادگار زمانہ ہے، اسی نے کپتان کے کمرہ کو ایک دربار کی حیثیت دیدی تھی وہ کمرہ ایک ہی وقت میں دربار شاہانہ اور بزم احباب بنا رہتا تھا، جویر طلبہ کے استغاثے وہاں سے جاتے تھے، اور فیصل ہوتے تھے، ان استغاثوں کی سماعت کے وقت کمرہ میں، اور شام کو کمرہ کے باہر صحن میں احباب بکھڑا رہتا تھا جو کبھی کبھی اس لئے کہ مسوینی ہر وقت ان سے یہ کام نہیں لیتا تھا جووری کے فرائض بھی ادا کرتے تھے، جب میں علی گڑھ کالج کے اسکول کی محمد علی سے تعارف | نویں جماعت میں داخل ہوا تو شوکت علی کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی محمد علی بھی رہتا تھا یہ لڑکا کلاس میں ذہین، کلاس سے باہر لڑکا اور ہر فن مولا تھا، محمد علی اپنی بہت ہی مختصر دنیا اپنے ہم عمر لڑکوں کی سرداری | سرداری | کرتا تھا، مگر نہ اس طنطنے کے ساتھ جو اس کے بڑے بھائی شوکت علی کو نصیب تھی اور پھر غضب یہ کہ اس چھوٹے سے سردار کی بڑا بھائی سب کے سامنے ایسی ذلت کر دیتا تھا کہ سردار کی محدود سرداری دھری رہ جاتی تھی۔

بارہم نے دیکھا کہ بڑے بھائی نے محمد علی کو ڈانٹ کر اپنے حضور میں بلایا اور اس
بزم اجاب و دور بارعام میں جس کا اہر ذکر ہو چکا ہے دو ایک سوال جواب کے
بعد رساروں پر تھپڑ مار کر سزا دی گئی۔

انگریزی قابلیت | سجاد وحید صاحب ہی کا بیان یہ بھی ہے کہ
”اپنی انگریزی قابلیت کے لئے وہ اب بھی ممتاز تھے کہ ہم دونوں
انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کالج کی کلاسوں میں آئے یہاں پہنچ کر اسکے کردار
کی وہ خصوصیت نمایاں ہوئی جس نے دنیا میں محمد علی کو اپنے اقران و معضروں
یونین کی تقریریں اور | میں سب سے علیحدہ کر دیا یعنی، محمد علی کی آزادی رائے و
پروفیسرین سے اختلاف | آزادی عمل، وہ اکثر اپنے پروفیسروں سے اختلاف کرتے تھے
یونین میں ایسے مباحث پر تقریر کرتے تھے جس جانب تقریر کرنا اکثر پروفیسروں
کی صیہیں جس کا باعث ہوتا تھا، تقریریں ان کی زوردار، زبان شستہ اور اپنے
سن سال کے لحاظ سے نہایت موثر ہوتی تھیں۔“

ذہانت | محمد علی کی ذہانت علی گڑھ میں بھی ممتاز رہی اگرچہ انکی کم غنتی کی ہر شخص شکایت کرتا ہو
لیکن ان کی غیر معمولی ذہانت اور قوت حافظہ کا بھی ہر شخص معترف ہو۔

مولنا شبلی کا امتحان لینا | اتفاقاً ہمیں اس باب میں ایک پر لطف واقعہ مولنا شبلی کے امتحان لینے
کا مل گیا، اور خوش قسمتی سے وہ واقعہ خود صاحب واقعہ بیان کر رہا ہے
مولنا مرحوم اپنے ایک مکتوب گرامی میں مولنا عبد الماجد صاحب مدظلہ (مدیر سچ) کے ایک استفسار
کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں :-

”گیارہ برس کی عمر میں علی گڑھ گیا، ایک بڑے بھائی نے میری نودوں کوئی

کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا، دوسرے نے میرے حافظہ کی تعریف کی کہ بہن کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا میں نے ایک عربی کا شعر پڑھا تو (محمد علی) نے مجھے ترجمہ سنا دیا، حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے، مولانا کو یقین نہ آیا، اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے، پہلے امون کی اولاد کی فہرست مانگی پھر اس کا شجرہ چچا، جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعہ طبع اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو، چنیے از قسم لکھ پڑج اسی وقت تیار ہو گئی میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر جو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لکھ پڑج کا تھا۔

بچپن ہی سے محمد علی کو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی اور جب انھیں موقع ملتا تھا تو شاعری انکے انکا رموزوں دل کی خلوت سے نکل کر اجاب کی جہولت میں آجاتے تھے۔ اپنی شاعری کے متعلق انھوں نے مولانا عبدالمجید صاحب دریا بادی کے نام ایک خط میں بڑے تذکرہ کیا ہے جس کا ایک حصہ ہم یہاں درج کرتے ہیں اور اہم ترین حصہ اس سلسلہ میں درج کرینگے جب محمد علی پر ایک شعر گو کی حیثیت سے گفتگو کی جائیگی، بہر حال اس مکتوب میں اپنی کالج کی شاعری کے متعلق انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ یہ ہے:-

”کالج میں آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا، پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم تمین شعرا نے حاجی امیل خاں صاحب کے شکریہ میں تیار کی تھی، ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا، ایک سجاد حیدر اور ایک سید وزیر حسن صاحب، ”آنریبل“ ”د“ ”آزمودہ کار“ ”سکرٹری مسلم لیگ“

مولانا شبلی مرحوم اس زمانہ میں علیگڑھ میں عربی کے پروفیسر تھے۔ (مؤلف)

کے براؤں اٹھنے۔۔۔۔۔ وہ مشاعرہ جے بعد کو حسرت نے رونق بخشی، ہم ہی لوگوں
کا ایجا و کردہ تھا، چودھویں کو ہوا کرتا تھا، اور ایک شمع پیش کی جاتی تھی، کرکٹ کالان
جائے مشاعرہ تھا، ایک بار چودھویں کو بارش ہو گئی تو تین چار دن مطلع صاف
ہونکی راہ دیکھ کر مشاعرہ ڈانگ ہال میں کیا گیا، اس وقت میں نے اپنی
ایک غیر طرح غزل میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا ہے
فرش ز مردیں نہیں ہے چاندنی نہیں لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

۹۶ء میں علی گڑھ سے بی، لے کا امتحان دیا، صوبہ متحدہ کے کامیاب۔
بی، لے کا امتحان طلبہ میں محمد علی کا نمبر اول تھا، لوگوں نے اسے حیرت کے ساتھ سنا کہ
علی گڑھ کا یہ کھلنڈڑا، یونیورسٹی میں سب سے اول کس طرح آگیا لیکن جو لوگ اس کی غیر معمولی فہم
ذکاوت سے واقف تھے ان کے نزدیک یہ کوئی تعجب خیز واقعہ نہ تھا۔

میر محفوظ علی صاحب اپنے مخصوص انداز میں محمد علی کا واقعہ کامیابی
میر محفوظ علی کا بیان محمد علی ہی کی زبان سے بیان فرماتے ہیں کہ

”سٹر گو کھلے کی وفات پر دہلی کے ماؤن ہال کے میدان میں جلسہ ہوا تو پند
دن موہن مالوی یا سرنیدر ناتھ برجی نے بیان کیا کہ گو کھلے نے اکیس سال
کی عمر میں بی، لے کیا اور یونیورسٹی میں امتیازی جگہ حاصل کی، محمد علی نے
اپنی تقریر میں کہا کہ گو کھلے علم و قابلیت کا مجسمہ تھے، انکے لئے یہ امور باعث
فخر نہیں، آپ کا یہ نیاز مند جو گو کھلے سے کوئی نسبت نہیں رکھتا، بیس سال
کی عمر میں یونیورسٹی میں اول آچکا ہے، یس کر حاضرین منہ تکنے لگے یہ

سید اصف حسین صاحب بی، لے، ال، ال، بی، علیک، اسٹن جج، مؤلف

باب

آکسفورڈ

علیگرہ میں محمد علی اپنی لائق رشک زندگی ختم کر کے عازم انگلستان ہوئے، علیگرہ سے کس طرح رخصت ہوئے، ولایت جانے کا انتظام کیونکر ہوا؟ اجاب پر کیا تاثرات قائم ہوئے اور اساتذہ نے کیا کیا؟ اس کے متعلق بہترین بیان محمد علی کے کلاس فیلو سید جاحید صاحب ہی دے سکتے ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:-

سجاد حیدر کا بیان | ”علی گرہ کی طالب علمی اس چمک دمک کے ساتھ ختم کرنیکے بعد محمد علی علیگرہ سے رخصت ہوئے، مگر کس طرح؟ پرسپل خوش تھے کہ ایک جھگڑا الوداعی علم جارہا ہے، عام طلبہ کو رنج تھا کہ ایسا خوش گویان کرنے والا، بذلہ سنج، مگر ساتھ ہی موقع پڑنے پر لڑائی بھڑائی میں ان کی سرداری کرنے والا، اور اس کے لئے پروفیسر سے بے دھڑک اور بے جھجک لڑنے والا جارہا ہے، علم دوست اور لائق طالب علم حیران تھے کہ محمد علی ان سے کیوں دور رہتا تھا بلکہ وہ کیوں ان کی ہنسی اڑاتا تھا؟ انگلیڈ روانہ ہونے سے قبل وہ علی گرہ آئے اور اجاب نے انھیں ایک رخصتی ڈنڈا دیا۔“

الوداعی نظم | اس الوداعی ڈنڈے میں ایک الوداعی نظم بھی پیش کی گئی جو اس کے یار عزیز، سجاد حیدر بلدرم کے ترشح افکار کا نتیجہ تھی، نظم یہ ہے:

اسے خلعت سروری کے ثایاں اسے عازم مصر خسر کناں
سی، ایس، کی مصر کو تفسیر ایسی کر دجا کے کوئی تدبیر
یہ عزم سفر تھیں مبارک یہ باب ظفر تھیں مبارک
ایں نقد بہ کیہ در میان کن زیں بعد ہر انچہ خواہی آں کن
سید صاحب موصوف فرماتے ہیں :-

”اس وقت یہ دعا دل سے نکلی تھی، مگر شکر ہے یہ دعا قبول نہ ہوئی، خدا کو اس سے زیادہ شاندار، زیادہ اہم، اور زیادہ نتیجہ خیز کام لینے تھے“

شوکت کا اثار | ادھر تو یہ انتظامات ہو رہے تھے، ادھر ایک خاص وقت بھی تھی، یعنی قیام انگلستان کے مصارف کا انتظام باقاعدہ اگرچہ کافی تھی، لیکن ایک تودہ خود عبدالعلی خاں صاحب مرحوم ہی کے زمانہ سے مقروض تھی، دوسرے علی گڑھ کے زمانہ تعلیم میں اور زیادہ مقروض ہو چکی تھی، لیکن اس وقت کو محمد علی کے عاشق زار بھائی شوکت علی نے جو اس زمانہ میں محکمہ افیون کے افسر تھے اس طرح حل کیا کہ خود تودہ دسے کے سفر خرچ میں اپنا گزر کریں اور اپنی تنخواہ محمد علی کو دیں، اس طرح ”بڑے بھائی“ کو لوٹ کر محمد علی ولایت روانہ ہوئے، یلدرم صاحب نے بیچ فرمایا کہ

”شوکت نے اپنے بھائی کے ساتھ وہ کام کیا جو کم لوگ اپنی اولاد کے لئے بھی کرتے ہیں“

انگلستان | محمد علی بڑے شوق و ولولہ کے ساتھ سفر یورپ پر روانہ ہوئے تھے جس کا انھیں خود بھی اعتراف ہے، انگلستان کی محیر العقول کرشمہ سازیاں سن کر ان کے دل میں طرح طرح کے جذبات موجیں مارتے تھے، پھر حبیب خدا نے یہ موقع فراہم کر دیا، اور وہ بے حد مسرت

و نشاط روا نہ بھی ہو گئے تو ان کو کھل کھیلنے کے کافی مواقع تھے، اور پھر جب جیب میں دام بھی ہوں
لیکن محمد علی کے علاوہ ان کا ہر دوست اور دشمن اس کا معترف ہے کہ محمد علی کی زندگی انگلستان
اخلاقی حالت | کی ہوش با اور غارت گری شکیب فضا میں بھی اتنی پاکباز، اتنی بے رنگ اور
اتنی صاف رہی کہ ہر شخص انگشت بردنداں رہ گیا، اپنی ”پاک دامن“ کا خود محمد علی کو بھی اعتراف
تھا، چنانچہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے نام اپنے ایک مکتوب میں اس کا تذکرہ کیا ہے کہ
”کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا یہاں البتہ شاہان اصلی کی کمی نہیں تھی مگر ذوق
نظارہ ہمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی، تاہم طبیعت کا میلان خلاف و تنویر
عام زہد و توسع کی طرف تھا“

داخلہ | محمد علی آکسفورڈ کے لیکن کالج میں داخل ہوئے اور چونکہ طبیعت پر علمی ذوق غالب تھا
اس لئے ان مضامین سے دلچسپی لیتے رہے جو ان کی افتاد طبع کے موافق تھے اور جن مضامین
سے طبیعت نفور تھی، ان کی طرف مطلق التفات نہ کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جس مقصد یعنی I.C.S.
سول سروس میں ناکامی کا امتحان دینے گئے تھے، اس میں ناکام ہوئے، مولانا شوکت علی
شوکت پراثر | نے جب اس خبر وحشت اثر کو پانیر میں پڑھا تو ان کا چہرہ و فور تاثر سے زرد ہو گیا
لیکن بی اماں پاس بیٹھی ہوئی تھیں، انھوں نے اپنی جواں ہمتی سے نہ صرف یہ کہ خود اپنے اوپر
کوئی اثر نہیں ظاہر ہونے دیا بلکہ مولانا شوکت علی کو بھی ڈھارس دی اور فرمایا کہ اسے بالآخر ہنگام
بیٹھی ہوئی ہے شادی کر دو، پھر دکھاجائے گا، چنانچہ محمد علی دلپس آئے اور شادی کر دی گئی
بی اے کا امتحان | اب محمد علی انگلستان اسرار سے گئے کہ بی۔ اے کا امتحان دیں چنانچہ اس
میں انھوں نے تیاری بھی کی اور چونکہ مضامین طبیعت سے مناسبت رکھتے تھے اس لئے کامیابی ”آنرز
میں گریجویٹ“ کی حیثیت سے حاصل کی، اس نمایاں کامیابی کے بعد وہ ہندوستان واپس آئے۔

باب

انگریزی قابلیت

محمد علی کے تمام شناسا اس پر متفق ہیں کہ محمد علی اپنی انگریزی استعداد و قابلیت کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں میں ہمیشہ نہایت ممتاز رہے، بریلی میں وہ ایک کمن بچہ کی حیثیت رکھتے تھے، لیکن اپنی جامعیت میں انگریزی سب سے اچھی جانتے تھے علی گڑھ آئے تو گورکھ پادے ”کلنڈروں“ کی صف میں داخل ہوئے، اور وہاں کی نامتر شہرت ان کی اسی حیثیت سے ہے وہ سب سے کم محنت کرنے والے کرکٹ کھیلنے والے، یونین میں تقریر کرنے والے، اپنے اساتذہ سے لڑنے والے اور کتابیں تک اپنے پاس نہ رکھنے والے طالب علم تھے، لیکن اس کا بھی سب کو اعتراف ہے کہ وہ اپنی اس سلسلہ ”کلنڈریت“ کے باوجود سب سے اچھی انگریزی بولتے تھے، اور سب سے اچھی لکھتے تھے، پھر حیب وہ آکسفورڈ گئے تو ان کی استعداد میں اور غیر معمولی اضافہ ہو گیا، اب تک وہ ایک قادر الکلام انگلش نگار تھے، لیکن انگلستان سے واپسی کے بعد وہ ایک مبصر ماہر زبان ہو گئے۔

مارین کاخراج تحسین | علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی میں انھوں نے ”علی گڑھ ٹیچر“ میں ایک مضمون سپر سٹلم کیا تھا، وہ مضمون سید پسند کیا گیا اور طلبہ سے گزر کر اساتذہ نے بھی اس کی بہت تعریف کی، علی گڑھ کالج کے مشہور رپرٹل مٹر مارین نے تو دونوں مسرت میں یہاں تک کہہ دیا کہ

”تم ایک زمانہ میں انگریزی کے بے مثل ادیب ہو گے“

اور کون کہہ سکتا ہے کہ مسٹر مارٹن کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی؟

ٹیکسپیئر عبور | محمد علی کے ایک دوسرے ”حالات“ نگار کا بیان ہے کہ
 ”تصانیف ٹیکسپیئر کے جیسے محمد علی ماہر ہیں، اس صنف میں ہندوستان میں ان کا
 کوئی ثانی نہیں ہے چنانچہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے زمانہ طالب علمی میں مسٹر
 موصوف نے ”میکلس“ پر ایک نہایت قابلانہ اور شاندار مضمون لکھا جس کے
 صلہ میں آپ ”آکسفورڈ سوسائٹی“ کے پہلے ہندوستانی سکریٹری مقرر ہوئے
 جو ایک ہندوستانی کے لئے اعلیٰ ترین علمی اعزاز کہا جاسکتا ہے۔“
لارڈ منٹو کا اعتراف | آگے چل کر لارڈ منٹو کا ایک دلچسپ اعتراف بھی یہیں اسی ”حالات“ نگار
 سے معلوم ہوتا ہے کہ

(Thought) اس قدر مقبول ہوا کہ نہ صرف ہندوستان میں قسمت
 کی نگاہ سے دیکھا گیا بلکہ لارڈ منٹو جو اس زمانہ میں وائسرائے تھے اور ان کے
 چیف سکریٹری نے مولانا ممدوح کی اعلیٰ قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے
 ان کی کوششوں کو بہت سراہا۔“

میر محفوظ علی کا بیان | میر محفوظ علی صاحب جنہوں نے محمد علی کا بچپن بھی دیکھا ہے، اور شیب و
 شباب کے حالات سے بھی واقف ہیں، نیز محمد علی کے ساتھ ان کی عملی زندگی میں ایک عرصہ تک
 حق رفاقت ادا کر چکے ہیں، اُردو کے ایک بے نظیر انشا پرداز اور انگریزی کے صاحب
 ذوق مبصر ہیں، محمد علی کی انگریزی انشا پردازی کے متعلق فرماتے ہیں:
 ”محمد علی، کی ہمہ گیر ذہانت نے انگریزی ادب و انشا مصطلحات و محاورات

لے رسالہ میں ”میکلس“ لکھا ہے لیکن غالباً یہ ”میکلتہ“ ہے (تو لفظ)

طرز ادا و طریقہ بیان پر اس درجہ عبور و تبحر حاصل کیا کہ ان کے قلم و زبان دونوں کو
جاہلوں سے لے کر عالموں، گنواروں سے لیکر شہریوں، فقیروں سے لیکر امیروں
اور مزدوروں سے لیکر وزیروں تک کے الفاظ و عبارات ادا کرنے پر یکساں
کامل قدرت و مہارت حاصل تھی، ملاحوں کے سرمد انھیں یاد تھے، آبادوں کی
لودریاں انھیں یاد تھیں، لیرک (Limerick) انھیں یاد تھیں
ندن کے مشرقی حصہ (East end) کے آوارہ گرد چھوکرؤں کی بھیتیاں
انھیں یاد تھیں، بل (Bull) انھیں یاد تھے، ممے اور چیتان انھیں
یاد تھے، اس کے ساتھ انگریزی کے متقدمین متوسطین اور متاخرین شعرا اور مصنفین
کے بہترین علمی و ادبی جواہر پاسے انکی زبان پر یا ان کی نظر میں تھے انہیں کی
کتب عتیق و جدید پر ان کی نگاہ تھی سیکڑوں علمی لطفے اسنے نوک زبان تھے
طبیعت پر چونکہ بذلہ سخی، ظرافت اور شوخ بھکاری کا رنگ غالب تھا لہذا اس
صنف میں ایسا بے ساختہ اور اتنا بہتر لکھ سکتے تھے کہ باادقات ان میں اور دن
پنج کی ظرافت میں مشکل سے امتیاز ہو سکتا تھا، یہ ایک جاہل اور بیچ مدان
ہندی کا خیال نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے انگریز ادیبوں کی غیر جانبدارانہ
رائے ہے۔“

میکڈالڈ کا خیال | مٹر میکڈالڈ جواب وزیر اعظم ہیں ان سے بھی محمد علی کے بہت کافی
تعلقات تھے، تعلقات پر گفتگو تو آئندہ کسی موضوع کے تحت کی جائیگی، یہاں صرف ان کی
رائے محمد علی کی انگریزی انشا پردازی کے متعلق لکھنی ہے۔

۱۳۱۱ء میں لارڈ اسلنگٹن کا پبلک سروس کمیشن جب ہندوستان میں دورہ کر رہا تھا

تو اس کے ایک رکن مسٹر میکڈانلڈ بھی تھے مسٹر ریزے میکڈانلڈ سے محمد علی کے تعلقات کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے کیشن جب لکھنؤ گیا ہے تو محمد علی بھی اس کے سامنے شہادت دینے گئے تھے، دوران گفتگو میں محمد علی سے

”مسٹر میکڈانلڈ نے بالآخر ام اپنے کامریڈ پڑھنے کا ذکر کیا اور میری (محمد علی کی)

شوخی تحریر کی بہت کچھ تعریف فرمائی

ٹائمز آف انڈیا کا خیال | ٹائمز آف انڈیا کا لندنی وقائع نگار، جو اس کا کوئی سابق ایڈیٹر ہو محمد علی کی وفات پر ان کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی انگریزی لیاقت کے متعلق کہتا ہے :

”مجھے افسوس ہے کہ انکی تعریف میں جو کچھ کہا گیا اس میں ان کی یہ خوبی نظر انداز کر دی گئی ہے کہ وہ انگریزی زبان پر حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے، کوئی ہندوستانی اس میں اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اور انگریزوں میں شاید بہت ہی کم ان سے بہتر لکھ سکتے تھے، مرحوم نے صحافت کی زندگی شروع کرنے سے پیشتر چھ بہت طویل مشورے کئے تھے۔

۔۔۔ ایچ جی اولیئر | مشہور مصنف ایچ جی، ولیئر نے بھی مولانا محمد علی کی انگریزی قابلیت کا اعتراف کیا ہے اور نہایت شاندار الفاظ میں، محمد علی کا جب انتقال ہوا تو اس نے کہا،
”محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا، اس کا سلم میکا لے کا قلم تھا، اس کی زبان برک کی زبان تھی“

مصنف موصوف نے اپنے ایک خط میں جو اس نے مولانا عبداللہ صاحب دریا بادی کو لکھا ہے، محمد علی سے اپنی شناسائی اور ملاقاتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

بزمارڈشا کی قدرانی | بزمارڈشا سے بھی محمد علی کے تعلقات تھے، شاہجی ان کی غیر معمولی قابلیت اور دیگر خصوصیات کی بنا پر ان کا خاص طور سے گرویدہ تھا، چنانچہ ۱۹۲۸ء میں جب محمد علی پہلے علاج انگلستان گئے تھے تو شاہ سے بھی ملاقات کی، گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے جب وہ پھر انگلستان گئے ہیں تو ابکی پھر اس سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔

مکتوب بزمارڈشا بنام عبدالماجد | حال میں جارج بزمارڈشا کا ایک خط مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام آیا ہے جس کا متن ذیل ہے:

”میری محمد علی سے صرف ایک ملاقات میرے ہی مکان پر ہوئی تھی جس میں جنوع گفتگو یہ تھا کہ جس طرح اصلاح کیلئے مارٹن لوتھر نے کی تھی آیا اس قسم کی اصلاح کی اسلام کے اندر گنجائش ہے؟ ہم دونوں اس نتیجہ پر متفق ہو گئے تھے کہ اسلام جن پستیوں میں صدیوں سے گرا ہوا چلا آتا ہے ان سے اسے نکالنے کی صورت یہی ہو کہ محمد دے اسلام کی تحریک و دعوت از سر نو پیش کی جائے، محمد علی کی ملاقات میرے لئے بہت ہی پر لطف تھی اور آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ میں بھی ان کے لئے بارحاضر میں ثابت ہوا، میں اس پر فخر کرتا ہوں کہ ہماری ملاقاتیں قدر دوستانہ رہی۔

محمد علی کی شخصیت کا نقش میرے قلب پر ایسا پڑا تھا کہ جب میں نے ان کی وفات کی خبر سنی تو میں نے محسوس کیا کہ اسلام کا ایک بڑا دردست و پر جوش خادم اٹھ گیا۔“

سرماگل اڈاٹر کی قدرانی | پنجاب کا مشہور گورنر سرماگل اڈاٹر بھی محمد علی کا خاص قدر دان اور بہت مخلص دوست تھا جاؤرہ کی وزارت کے لئے وہی زور دے رہا تھا اور یہ کوشش کر رہا

تھا، لیکن جب محمد علی نے انکار کر دیا اور کامریڈ کالنے کا عزم غماہ کیا تو اس نے ہر قسم کی انسانی امداد کی، لیکن آخر میں محمد علی سے اسے تجربہ نہایت ”تلخ“ ہوا، سیدزیر صاحب ہزاروی ایم اے لکھتے ہیں کہ:

”سرنیکل اڈوڈا راجی کتاب ”Indian as I know“ میں لکھتے

ہیں کہ مسٹر محمد علی نے اس اخبار کے اجراء سے پہلے مجھ سے مشورہ لیا، میں نے ان کی حوصلہ افزائی کی، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں خود ہی سب سے نیا اس اخبار کا تختہ مشق بنا رہا۔“

مسٹر گوگلے کا اعتراف | مدیر انقلاب کا بیان ہے کہ:

محمد علی، نے اپنی ادبی و سیاسی قابلیت کے تقاضے سے بعض انگریزی اخبارات میں نہایت ہنگامہ خیز مقالات لکھے ”انفر آف انڈیا“ ”انڈین اسپیکٹر“ ”ہندوستان ریویو“ وغیرہ کے قائل اس کے گواہ ہیں، منٹو مارلے اصلاحات پر آپ کے اور مسٹر گوگلے کے درمیان ایک تحریری مباحثہ چھڑ گیا جس میں آپ نے انتہائی قابلیت کا ثبوت دیا، یہاں تک کہ مسٹر گوگلے بھی آپ کی قوت استدلال اور زور بیان کے قائل ہو گئے اور لارڈ منٹو نے بھی آپ کی قابلیت کا لوہا نہا۔“

مینی کرائیکل | ایک زمانہ میں مینی کرائیکل کا ایک دہلی ایڈیشن بھی نکلتا تھا، ایک بار اس کے
علمہ دارت کے ایک رکن، ایم۔ این۔ ٹی، نے ایک نہایت دلچسپ، پر لطف اور مفصل مضمون محمد علی کے متعلق لکھا تھا، اس کا ایک اہم حصہ یہ ہے:

”جس شخص نے کامریڈ کے ادراک کا بغور مطالعہ نہیں کیا اس نے محمد علی کی شخصیت کے اسرار کو سمجھا ہی نہیں، مولانا محمد علی نے جو ملک کے سب سے زیادہ روشن

دماغ اخبار نویس ہیں اپنے قلم کے ذریعے اپنا دل اخبار میں پکا دیا ہے، اور اس کے ساتھ انھوں نے ظرافت، مذاق اور تعریض کا ایک ایسا بے پایاں دریا بہا دیا ہے جو مدتوں تک آئندہ اخبار نویس کے لئے وجہ رشک رہے گا۔ آدمیوں کی سیاسیات، ان کے طریق کار، اور تحریکوں کا نقشہ کھینچنے میں محمد علی لاثانی ہیں، اور غالب لاثانی رہیں گے۔

سرعت تحریر | اس غیر معمولی بہارت اور بصارت کے باوجود محمد علی میں ایک دوسرا وصف بھی تھا، یعنی سرعت تحریر، اہم اہم مضامین کی انھوں نے کم سے کم دقت میں تکمیل کر دی ہے۔ چو آئس آف دی ٹرکس | اپنا مشہور و معروف مضمون ”چو آئس آف دی ٹرکس“ محمد علی نے ایک نشست میں جو مسلسل ۲۲ گھنٹے تک قائم رہی تھی، لکھا تھا اور صرف یہی مضمون نہیں اکثر دیگر وہ اسی طرح لکھتے تھے، اور لکھنے پر مجبور تھے، کیونکہ کثرت مشاغل، کثرت احباب اور کثرت کار سے ان کے پاس اتنا وقت بچتا ہی نہیں تھا کہ وہ سکون قلب اور اظہار خیال کے واسطے مضمون لکھ سکیں، رفنار کار | امیر محفوظ علی اپنے زمانہ قیام دفتر ہمدرد کا مرید کا ایک دلچسپ واقعہ بتاتے ہیں کہ۔

”محمد علی بالطبع سست نہ تھے، مگر کامل ضرور تھے، منٹوں کا کام دنوں بلکہ ہفتوں نہیں کرتے تھے، مگر جب کرنے پر آجاتے تھے تو ہفتوں کا کام منٹوں میں نہیں تو گھنٹوں میں ضرور کر دیتے تھے، دہلی آکر کامیڈی بھی دقت پر نہ نکلا، صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد مضمون لکھنے بیٹھے ہی تھے کہ فلاں صاحب تشریف لائے اب مجلس گرم ہوئی، پھر، باہر جانے کا دقت ہوا، تشریف لے گئے، کھانے کے وقت واپس آئے، ہمارے ضبط کا پیالہ چھلک گیا، اور جو کچھ منہ میں آیا بکثت شروع کیا، صبح کو ناشتہ پر بلائے گئے، ”بھائی جان کچھ غصہ کم ہوا، بخفا کیوں

موتے ہوئے زُمنون گئے یا کسی کی جان؟ یہ کہہ کر ایک بلند پھینک دیا، دیکھا تو
کا مرڈ کے لئے گپ کا ایک نہایت ہی لچھے دار مضمون تھا۔“

باب ۵

ذوق تفحص اور وسعت مطالعہ

محمد علی کو قدرت نے غیر معمولی قوت ذہانت، بلکہ فہم و تدبیر اور قوت حافظہ عطا فرمائی تھی لیکن قدرت کے اس عطیہ پر وہ قانع نہیں تھے، بلکہ اپنی ذہنی و دماغی قوتوں کو برابر استعمال کر کے ان میں جلائیے بہتے تھے۔

بارہا ایسا اتفاق پیش آیا ہے کہ انھوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے اور اختلاف بھی کیا؟ مذہبی! اگرچہ عربی سے تقریباً دو نابلد تھے، اس لئے بظاہر انکی مذہبی استعداد کو بھی بس یوں ہی سمجھا جاتا ہے لیکن واقعہ ایسا نہیں تھا۔

قتل مرتد | غازی امان اللہ کے عہد حکومت میں ایک قادیانی نعمت اللہ کو تنگ سار کیا گیا، اس پر قادیانیوں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا، ہندوستان میں جلے ہوئے ریزولوشن پاس ہوئے وائسرائے اور ملک معظم سے فریاد کی گئی، یہاں تک کہ ”جمعیتہ امم“ تک اس معاملہ کو پہنچا لیا گیا اور انسانی کے نام پر اپیل کی گئی۔

دوسری طرف علماء ہندوستان نے ایک ”قیامت صغریٰ“ برپا کر دی، اور ہر ہڑتال سے انھوں نے امان اللہ کے اس فعل کو سخت قرار دیا، اور ”شرعی حق، اسلامیہ کی اہم ترین دفعہ کی حیثیت سے اس کو پیش کیا، اور ثابت کیا کہ یہ ایک نہایت اہم ترین اصول اسلامی ہے۔ محمد علی کی رائے کی صداقت و صحت سے اس جگہ بحث نہیں، یہاں صرف یہ کہنا ہر

کہ محمد علی نے ان دونوں جماعتوں کے افکار و آراء کا مطالعہ کیا اور پھر اپنا نظریہ پیش کیا کہ اسلام میں قتل مرتد جائز نہیں، ہاں قتل مفید نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔

یہ رائے محمد علی نے پیش کی حسب توقع اس کی مخالفت بھی ہوئی، لیکن محمد علی اس اختلاف و مخالفت سے متاثر نہیں ہوئے اس لئے کہ انھوں نے اس مسئلہ پر جو رائے قائم کی تھی وہ ملی وجہ البصیرۃ تھی، ان کا خیال یہ تھا کہ ”لا اکراہ فی الدین“ کی رو سے قتل مرتد ناجائز ہے، اور ”القتل اکبر من القتل“ کے اعتبار سے قتل مفید نہ صرف جائز بلکہ بعض صورتوں میں فرض ہے۔ اس مسئلہ پر انھوں نے آیات قرآنی، احادیث رسول، اقوال فقہاء، خیالات ائمہ، افکار مجتہدین کا اتنا اور ذخیرہ جمع کر لیا کہ ایک شخص پوری بصیرت کے ساتھ اس مسئلہ پر ”پسچ“ کر سکتا ہو۔ اس ذخیرہ سے متمتع ہونیکے بعد انھوں نے اپنی بصیرت کے مطابق ایک رائے قائم کی اور اس پر آخر وقت تک مصر ہے۔

سار و ابل | سار و ابل کی مخالفت سب سے پہلے محمد علی نے کی، اور اپنے متعدد پرزہ مقالات سے اس مسئلہ کی سیاسی اور مذہبی اہمیت بھائی، لیکن حسب عادت اس مسئلہ پر بھی محمد علی نے مخالف اور موافق ہر گروہ کے دلائل کا استقصا کیا، مذہبی حیثیت سے معلومات فراہم کئے، عہد رسالت عہد صحابہ، عہد تابعین کے حالات و واقعات کی جستجو کی، فقہ و احادیث کا ذخیرہ اپنے سامنے رکھا اور اس کے بعد بیانگ دہل اس کی مخالفت کی، ہر شخص سے مناظرہ کیا، مقالات لکھے لوگوں کو اپنی رائے سے موافق بنانا چاہا اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

واقعات دیوبند | ایک اخبار نویس کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ چیز یہ ہوتی ہے کہ ملک میں کوئی ہنگامہ ہو اور اس کا قلم پوری روانی کے ساتھ بڑی بڑی سنسنی خیز ”سرخیاں“ دے کر اپنے ”ہمدرد قوم“ ہونے کا لوہا منوائے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی مشہور اسٹرائک میں تقریباً

تمام اخبارات نے اپنی اپنی راہ عمل متعین کر لی یا تو انھوں نے ارباب دیوبند کی حمایت کی اور یا انھوں نے پھر ہتھم صاحب کو سب و شتم کا ہدف بنالیا، لیکن محمد علی نے اپنی ذمہ داری کا احساں کیا، اور وہ خود اپنی اہم ترین مصروفیتوں اور مشغولیتوں کے باوجود نفس نفیس بونہ قشرف لیگے وہاں کے حالات کا مطالعہ کیا، موافق اور مخالف ہر گروہ کے اندکار و آراء سے واقفیت حاصل کی، دونوں جماعتوں کا جو تحریری مواد تیار ہو چکا تھا اسے حاصل کیا اور اسے پڑھا، تب جا کر انھوں نے ہمدرد کو اظہارِ رائے کی اجازت دی، آج تک محمد علی کے دفتر میں تمام کاغذات ان تمام مسائل کے متعلق موجود ہیں اور ہر شخص انھیں دیکھ کر اس دعوے کی تصدیق کر سکتا ہے۔ یہ تو تھا ان کا شوقِ تفحص اور ذوقِ طلب اب ان کی وسعتِ نظر پر ایک نظر ڈالئے تو اور زیادہ وہ کامیاب ثابت ہوں گے، اپنے مخصوص مضامین، تاریخ، صحافت اور انگریزی میں تو خیر وہ فردِ فرید تھے ہی لیکن جن چیزوں سے ان کا کوئی خاص تعلق نہ ہوا چاہئے تھا، یا جن چیزوں پر انھوں نے خاص طور سے تیاری نہیں کی تھی ان میں بھی وہ سب آگے رتھے۔

غالب پر تو ان کی خاص نظر تھی، اس کا فارسی اردو ہر قسم کا کلام انھیں زبانی یاد تھا، یہاں تک کہ اس کے غیر مطبوعہ کلام پر بھی ان کی وسیع نظر تھی۔

براق شریف | غالباً سلسلہ میں فلسطین کے مسلمانوں اور یہودیوں میں ”دیوارِ گریہ“ اور ”براق شریف“ کے مسئلہ پر نہایت سخت تنازعہ رونما ہوا، محمد علی اس زمانہ میں علیل تھے، یہی گئے ہوئے تھے، شاید بغرض علاج، لیکن اخبارِ واسلے بھلا کسی مشہور لیڈر کو ”انٹرویو“، ”سے بغیر کب چھوڑتے ہیں؟ اچھی طرح یاد نہیں شاید ٹائمز آف انڈیا کا نامہ نگار پہنچا کہ اس اہم مسئلہ پر اپنی خیالات لکھوائے، محمد علی نے اپنے خیالات تو بعد کو لکھوائے، لیکن ”دیوارِ گریہ“ اور ”براق شریف“ کی تاریخی حیثیت پر اتنا پر مغز، اتنا مدلل، اور اتنا تاریخی بیان دیا، جو غالباً ہمیشہ یادگار رہے گا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ محمد علی علیل تھے، بیان دینے کے لئے تیار تھے، لیکن جب اس مسئلہ پر بحث کی تو پھر حقائق و معلومات کا ایک دریا بہا دیا، افسوس ہے کہ تجوئے بیار کے باوجود وہ بیان ذیل سکا ورنہ ناظرین کی خدمت میں اس کے ضروری حصص پیش کر دئے جاتے۔

محمد علی کی اس خصوصیت کا ان کے حلقہ تعارف میں ہر شخص معترف تھا، اور بوقت ضرورت انہیں کسی نہ کسی علمی کام میں شریک کر کے کی کوکشتش ضرور کی جاتی تھی۔

اردو انسائیکلو پیڈیا | ایک زمانہ میں راجہ صاحب محمود آباد کی عنان ترقیہ علمی سرپرستیوں کی طرف مبذول ہوتی تھی چنانچہ موصوف نے اپنی جیب خاص سے ایک لاکھ روپیہ اس پر صرف کرنے کی آمادگی ظاہر کی اور اردو انسائیکلو پیڈیا کی تدوین و تبویب کے مبادی گویا شروع بھی ہو چکے تھے، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اور مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی، اور امید بندھ چلی تھی کہ یہ کام انجام پاسکے گا، لیکن بعد کو مسلمانوں کے عام منصوبوں کی طرح یہ منصوبہ بھی ناکام ہی رہ گیا۔ بہر حال اس اردو انسائیکلو پیڈیا کی مجلس شورائی میں نواب عماد الملک جٹس (اب سر)، عبد الرحیم، ڈاکٹر (اب سر)، سپرد، ڈاکٹر (اب سر)، اقبال اور اس مسعود وغیرہ جیسی بلند پایہ شخصیتوں کے ساتھ محمد علی کا نام بھی رکھا گیا، اور صرف نام ہی نہیں رکھا گیا بلکہ کام کی دعوت بھی دی گئی چنانچہ مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی مدظلہ اپنے ایک مکتوب میں محمد علی کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”اردو انسائیکلو پیڈیا کا اعلان آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا، یہ فرمائے آپ کا اس میں کیا حصہ ہوگا، آپ کا نام اس کی مجلس شورائی میں تو رکھ بھی دیا گیا ہے، اس کے علاوہ جس چیز کی بابت آپ لکھنا پسند فرمائیں ہم لوگ بہ کمال اشتیاق آپ کے خیر مقدم کے لئے تیار ہیں آپ کی شرکت محض مجلس شورائی میں کافی نہیں آپ کو اس سے بہت زیادہ حصہ لینا چاہئے، تاہن

لڑ پھڑ جزو ملزم، غرض جس شے کے متعلق آپ چاہیں تحریر فرما سکتے ہیں
مکتوب سید سلیمان | اسی طرح مولانا سید سلیمان صاحب ندوی بھی اپنے ایک مکتوب میں ان
سے علمی خدمت کا نہایت اصرار کرتے تھا، فرما کر رہے ہیں کہ
”میں اس وقت ایک خود غرضی سے حاضر ہوا ہوں یہ فرماتے کہ ایم نظر بندی
میں کوئی علمی کام بھی آپ کے پیش نظر رہا؟ اس سوال کا جواب مجھے ضرور دیکھئے
ایک ضرورت خاص ہو، سیرۃ نبوی ملاحظہ سے گزری ہوگی، کہنے کیا خیال
قائم کیا؟ کیا امور قابل اصلاح ہیں؟“

باب

قیادت کا عجب اعتراف!

محمد علی کی ہمہ گیر خوبیوں اور دلفریب خصلتوں کے ساتھ ہر شخص کے دل میں عام اس کے کہ وہ مخالف ہو یا موافق ان کی رہنمائی کا اعتراف عزت و احترام کے ساتھ موجود تھا۔ ہر شخص ان کی زعمیہ خوبیوں کا معترف تھا اور خوب سمجھتا تھا کہ محمد علی کی ناخدائی کے بغیر بڑا پار نہیں لگ سکتا۔ اتنا عام اعتراف و احساس توخیر بعد کو ہوا، لیکن شروع شروع میں جب محمد علی نے علمی زندگی میں قدم رکھا اور کامیابی کے ذریعہ سے اپنے انکار و خیالات کی نشر و اشاعت شروع کی تو آٹھنے والی نظریں مار گئیں کہ یہ ”جوہر قابل“ آسمان سیاست و صحافت پر نہر و ماہ بن کر چکے گا چنانچہ اسی وقت سے محمد علی کا دفتر فریادیوں کا مرکز بن گیا تھا اور یہی نہیں کہ ”عوام کا لانعام“ اسے قبلہ آرزو سمجھ رہے ہوں بلکہ واقعہ یہ تھا کہ وہ خواص کی نظروں کا تارا تھا، عوام تک تو ابھی نہ اس کی رسائی ہوئی تھی نہ عوام اسے پہچانتے تھے، علی گڑھ کی بقاؤد ترقی کے معاملہ میں اور مسلم لیگ کے قیام و استحکام کے زمانہ میں مرحوم نواب قاری الملک نے اسے اپنا دست راست سمجھا، ”مدینہ یونیورسٹی“ کی تحریک ایک خاص علمی حلقہ سے جب فروغ پذیر ہوئی تو محمد علی کو ترتیب نفیاً وضع دستور اسل، اور تنویر اسکیم کے لئے ہر طرف سے بلایا جا رہا تھا، کبھی مولانا شبلی اپنے اس عزیز شاگرد کو اپنا مافی الضمیر سمجھا رہے ہیں اور کبھی اس کا نقطہ نظر سمجھ رہے ہیں، کبھی مولانا حمید الدین فراہی مرحوم ”ہمہ وقت حاضری“ کو مستعد ہیں، کبھی ڈاکٹر اقبال ”ہر طرح سے آمادہ“ ہیں اور

کا مرثیہ کا یہ جوان عمرو جوان سال ایڈیٹر، ان سب پیشوایان قوم کا مرکزِ آرزو بنا ہوا ہے۔ اس مقام پر مولانا حالی کا خط | مولانا حالی مرحوم کے ایک مکتوب بنام محمد علی کا حوالہ دینا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ محمد علی سے بزرگان قوم نے کیا توقعات وابستہ کر رکھی تھیں:

” غزنی دہلی

میں اب بہت کمزور ہو گیا ہوں لکھنا پڑھنا باطل چھوٹ گیا ہے، لیکن بعض ضرورتیں مجبور کر دیتی ہیں اور اپنی طاقت سے بڑھ کر کام کرنا پڑتا ہے میں اس وقت آپ کو اس معاملہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو اگر وہ مکمل طور پر میں مسلمانوں کے برخلاف درپیش ہے، امید ہے کہ آپ اہل واقعات پر روشنی ڈال کر بیچ کی مدد کریں گے، اور نہایت متانت، سنجیدگی اور تہذیب کے ساتھ اپنا فرض ادا کریں گے“

مولانا ابوالکلام کا خط | مولانا ابوالکلام صاحب آزاد جن کا ہاتھ ہمیشہ ”زمانہ کی نبض“ پر رہتا ہے اور وقوع واقعہ سے کہیں پیشتر مولانا اپنی مخصوص و منفرد بصیرت کی بنا پر آنے والے واقعہ کی حقیقت و ماہیت سے واقف ہو جاتا کرتے ہیں، وہ اپنے مکتوب بنام محمد علی میں اس ”وقت کے سب اہم مسئلہ“ یعنی مسلم لیگ پر اظہار خیال فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

”خدا نے آپ کے اندر ایک کامیاب اخبار نویس سے زیادہ طاقتیں رکھی ہیں ظلم ہے کہ اگر آپ اپنی قوتوں سے کام نہ لیں، میری تجویز تو یہ ہے کہ لوگ آپ کو جبراً پریٹینٹ بنالیں اور میں اس کو پوری تفصیل سے لکھنے والا ہوں مسلمانوں کی نئی سیاسی زندگی کی تشکیل کے لئے آپ کی غیبت میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ آپ سے زیادہ کوئی شخص موزوں نہیں“

اور ”بالآخر“ واقعات نے ثابت کر دیا کہ مولانا موصوف کی رائے کس قدر قرین صواب تھی۔
 یہ تو اس زمانے کے واقعات ہیں جب محمد علی لوگوں کی نظریں چڑھے ہوئے تھے لیکن
 اس عہد سے قطع نظر کر کے اس زمانہ پر نظر ڈالئے، جب بجاپور جیل سے رہائی کے بعد محمد علی
ہمہ گیر اختلاف | مخالفتوں اور سازشوں کے شکار رہو رہے تھے، ہندوستان میں تبلیغ و تنظیم
 اور شہمی و سنگٹھن کی کار فرمائی تھی، اور پھر اسے بھی چھوڑئے جب ابن سعود کی موافقت نے
 اخلاف میں نہیں غیر مرد لوز بنادیا تھا اور پھر مخالفت نے حضرات اہل حدیث کو ان کا دشمن کر دیا
 تھا یا پھر کتاب راجپال کے زمانہ پر نظر ڈالئے جب محمد علی نے اپنا جدید لیکن قابل قبول نظریہ پیش
 کر کے سائے اسلامی ہند کی مخالفت مول لے لی تھی، یا پھر سب آخریں جب وہ کانگریس کے
 مخالف ہوئے ہیں اور علی الاعلان انھوں نے اس کی مخالفت کی ہے اور اپنے دوستوں رفیقوں
 اور نہ معلوم کتنے ”تابع مہمل“ ساتھیوں کی مخالفت کا نشانہ بنے ہیں، اس تمام عہد انتشار و تشویش
 میں نہ صرف یہ کہ محمد علی کے پاس استقامت کو خدشہ نہیں ہوئی اور نہ صرف یہ کہ انھوں نے
 سائے مسلم پریس، ہندو پریس، اور اینگلو انڈین پریس کی مخالفت کا تنہا مقابلہ کیا، بلکہ یہ بھی
 ہوا کہ مخالفوں نے ان کو بدنام کرنے والوں نے، ان کی قبائلی قیادت کی دھیمیاں اڑانے والوں
 نے جب وقت پڑا تو محمد علی کی طرف ہی رجوع کیا، انھیں کے سائے قیادت میں پناہ ڈھونڈھی
 اور پائی، یہ تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ ہے، لیکن ہر واقعہ کہ ایسا ہوا، لوگوں نے ان کی
 مخالفت بھی کی، ان کی نیت پر حملے بھی کئے، ان کے وجود کو قوم و ملک کے لئے، باعث
 ہلاکت بھی سمجھا پھر بھی محمد علی کی تاخدائی سے وہ بے نیاز نہ ہو سکے۔

پنجاب کا ایک واقعہ | کتاب راجپال کے زمانہ میں زعماء پنجاب نے سب سے پہلے ”دیپ سنگھ
 مستغنی ہو جاؤ“ کا نعرہ لگایا تھا اور جب اس پر ”مسلم آؤٹ لک“ کے ایڈیٹر صاحب گرفتار ہوئے

تو سارا پنجاب جوش و مہمان سے سیرا ہو گیا، پنجاب کے ایک لیڈر نے اس آگ پر تیل کا کام دیا تھا، اتفاق ایسا پیش آیا کہ مسٹر اوگلو کی حکومت نے انہیں بھی گرفتار کر لیا، گرفتار ہوتے ہی سارا جوش قیادت کم ہو گیا اور ان کی جانب سے ان کے صاحبزادہ نے لاہور سے محمد علی کو ٹیلیفون دینا شروع کیا اور التجا کرنا شروع کی کہ آپ تشریف لائے اور ہم سب کی رہنمائی کیجئے اور ”والد محترم“ کی گرفتاری کے مسئلہ پر بھی اپنی رہنمائی سے مستفید کیجئے، حالانکہ اس استدعا سے پیشتر ”والد محترم“ اور ان کا ”اخبار“ سب کے سب مسلسل اور پیہم یہ پروپیگنڈا کر چکے تھے کہ محمد علی کا دماغ ذیابطس نے خراب کر دیا ہے۔

اسی طرح سائنس کمیشن کے زمانہ میں محمد علی سے اپنی مسلمہ مخالفت کے باوجود اس کی امداد سے احرار پنجاب بے نیاز نہ رہ سکے، سر شفیق نے لاہور میں بیٹھ کر جو احرار پنجاب کا مرکز بنے مسلم لیگ کے دو ٹکڑے کئے، لاہور ہی میں مسلم لیگ کا جلسہ طلب کیا، خود ہی اس کے صدر ہوئے، اور سائنس کمیشن سے تعاون کی تجویزیں پاس کرانیں، اور سوار ”اخبار بریاری“ کے اٹکا کوئی کچھ نہ کر سکا۔

لیکن محمد علی کے لغت میں ”بریاری“ اور ”علیحدگی“ کے الفاظ تھے ہی نہیں، اس لئے علی الاعلان سر شفیق کو چیلنج دیا، پنجاب کے دوسرے ”سروں“ کو دعوت مبارزت دی، اور پنجاب میں دورہ کیا اور سائنس کمیشن کے خلاف اپنے دلائل پیش کئے اور لوگوں سے منوائے، حالانکہ پنجاب کی ایک جماعت کی نظروں میں محمد علی اس زمانہ میں آبرو باحتہ تھا، مجنون تھا اور اس کا دل دماغ اسے جواب دے چکا تھا۔

دوسرا واقعہ | اسی طرح ایک اور اہم موقعہ پر بھی محمد علی سے استدعا کی گئی تھی، راجپال کے قاتل علم الدین شہید کو سیانوالی جیل میں پھانسی دی گئی اور وہیں اس کی تدفین بھی کر دی گئی

مسلمانان لاہور اسے لاہور میں لا کر باقاعدہ نماز جنازہ ادا کر کے جلوس کے ساتھ دفن کرنا چاہتے تھے پنجاب گورنمنٹ نے ہندو مسلم فساد کے اندیشہ کے سبب مسلمانوں کے مطالبات کو ٹھکرا دیا، مسلمانوں نے لاکھ کوششیں کیں مگر اس کی اجازت نہ ملی، اس انکار سے مسلمانوں میں بہت زیادہ ہجرت پیدا ہو گیا، اور وہ ہر طرح سے اپنے مطالبات پر یقینار و قربانی، سرفروشی و جاں نثاری کے لئے تیار ہو گئے، لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ اس گروہ عوام کی قیادت کون کرے؟ سوال بہت بچسپ تھا، حالانکہ لاہور تو لیڈروں کا مرکز تھا، بہر حال نظر انتخاب محمد علی پر پڑی اور ان سب مخالفوں نے جو اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے، اس کے دماغ و عقل پر حملے کرتے تھے، بلاپون و چرا اس کی رہنمائی پر صا د کر دیا، اسے مقتدا بنانا چاہا، اور خود مقتدی بننے پر آمادہ ہو گئے، چنانچہ ایک صاحب جو کبھی محمد علی کی مخالفت میں ”مہرواہ“ کی طرح روشن ہو چکے تھے اور جن کی رائے میں اب ”انقلاب“ ہو چکا ہے، محمد علی کو لکھتے ہیں۔

”یہاں حالات یحید نازک ہیں، تمام ذی اثر اور ذی حیثیت کارکنوں کی رائے ہے کہ اس باب میں وہ آپ کے مشوروں سے مستفید ہوں، آپ کی رائے کے مطابق پروگرام وضع کریں اور آپ کی قیادت و رہنمائی میں اس مہم کو اتمام تک پہنچائیں۔“

ایک اور واقعہ | اسی طرح الہ آباد کے ایک بیرسٹر صاحب جو ”ہارنبری روڈ“ کے ”گدے دار“ کوچوں پر بڑی گہری تنقیدیں فرمایا کرتے ہیں، گزشتہ تحریک کے آغاز کے وقت بیتاب ہو کے محمد علی کو لکھتے ہیں۔

”میں نے اس وقت تک وکالت نہیں چھوڑی اور ضمنی حصہ تحریک میں لڑ رہا ہوں مگر اگر آپ سامنے آئیں تو میں وکالت وغیرہ چھوڑ کر کھلم کھلا میدان میں آنے کو

تیار ہوں“

جواہر لال کا اعتراف | اسی طرح گزشتہ تحریک کے موقع پر جب محمد علی نے کانگریس کے جلسوں اور مظاہروں میں مسلمانوں کو شریک ہونے سے روکا تو پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک بیان میں اپنے تاثرات قلب کا ان الفاظ میں اظہار کیا۔

”میں اس بہادر لیڈر کا بہت زیادہ احترام کرتا ہوں اس نے آزادی کی جدوجہد میں جو قربانیاں کی ہیں اور جو کام سرانجام دیا ہے وہ تاریخِ آزادی میں جلی حروف سے لکھا جائے گا، اور سب کے نمایاں جگہ پائے گا“

گاندھی جی کا اعتراف | اسی طرح گاندھی جی نے جب قانونِ نمک کی خلاف ورزی کا ارادہ کیا ہے تو ان کے ایک معتقد نے ننگ انڈیا میں ان سے استفسار کیا تھا کہ کیا حقیقت علی برادران کی شرکت سے بے نیازی آپ مفید سمجھتے ہیں؟ اس کا انھوں نے جواب دیا کہ نہیں، علی برادران اگر آج ہم سے اشتراک عمل کر سکیں تو ہماری تحریک میں کہیں زیادہ استحکام پیدا ہو جائے، اور شوکت صاحب کے متعلق تو متعدد بار انھوں نے حسرت کی کہ کاش وہ انھیں اپنی ”جیب سے نہ نکال بھینکتے۔“

یہ بیان تو تھا ان لوگوں کا جو سرکار پرست نہیں تھے، بلکہ کسی نہ کسی زمانہ میں محمد علی کے رفیق و شریک کا رہ چکے تھے، لیکن ایک دفعہ سرکاری حلقہ پر ایک نگاہ ڈال جائے، تو وہاں بھی محمد علی کی ہمہ گیر شخصیت سب پر اثر انداز ہو رہی ہوگی وہاں بھی اس کی خصوصیتوں اور صلاحیتوں کا اعتراف ہو رہا ہوگا، کوئی سب جج صاحب اپنے چیف جسٹس کی فرقہ واری کا تنقید محمد علی کے حضور میں پیش کر رہے ہوں گے اور کوئی کلکٹر صاحب اپنی عقیدت و نیاز مندی کے پھول -

ایک ہوم ممبر کا بیان | محمد علی جب گول میز کانفرنس کے ممبر مقرر ہوئے تو ایک صوبہ کے ہوم ممبر صاحب محمد علی کو بایں الفاظ مبارکباد دیتے ہیں۔

”آپ کی ذات کے ساتھ مسلم قوم کی توقعات ہمیشہ وابستہ رہی ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ اس اہم اجتماع کے موقع پر بھی آپ کی قوم آپ جیسی عظیم اور با اثر شخصیت کی راہ نمائی سے محروم نہ رہے گی“

اسی طرح ایک اور اہم موقع پر وہی ”ہوم ممبر صاحب“ محمد علی کو مخاطب کرتے ہیں،

”لارڈ ارون کے پاس ایک وفد لیجائیگی بھی ضرورت ہو یہ کام بدون مشورہ کے طے ہونا مشکل ہو، اس لئے، گزارش ہے کہ جس طرح ممکن ہو، تشریف لائے“

ایک ممبر اسمبلی کی فرمائش | اسمبلی کے ایک مشہور ممبر صاحب انسداد توہین انبیاء و بزرگان دین کے متعلق اسمبلی میں کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں، لیکن چاہتے یہ ہیں کہ سوالات محمد علی بنائیں۔

”میں اسمبلی کے آئندہ سیشن میں اس بارہ میں چند سوالات کرنا چاہتا ہوں جو جو سوالات کئے جانے مناسب تصور فرمائیں ان کا مسوہ بنا کر میرے پاس جلد سے جلد ارسال فرمادیں تاکہ میں ان کو بھیج دوں“

ایک دوست کا خط | یہ تو تھا عرب قیادت اور اعترافِ یادتِ عام و خاص طبقوں پر، لیکن وہ لوگ جو ان کے دوست تھے، بے تکلف تھے، ان کے اسرار و رموز سے واقف تھے وہ بھی اور وہ بھی جو گروہ عوام میں شامل تھے، اور اپنی فہم سیاست کا کوئی ثبوت نہ پیش کر سکے تھے، محمد علی پر فدا تھے، اور فدا ہونے کو ہر وقت تیار، دونوں قسموں سے ایک ایک مثال۔

قاسم حسن صاحب مرحوم تعلقدار پٹنہ حیدر آباد، وہ تھے جنہوں نے تحریک خلافت کے شروع ہوتے ہی محمد علی کے ارشاد پر ڈپٹی کلکٹری پر لٹ ماری اور حیدر آباد میں مقیم ہو گئے۔

اور پھر رفتہ رفتہ وہاں خاصی ترقی کی، وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:
 ”تمہاری صحت کیسی ہو؟ خدا عظیم ہے تم مجھے اتنے عزیز ہو کہ اپنی صحت
 قربان کرنے کو تیار ہوں۔“

دوسری مثال | اب دوسری مثال گروہ عوام سے لیجئے، کوئی شخص ”میر“ نامی تھا
 پڑھائی کچھ یوں ہی سی ہوئی تھی، معمولی ملازمت کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا، لیکن محمد علی کا
 زار اور ہمدرد کا قدردان تھا، وہ اپنے بستر غلات پر بلکہ بستر مرگ پر دراز تھا کہ ہمدرد بندھنے کی
 اطلاع پہنچی، اس بیماری کے عالم میں اس خبر سے وہ کافی متاثر ہوا، اور اسی حالت
 میں اس نے محمد علی کو خط لکھا، وہ خط ابھی ڈاک میں ڈالا بھی نہیں گیا تھا کہ مریض کا انتقال ہو گیا،
 اس سائے واقعہ کی تفصیل مرحوم کے والد نے اپنے ٹوٹے پھوٹے انداز بیان میں مولنا کو لکھی
 تھی جس سے یہ اقتباس اپنے الفاظ میں لیا گیا، وہ خط اپنی بے لکی کے باوجود وہ رعبہ اثر انگیز
 ہے۔

ایک اخبار کا خراج تحسین | ایک ہفتہ دار غیر مسلم اخبار روہی ہجو آخر زمانہ میں مولنا کا ایک
 بد تہذیب دشمن تھا، ہمدرد جب بند ہوا ہر تو ساری مخالفت کے باوجود یہ الفاظ اس کی زبان
 قلم پر آ ہی گئے۔

مولنا محمد علی کا اخبار ہمدرد روپیہ کی کمی کے باعث آخری لمحوں پر ہے، ہم
 تمام ہندوستان کے رہنے والوں کے لئے شرم کا باعث ہو، مولنا محمد علی
 اگر حریت آزادی کی راہ اختیار نہ کرتے تو بلاشبہ آج وہ داسرائے کی انتظامیہ
 کونسل کے ممبر یا کسی صوبہ کے وزیر ہوتے اور اگر یہی محمد علی کسی ایسے ملک
 میں پیدا ہوتے جو آزادی و حریت سے لذت آٹا تھا تو آج محمد علی کی

پوزیشن مصر کے زاعلول، جرمنی کے ہیڈنبرگ، سے کم نہ تھی۔
 پریم چند کا خط | محمد علی کی عقیدت کو صرف مسلمانوں ہی کے دل نہیں لبرزیتے بلکہ سمجھدار اور
 معاملہ فہم ہندو بھی ان کے ویسے ہی قدردان، اور ان کے اعزاز و احترام میں ٹیسے ہی پیش
 پیش تھے جیسے مسلمان، اس سلسلہ میں ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار، منشی پریم چند کا ایک
 خط دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، وہ فرماتے ہیں:-

”اگر آپ کے خیالات کی مزید اشاعت کے لئے میں یہاں سے ایک ہفتہ وار ہند
 مہر دے، کے نام سے شائع کروں تو آپ اسے پسند فرمائیں گے؟
 ہاں تاکہ اندھی کے بعد میرے دل میں آپ ہی کی عزت ہو، اور اس کا اظہار
 کر چکا ہوں۔“

سوویٹ روس کی دعوت | یہ تو تھی ہندوستان کی قدر افزائی اور سیادت و قیادت کی تائید
 تعریف، لیکن اس محبوب شخصیت کے اثرات باہر بھی پہنچ چکے تھے، اور شخص اسیر دام محبت ہو رہا
 تھا، چنانچہ سوویٹ روس کی دسویں سال گرہ کے موقع پر حسب ذیل بحری پیام محمد علی کے پاس آیا:
 ”روس اور دیگر ممالک کے مابین تعلقات بدینیت کو ترقی دینے والی لہجہ آپ
 کو روس اگر سوویٹ کی دسویں سال گرہ میں شریک ہونے کی دعوت دیتی ہے، انجمن
 مذکورہ، ۳۰ اکتوبر کو ماسکو میں بطور نمائندہ کے آپ کا خیر مقدم کرے گی، اور اگر آپ
 آپ پسند کریں گے تو وہ آپ کے قیام ماسکو کے تمام اخراجات بھی ادا کرے گی
 آپ اسے سرکاری دعوت تصور کریں، توقع ہے کہ آپ ضرور تشریف لائیں گے۔“

علی اور محمد علی | ایک طرف تو محمد علی کی قدردانی اور عزت افزائی، اعتراف سیادت اور
 رعب قیادت کا یہ عالم تھا، دوسری طرف محمد علی تھا، اور اس کے رفقا کے دل کو کچھ کے

ہینے والے نفرتی، اس کی ہر تحریک کی مخالفت کی گئی، اس کے ہر نظریہ سے شد و مد کی بیزاری کا اظہار کیا گیا، اس کے ہر قدم کو ملک و ملت کے لئے ہلاکت آفریں کہا گیا، اس کے خلاف اس شد و مد، اس زور و شور اور اس بلند آہنگی اور تسلسل سے کیا گیا کہ یقیناً ہندوستان میں اس سے زیادہ کسی کے خلاف اتنا متفقہ پروپیگنڈا کبھی نہیں ہوا، اور نہ شاید ہو، قول و عمل کے اس دلچسپ تضاد و تخالف کو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ نے اپنے مکتوب بنام محمد علی میں خوب واضح فرمایا ہے۔

مکتوب ماجد | ”جی میں آتا ہے کہ ایک مضمون ”علی اور محمد علی“ کے عنوان سے لکھوں جس میں یہ دکھاؤں کہ وہی ابتلا وہی خانہ جنگیاں، وہی اندرونی شورش وہی قدم قدم پر ناکامیاں جو علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنے دور خلافت میں پیش آئیں ٹھیک انھیں کا اعادہ ایک چھوٹے پیمانہ پر آج محمد علی کے لئے ہو رہا ہے، علی مرتضیٰ کے فضائل و کمالات سے فرداً فرداً کسی صاحب کو بھی انکار نہ تھا، امیر معاویہؓ اور عمر بن عاصؓ تک اپنے کو ان سے بہتر نہیں کہتے تھے، ان کے فضائل کا برابر اعتراف کرتے تھے، پھر بھی علما ان کی ہر رائے ہر تحریک، ہر ارادہ کی مخالفت ہی ہوتی رہتی تھی ٹھیک یہی صورت آج محمد علی کے لئے بھی ہے۔“

مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ کی اس رائے گرامی کی صداقت میں کون شبہ کر سکتا ہے، کاش مولانا صاحب وعدہ اس عنوان پر مقالہ سپر قلم فرمایا، اگر اس مسودہ کی کتابت تک مولانا نے وہ مقالہ تحریر فرمایا، تو اتنا رائد اس کتاب کو اس سے زینت و بیجا لگی ورنہ پھر آئندہ ایڈیشن میں۔

باب

تدبر

ہندوستان کے زعمار کی نہایت آسانی کے ساتھ دوسریں کی جاسکتی ہیں، ایک تو وہ جو بس لیڈر ہو گئے اور دوسرے وہ افراد جنہوں نے اپنے ذہنی، دماغی خصوصیات، اخلاقی صفات اور عملی خدمات کے اعتبار سے ملک و قوم کے دل میں اپنی جگہ پیدا کی ہے، محمد علی کا شمار اسی دوسری قسم سے تھا، انہوں نے اپنے آپ کو کسی کا مقلد نہیں بنایا، نہ گرمی بازار دیکھ کر وہ کسی تحریک میں شریک ہوئے، بلکہ جس تحریک میں وہ شریک ہوئے اس میں گرمی بازار پیدا محمد علی کی ذات سے ہوئی، وہ اپنے دل و دماغ کے مالک تھے، اس لئے وقت کے ہر ”اہم“ اور ”غیر اہم“ مسئلہ پر وہ خود رائے قائم کرتے تھے اور اس کے بعد دوسروں کے سامنے اسے استقلال و ثبات غم کے ساتھ پیش کرتے تھے، انہوں نے کبھی اپنے ضمیر و بصیرت کے خلاف رائے عامہ کی پروا نہیں کی، نہ رائے عامہ سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنی رائے میں کبھی تبدیلی کی، بلکہ ہمیشہ وہ اس کے کوشاں رہے کہ رائے عامہ میں وہ خود تبدیلی کریں اور رائے عامہ کو اپنا ہم خیال بنائیں، اس سلسلہ میں ان کو جتنی مخالفتوں اور شور و رشوں کا مقابلہ کرنا پڑا وہ محمد علی ہی کا دل تھا کہ اس نے برداشت کیں در نہ اور کوئی ہوتا تو ایسے نازک مواقع پر گوشہ عافیت تلاش کرنا اور عزت گزریں ہو جانا، یا اپنے منہ ”چھٹا ہوا کارٹوس“ کہنا، اور ایک تماشائی کی حیثیت سے فضا کے درست ہونے کا انتظار کرتا، چنانچہ محمد علی اپنے ایک خط میں جو پنجاب کے ایک خط | ایک لیڈر کو لکھا گیا تھا لکھتے ہیں کہ:

”میں نے نہیں دیکھا کہ تم نے ہمت و جرأت کے ساتھ کبھی بھی اس رائے سے اختلاف کیا ہو جو رائے عامہ سمجھی جاتی ہے، حالانکہ ایک مصلح کو یہ بھی کبھی کرنا پڑتا ہے۔“

محمد علی نے ایک ”مصلح“ کی حیثیت سے کبھی کبھی نہیں، اکثر دبشترایا کیا، اور کامیاب بھی ہوئے۔ کتاب راجپال | جسٹس دیپ سنگھ نے اپریل ستمبر میں اپنی مشہور فیصلہ میں جب راجپال کو بری کر دیا تو پنجاب میں ایک آگ لگ گئی ہر شخص اس سے متاثر تھا، اور دیپ سنگھ کی مذمت میں مصروف، چونکہ پنجاب ہی سے وہ کتاب شائع ہوئی تھی اور پنجاب ہائی کورٹ ہی سے وہ بری کیا گیا تھا، اس لئے قدرۃ پنجاب والے بہت برہم ہوئے، چنانچہ سب سے پہلے پنجاب کے ”مسلم آؤٹ لک“ نے اس فیصلہ پر شدید نکتہ چینی کی، اور دیپ سنگھ سے مطالبہ کیا کہ فوراً ”مستعفی ہو جاؤ“، گورنمنٹ پنجاب نے توہین عدالت کے الزام میں مدیر مسلم آؤٹ لک پر مقدمہ چلایا اور مدیر ظاہر، ناشر سب کو سزا دیدی، اس فیصلہ نے اور زیادہ مسلمانوں میں اشتعال پیدا کیا اب پنجاب کے اخبارات کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے اخبارات بھی اس مطالبہ کے ہمدرد ہو گئے اور یہی مطالبہ کرنے لگے کہ دیپ سنگھ مستعفی ہو جاؤ چنانچہ پنجاب سے باہر دوسرا اخبار مدینہ تھا جو اس زو میں آیا، اب نوبت اخبارات ہی پر نہیں بلکہ اشخاص پر بھی پہنچی اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری غازی عبدالرحمن اور بعض دوسرے احرار پنجاب بھی مایوس ہوئے، اور آخر سب اب بھی ہوئے، محمد علی نے اس نازک موقع پر رائے عامہ کی مخالفت کی اور اعلان کیا کہ ”تصور قاضی کا نہیں قانون کا ہے“ اس رائے کا ظاہر ہونا تھا کہ سارا اسلامی ہند آتش زیر پا کر دیا گیا کہ محمد علی اتنے مسلم آزار، ہندو پرست اور گورنمنٹ دوست ہیں کہ توہین رسول اکرم پر بھی اپنی ذہنیت سے باز نہیں آتے، بات چلتی ہوئی تھی عوام کے دل خوف و غصہ سے بھر گئے تھے، اور بعض حریف تو خار کھائے محمد علی پر

بیٹھے ہوئے تھے، ان کی اس رائے کے خلاف خوب پروپیگنڈہ کیا گیا، اور جتنے اتہامات لگائے جاسکتے تھے، سب لگائے گئے، لیکن محمد علی ٹس سے مس نہیں ہوئے، انھوں نے ان تمام مخالفتوں اور شور و شعلوں کا جواب ہمتی کے ساتھ مقابلہ کیا، اور یہی کہتے رہے کہ قصور قانون کا ہے قاضی کا نہیں اس لئے کہ قانون میں حقیقتہً اتنی ہچک موجود ہے کہ راجپال سا مجرم چھوٹ سکتا ہے۔ لہذا ہماری کوششوں کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہم ایک جدید قانون کا اضافہ کرائیں نہ کہ دلیپ سنگھ کو مستعفی ہونے پر مجبور کریں، آج دلیپ سنگھ کو تم مستعفی ہونے پر مجبور بھی کر دو لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ کل ان کی جگہ پر جو دوسرا جج آئے گا وہ بھی فیصلہ نہیں دے گا، جبکہ اس کی گنجائش قانون میں موجود ہے۔ لہذا اگر حقیقتہً تمھارے قلوب تو ہیں رسول سے متاثر ہیں تو قانون بدلواؤ تاکہ ہمیشہ کے لئے ایسی گندہ دہلیوں کا استیصال ہو جائے۔

شروع شروع میں محمد علی کی اس رائے کی سخت مخالفت ہوئی اور ان کے بڑے بڑے رفقا سخت برہم ہوئے اور نہایت دل شکن خطوط لکھے لیکن آخر میں سب نے محمد علی کی بارگاہِ بیادیت میں گھٹنے ٹیکے، سب نے اس کے نظریہ سے اتفاق کیا اور سب نے قانون بنوانے پر زور دیا۔

ہنگامہ نجد و حجاز | اسی طرح آویزش نجد و حجاز کے زمانہ میں اسلامی ہندوستان و وکٹریوں میں تقسیم ہو گیا، ایک وہ جماعت تھی جو کہتی تھی ابن سعود قابلِ دار ہے اور دوسرا وہ گروہ تھا جو آئندہ حمایت کا سزاوار سمجھتا تھا لیکن محمد علی نے اس فضاے عام کو بدلا اور کہا مخالفت ہر وقت ہو سکتی ہے لیکن اس موقع پر سلطان کی حمایت کر کے حجاز کو اور اسلامی مفاد کو جو فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے وہ پھر نہیں حاصل ہو سکتا، اور واقعات بتاتے ہیں کہ اگر ایک مشہور ”ٹولی“ نے ابن سعود کو جادہ حق سے گمراہ کرنے کی سعی سلسل نہ کی ہوتی تو بلاشبہ آج حجاز پر موثر عالم اسلام کا پرچم ہمارا ہوتا اور ابن سعود بجائے ”ملک الحجاز و نجد و ملحقا تھا“ کے تمام عالم اسلام کے قلوب کا حکمران ہوتا۔

قتل مرتد | قتل مرتد کے مسئلہ میں بھی محمد علی نے نہایت بصیرت اور تفقہ و تدبیر کے ساتھ صرف عوام سی کی نہیں بلکہ علماء کرام کی مخالفت کی، چنانچہ اپنے ایک خط میں جو قیصر کے ایک مہم خواہ کو لکھا گیا تھا، لکھتے ہیں:

”مولانا عبدالباری صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب کو لکھ رہا ہوں کہ بجائے علماء کرام کی طرح سب و شتم کے اور کفر کے تمام احادیث کو جمع کیجئے، اور سب فقہاء کے استدلال کو بھی پیش کیجئے، قرآن سے پہلے رکھئے پھر تفاسیر، پھر احادیث پھر فقہاء کی راؤں کو، پھر بحث فرمائیجئے، انشاء اللہ یہی رائے صحیح نکلے گی کہ قتل مرتد لاکراہ فی الدین کے منافی اور حرام ہے، البتہ قتل مجارب جائز اور با اوقات فرض ہے۔“

مسئلہ اقلیت | ہندوستانی سیاسیات میں سب سے زیادہ مختلف فیہ مسئلہ اقلیتوں کا ہے، اکثریت ابھی تک اس پر آمادہ نہیں ہوئی کہ وہ اقلیتوں کی حفاظت و صیانت حقوق کا کوئی تسلی بخش فیصلہ کر سکے لیکن محمد علی نے اس مسئلہ پر بھی اپنے غور و فکر سے ایک نئی راہ نکالی، ایک تو انھوں نے انتخابات کے لئے ہر فرقہ کے افراد کو جو امیدوار ہوں اس کا پابند بنانا چاہا کہ وہ اس وقت تک منتخب نہ سمجھے جائیں جب تک دوسری ملت کی پہ رائے نہ حاصل کر لیں اس طرح سے گویا محمد علی نے اس کا فیصلہ کر دیا کہ کسی مجلس قانون ساز میں کوئی ایسا شخص جا ہی نہیں سکتا ہے جو ہر دو اقوام ہند کا معتد علیہ نہ ہو، اس کے معنی یہ ہوتے کہ ہمیشہ ایسے افراد منتخب ہوں گے جو صحیح سیاسی ذہنیت رکھتے ہوں گے، اور ایسے لوگ جنھوں نے فرقہ بندی کی آگ کو ہوا دی ہے، ان کو ہمیشہ ناکام و نامراد رکھنا پڑے گا۔

دوسرا طریقہ | اس قابل اطمینان تجویز کے بعد انھوں نے اقلیتوں کی حفاظت کا ایک نہایت

منفید طریقہ پیش کیا، یعنی ہندوستان کے کسی ایک مقام پر مسلمان مجبوراً اور مجتمعاً آباد نہیں ہیں بلکہ تمام صوبوں میں پھیلے ہوئے ہیں، کسی صوبہ میں وہ نہ فیصدی ہیں کسی میں ۱۰ فیصدی ہیں اور کسی صوبہ میں وہ ۹۰ فیصدی ہیں اور کسی صوبہ میں ۹۹ فیصدی یعنی بعض صوبوں میں اقلیت کی اکثریت ہو اور اکثریت اکثریت کی، تو اگر ہندوستان میں حقیقت صلح و سلام کی قضا پیدا کرنا ہے تو بہترین لائحہ عمل یہ ہے: ”ایک ہی ملت ہر جگہ اقلیت میں نہ رہے، کہیں ایک کی اقلیت ہو تو کہیں دوسری کی۔“

یہ صورت ایسی ہو کہ ہر صاحب اکثریت مجلس قانون ساز مجبوراً اور نظرۃ دوسری اقلیت کا لحاظ کرے گی اور اگر نہیں کرے گی تو دوسرے صوبوں میں اس کی ہم قوم اقلیت کے ساتھ وہی سلوک ہو گا جو وہ دوسری قوم کی اقلیت کے ساتھ کر رہی ہے۔

محمد علی کی یہ اسکیم اگر عمل پذیر ہو سکتی تو یقیناً ایک بہترین ضمانت اور دستاویز صلح کا کام دے سکتی تھی لیکن افسوس ہے کہ مخصوص مصلح کی بنا پر کانگریس اسے تسلیم کر سکی اور نہ مسلم کانفرنس اور خلافت کانفرنس نے اسے مطالبہ کی صورت میں پیش کیا۔

پہلے کیا؟ | ستمبر ۱۹۲۰ء میں ایک بار پھر استراداد نہرو رپورٹ کے بعد اسلامی ہند میں یہ سوال بڑے زور شور سے گشت لگا تا رہا کہ ”تم پہلے کیا ہو، ہندوستانی یا مسلمان؟“ جن میں مذہبیت کے اثرات زیادہ تھے انھوں نے اعلان کرنا شروع کیا کہ ہم پہلے مسلمان ہیں پھر ہندوستانی۔ جو لوگ کانگریس کی وطنی تحریک سے دلچسپی دہر دی رکھتے تھے، ان میں سے اکثر نے کہا ”ہم پہلے ہندوستانی ہیں پھر مسلمان“ بعض مصلحت شناس حضرات ایسے تھے کہ خاموش رہے، لیکن محمد علی نہ خاموش رہا اور نہ اس نے مقدم الذکر دونوں جماعتوں کی ہم آہنگی کی، اس نے کہا ”میں مذہبی معاملات میں اول داخل مسلمان ہوں اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں، اور ہندوستانی

معاملات میں اول و آخر ہندوستانی ہوں اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ۛۛ
بلاشبہ یہ الفاظ اسی شخص کی زبان حق تر جان سے نکل سکتے تھے جس کا عمل بھی قول سے
ہم آہنگ ہو جس کا دل ہندوستان کے معاملات پر بھی سب سے زیادہ متاثر ہو جاتا ہو، اور جس کی
روح عالم اسلام کے حادثات پر بھی تڑپنے لگتی ہو، اور کم از کم ہندوستان میں ایسا جامع الصفات
صرف محمد علی تھا اور کوئی نہیں اس نے جو کچھ کہا اسے کر کے دکھایا، اسے ہندوستان سے عشق تھا
اس لئے ہندوستان کے لئے اس نے ہر مصیبت اور ہر تکلیف کا بخندہ پیشانی متقابلہ کیا، اسے عالم
اسلام سے الفت تھی، اس لئے دنیا سے اسلام کے ہر حادثہ پر محمد علی کے تمام قوائے عمل میں
ایک ہر دوڑ دوڑ گئی۔

باب ۹

کردار

ہندوستان میں محمد علی سے زیادہ کوئی جنگ جو غنیمت کل سے پیدا ہوا ہوگا جب کہی انھوں نے یہ دیکھا کہ باطل حق سے ٹکرا رہا ہے تو انھوں نے ذاتی تعلقات، خاندانی تعلقات اور سیاسی تعلقات کی مطلق پروا نہیں کی اور شیر بے تیا م بن کر ہمیشہ وہ باطل کے سر پر صاعقہ جاسوزین کر چکے تھے، ان کی زندگی تمام تر ”الحب للہ، والبیض للہ“ کا ایک مکمل نمونہ تھی۔ لیکن بائیں ہندو اسلامی اخلاق و محبت کا سرچشمہ بھی ان کے سینہ میں لہریں لے رہا تھا، گودہ مخالفت سے کبھی باز نہیں آئے لیکن دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ اپنی زبردست اور مسلمہ مخالفت کے باوجود اپنے بڑے سے بڑے مخالف کی بھی موقع پر انھوں نے ہمدردی کی، نگہاری کی اور حمایت کی۔

خواجہ حسن نظامی کا واقعہ | خواجہ حسن نظامی صاحب اور محمد علی کی مشہور عالم مخالفت اور سخت ترین مخالفت سے ایک زمانہ واقف ہو، محمد علی نے ان کی سیاسی اور تبلیغی زندگی پر سخت سے سخت نکتہ چینی کی لیکن جب خواجہ صاحب پر ایک وقت ایسا پڑا کہ اپنے بیگانے ہو گئے، خواجہ صاحب کے رنج اور اثر کے باوجود حکام اور گورنمنٹ نے نظریں پھیر لیں تو وہ محمد علی ہی تھا، جو خواجہ صاحب کلمائی بن کر میدان میں آیا، اجمال کی تفصیل یوں ہے۔

خواجہ حسن نظامی صاحب اپنے موٹر پر شام کو دہلی سے نظام الدین واپس آ رہے تھے۔ جب اپنے مکان کے پاس پہنچے تو کسی شخص نے مسلسل پتول سے فیر کرنا شروع کئے، حسن آفاق

سے خواجہ صاحب تونچ گئے، لیکن ان کے خسر صادق صاحب یا ”بھائی سنولیا“ پر گولیاں پڑیں اور بالآخر وہ انتقال فرما گئے۔

محمد علی اس وقوعہ کے روزنامات دیوبند کے سلسلہ میں دیوبند تشریف رکھتے تھے، وہیں انھوں نے اس واقعہ کو سنا اور فوراً ایک تاریخ خواجہ صاحب کو دیا جس میں اپنی عمیق قلبی ہمدردی کا اظہار کیا، دوسرے روز واپسی پر وہ بنفس نفیس خواجہ صاحب کے دولتکدہ پر گئے اور ان سے زبانی تعزیت کی رسم ادا کی، اور انھیں تسکین و تسلی دی خواجہ حسن نظامی صاحب بھی ان کی اس روش سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنے روزنامہ میں ”مسٹر“ محمد علی کو ”مولانا“ لکھ کر انھوں نے اپنی دلی شکرگزاری کا اظہار کیا۔

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا ہے بلکہ آگے بڑھتا ہے، خواجہ صاحب نے اس معاملہ کی تفتیش کرانی چاہی اور جس شخص پر شبہ تھا اسے گرفتار کر کے قانونی کارروائی کرانی چاہی، لیکن یہ معلوم کیوں پولیس نے تعافل اور تساہل سے کام لیا شرمع کیا، خواجہ صاحب پولیس کی اس روش سے سخت ملول اور رنجیدہ تھے، انھیں اپنی جان کا بجا طور سے خطرہ نظر آ رہا تھا، لیکن پولیس تھی کہ وہ کوئی اقدام کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتی تھی۔

اس حالت میں محمد علی اگرچہ اس وقت تک بچے ”تو جینجر“ تھے، لیکن پھر بھی انھوں نے ٹیلیفون پر گھنٹوں دہلی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو سرزنش کی اور اس معاملہ میں پولیس کے تعافل کی سخت نکایت کی اور اس کے اس طرز عمل سے جو عواقب و نتائج پیدا ہونے والے تھے ان سے اسے آگاہ کیا، محمد علی کی اس بروقت تنبیہ سے پھر پولیس میں کچھ عرصہ کے لئے ایک حرکت پیدا ہو گئی۔

دوسرا واقعہ | اسی طرح سوامی شرودھانند کو دسمبر ۱۹۲۷ء میں جب ایک مسلمان نے قتل کر ڈالا

تو سائے ہندو پریس نے اس فعل کو شخصی نہیں بلکہ کسی گہری سازش کا نتیجہ بتایا اور اس گہری سازش کا اصلی کارکن سوامی جی کے مشہور حریف خواجہ حسن نظامی صاحب سے بڑھ کر اور کون ثابت کیا جاسکتا تھا چنانچہ تمام ہندو اخبارات نے خواجہ حسن نظامی صاحب پر طح طح کی نکتہ آفرینیاں شروع کر دیں یہ وقت بھی بہت نازک تھا اور چونکہ سوامی جی کا زخم ہندوؤں کے دلوں پر ابھی تازہ تھا اس لئے پورا اندیشہ تھا کہ کہیں خواجہ صاحب پر بھی اس قسم کی کوئی ”خفیہ گہری سازش“ نہ شروع ہو جائے اس وقت بھی محمد علی کا ہمدرد تھا جس نے خواجہ صاحب کی حمایت کی اور کہا کہ یہ محض ظنِ ظاہر ہے کہ خواجہ صاحب کو اس قسم کی مفصلانہ تحریکوں میں شریک سمجھا جائے گا۔

ڈاکٹر کچلو کا ایک واقعہ | سترے کے اندور کے مشہور فساد کے بعد مسلمان جس طرح بیدردی سے ہدفِ نبض و حسد بنائے جا رہے تھے، ایک دنیا کو اس کا علم ہے، دہلی کے مشہور بیرسٹر مسٹر آصف علی ایک گرانقدر معاوضہ پر مسلمانانِ دہلی کی طرف سے اندور بھیجے گئے تھے یا شاید بھیجے جانے کی تجویز تھی اور معاملات مٹے، ہوئے تھے، اسی زمانہ میں ڈاکٹر کچلو صاحب مسلمان ملزمین کی پیروی اور صفائی کے لئے اندور تشریف لے گئے، ڈاکٹر صاحب کے جانے سے مسلمانوں کو بڑی تسکین ہوئی تھی، ڈاکٹر صاحب نے مانوڈین و ملزمین سے ملاقات کی، بیانات سنے، شاہدوں پر جرح کی اور مقدمہ کی تیاری و ترتیب میں مشغول ہو گئے کہ دفعۃً و بغتۃً اندور کے ”ہمارا جہ ہلکا“ کا یہ حکم ڈاکٹر کچلو کو پہنچا کہ چوبیس گھنٹہ کے اندر اندور خالی کر دیجئے، اب ڈاکٹر صاحب نے چاہا کہ اندور سے کل کر حدودِ ریزیڈنسی میں قیام فرما ہو کر اپنا کام جاری رکھیں، مگر یہاں بھی انھیں قیام کی اجازت نہیں ملی، مجبوراً وہ دہلی تشریف لائے اور محمد علی کو اپنی داستانِ درد ستانی، محمد علی اگرچہ تعلقات کی زنجیروں سے وابستہ تھے، یعنی اندور سے ان کے خاندانی تعلقات تھو اور پھر اسی زمانہ میں ان کے برادرِ نسبتی مسٹر معظم علی بیرسٹرا لائے سابق پرنس ڈھاکہ لا کالج، اس

”ٹریبونل“ کے ایک رکن تھے جو ماخوذین کے انفصال مقدمات کے لئے بیٹھا تھا، لیکن ان تمام تعلقات کی انھوں نے کوئی پروا نہیں کی اور اسی وقت ایک ضمیمہ ہمدرد کا شائع کیا، اور اس میں ڈاکٹر کچلو کی حمایت کی، اور حکومت اندور کی حکمت عملی اور روش پر سخت نکتہ چینی کی، حالانکہ یہی محمد علی اس زمانہ میں بھی ڈاکٹر کچلو کے سخت ترین مخالف تھے اور ڈاکٹر صاحب کی تحریک تنظیم سے سخت بیزار، اور ان کی روش کو ہندوستان کے لئے سخت تباہ کن سمجھنے والے لیکن جب انھوں نے یہ دیکھا کہ حق ڈاکٹر کچلو کے ساتھ ہے تو اپنی گذشتہ اور موجودہ اور آئندہ کسی مخالفت کی پروا نہیں کی، ان کی حمایت کی اور حکومت اندور کی سخت مذمت۔

ڈاکٹر عالم کا ایک اقعہ | ڈاکٹر محمد عالم اور ان کی پارٹی سے صحیح معنوں میں ہم آہنگی تو محمد علی کو شاید کبھی بھی نہیں ہوئی، لیکن نہرو رپورٹ کے بعد سے اختلاف بہت زیادہ بڑھ گیا تھا، اور بعض مرتبہ تو ناگوار صورتیں بھی پیش آ جاتی تھیں۔

ایک بار ڈاکٹر عالم لاہور سے کسی اور جگہ ایک تقریب کے سلسلہ میں مح اپنے اہل وعیال کے موٹر میں تشریف لے جا رہے تھے، سو، اتفاق کہ موٹر راستہ میں الٹ گئی، ڈاکٹر صاحب، ان کی اہلیہ اور ان کے صاحبزادہ سخت زخمی ہوئے اور ان کے صاحبزادہ کے تالیق صاحب تو اتنے زخمی ہوئے کہ جاں بر نہ ہو سکے، اس حادثہ فاجعہ کا علم جب محمد علی کو ہوا، تو وہ بیتاب ہو گئے اور اسی روز مغرب کی نماز کے بعد ڈاکٹر عالم اور ان کے متعلقین کے لئے جامع مسجد میں خود دعا مانگی اور حاضرین سے آمین کہلوائی۔

ایک اور دعا | پنجاب کے ایک دوسرے مشہور لیڈر کے لئے بھی محمد علی نے اپنے مجلس میں دعائیں مانگی تھیں کہ ان کی اصلاح حال ہو سکے، چنانچہ محمد علی اپنے ایک مکتوب میں انھیں لکھتے ہیں:-

”میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے مولانا ابوالفتح رحمہ اللہ کے لئے اور تمہارے لئے اور ایڈیٹر سیاست کے لئے جیل خانہ میں اکثر دعا مانگی ہے اور جہاں اپنے لئے اصلاح کی دعا کی ہر وہاں تمہارے لئے اور ان دونوں کے لئے بھی کہ خدا کرے آئندہ سب کے ساتھ مل کر کام کر سکیں، کسی کے کہنی مار کر آگے بڑھنے کا خیال دل میں نہ لائیں، کسی کی پگڑی اچھالنے کی فکر نہ کریں، اپنے ہی کام سے اپنا نام چاہیں، دوسروں کی رسوائی سے اپنی شہرت کے خواہشمند نہ ہوں۔“

ہمارا جبر وودہ کی حمایت | ایک نہایت نازک موقع پر محمد علی نے ہمارا جبر وودہ کی حمایت کی تھی، اور انھیں ایک نہایت سخت خطرہ سے نجات دلائی تھی، بہتر ہو کہ یہ داستان محمد علی کی زبان ہی سے سنئے۔

”دہلی دربار کے موقع پر ایک نہایت سنگین اور خطرناک الزام ہمارا جبر صاحب بڑودہ پر بادشاہ اور ملکہ کی اہانت کا لگایا گیا تھا، ملک بھر کے ایک اخبار نے بھی حق کی حمایت کی ہمت نہ کی اور تعجب ہے کہ کسی ہندو اخبار نے بھی آواز بلند نہ کی مگر حق نہک کے خیال سے بلکہ صرف حق حق کے خیال سے میں نے ہندوستان اور ولایت کے انگریزی اخباروں کا مقابلہ کیا اور لارڈ ہارڈنگ کے طرز عمل کو بھی ایک حد تک ذاتی غم و غصہ کا نتیجہ بتایا اور کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار نے بھی میرے ہی کہنے پر ہمارا جبر گیکوآڑ کی تائید کی، اس کے صلہ میں ہمارا جبر سے کچھ لینا تو درکنار، میں نے اسی وقت ان کی نوکری سے اس لئے کہ میں دو سال سے بلاخواہ رخصت پر تھا اور ہمارا جبر صاحب کسی طرح استغفیٰ قبول نہ کرتے تھے، مستغفیٰ ہو گیا اور یہ کہہ کر ان کو اس کی منظوری پر بالآخر رضی

کر لیا کہ حکومت کے افراد کہیں گے کہ ایسے شخص کی رائے کی کیا وقعت ہو جو خود ریاست کا ملازم ہو؟

اس سلسلہ میں سب سے آخری واقعہ فسادات بمبئی کا ہے۔

واقعہ بمبئی | اس واقعہ کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ محمد علی کو ذیابیطس کی سخت شکایت تھی، بعض اہلکار کے مشورہ اور شوکت صاحب کے اصرار سے محمد علی بمبئی کے ایک ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ ڈاکٹروں کی سخت تاکید یہ تھی کہ بستر سے بلند بھی نہ اٹھیں، جسم کو علاج اگر نہیں کیا تو پیر کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی اور پھر لامحالہ کاٹی جائیں گی۔

یہ واقعہ فروری ۱۹۲۸ء کا ہے جب محمد علی کانگریس کے مخالف ہو چکے تھے اور ہندوؤں میں اور کانگریسی حلقوں میں پوسے طور سے غیر ہر دلغوز۔

محمد علی ہسپتال میں استرطالت پر دراز ہیں، فساد کی اطلاع آتی ہے، اور تھوڑی دیر میں لاشیں آ رہی ہیں، زخمی آ رہے ہیں، کسی کا ہاتھ ٹوٹا ہوا ہے، کسی کا پیر جھول رہا ہے، غرض تھوڑی ہی دیر میں ہسپتال کے اندر ایک ہنگامہ دار و گیر برپا ہو گیا، ہندوستان کے مرد مجاہد سے کون یہ توقع کر سکتا تھا کہ وہ اپنی صحت کے خیال سے چار پانی پر پڑا رہے گا، وہ اٹھا، اپنی اسی حالت میں اٹھا اور موقعہ واردات پر پہنچ گیا وہاں پہنچ کر کیا ہوا؟ اسے خود اس کی زبان سے سنئے:

”میں کمائی پورہ میں گیا، اور مسلمانوں کی ہر گلی میں جا کر خدا و رسول کا ان کو دھم

دیا اور ان کو مل والوں کے ظلم کی تقلید سے دبئی کے ملوں کے ہندو مزدوروں نے اس فساد میں مسلمانوں کو جانی و مالی بہت سخت نقصانات پہنچائے تھے، روکا اور شرم دلائی، میں وہاں سے بھل ہی رہا تھا کہ ہندوؤں کی ایک عبت

مسلمانوں کی طرف بڑھی جب مسلمان اپنی گلیوں سے نکل کر اپنے ہم مذہبیوں کی
حایت کے لئے آئے تو فوج کی طرف سے گولی چلنا شروع ہو گئی، گولی چل رہی
تھی کہ سامنے سے ایک کچرے کی گاڑی والا اپنی گاڑی ہانکتا ہوا نکلا، اس پر
چند مسلمانوں نے حملہ کیا، میں فوراً ٹیکسی سے کود پڑا اور ان حملہ آوروں کے
پچھے بھاگا، اور ان کو خدا اور رسول کا واسطہ سے کر منع کیا، اور اس ناکرد
گناہ کو مائے جانے سے بچایا۔“

یہ تھا محمد علی کا وہ کردار جو اس کے بعد ہندوستان کے کسی لیڈر، کسی زعمیم اور کسی ناخدا
کے ہاں نہیں ملتا، اگرچہ لیڈروں اور ناخداؤں کی کوئی کمی نہیں۔

باب

غرم و استقلال

محمد علی کی طبیعت میں یہ بات بھی داخل تھی کہ جب وہ کسی بات کو طے کر لیتے تھے تو غرم و استقلال کی ایک چٹان بن جاتے تھے، جو کبھی بھی اپنی جگہ سے جنبش نہ کرتی، اجاب و اعزہ لاکھ سمجھائیں، عواقب و نتائج ہزار بار اپنا بھیانک نقشہ پیش کریں، اور مال اندیشی اور مصلحت بینی جس طرح بھی انھیں باز رکھنا چاہئے، مگر وہ کبھی بھی ان موانع سے متاثر نہیں ہوتے اور جو کچھ طے کر لیا، اس پر اس وقت تک قائم رہے جب تک کہ کر کے نہ دکھا دیا۔

ایک سخت مضمون | میر مخدوم علی صاحب کا بیان ہے کہ :

”اے اے کی مضبوطی کا یہ حال تھا کہ جو بات غور و فکر کے بعد صحیح سمجھ کر طے کر لی اس سے تجاوز کرنا بعید از امکان؛“ محمد علی نے چوائس آف دی ٹرکس کے عنوان سے وہ مضمون لکھا جو ان کی زندگی کے دور یا کانچ بیل مینے والا ہوا، راجہ غلام حسین

ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجل خاں | مرحوم نے مضمون دیکھ کر حکیم (اجل خاں) صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب سے اس کا تذکرہ کیا، ڈاکٹر صاحب کی مخالفت

نے بھی مضمون پر پتھر کر اور حکیم صاحب نے اس کا مطلب سن کر یہی رائے دی کہ مضمون اس وقت ہرگز نہ شائع کیا جائے مگر محمد علی کب ماننے والے تھے، راجہ بیچارہ نے گھر اٹھ میں مجھے بدایوں تارو یا کہ فوراً آؤ، میں اپنا اور نرم الفاظ میں اپنی بیعت میرزا دی، مگر محمد علی نے ایک نہ سنی، جب میں نے زیادہ کہا تو کہنے لگے کہ میں

جانتا ہوں کہ میں نے اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کئے ہیں، مگر اب میں
راے قائم کر چکا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

چھٹا وارڈ کا ایک واقعہ | مسز منٹ وغیرہ کی ربائی کے بعد محمد علی کے نظربندی کے خلاف
ملک میں سخت ہیجان پیدا ہوا اور وائسرائے پر بہت زور ڈالا گیا کہ علی برادران بھی رہا ہو جائیں
مگر گورنمنٹ نے اس مطالبہ پر کوئی اقدام نہیں کیا، ہاں یہ ضرور ہوا کہ شیخ عبدالمجید صاحب سپرنٹنڈنٹ
پولیس خفیہ، محمد علی کے پاس پہنچے اور ایک ایسا بیان لینا چاہا جس سے گورنمنٹ مطمئن ہو جائے
اور وعدہ کیا کہ اگر انھوں نے اس قسم کا بیان دیدیا تو گورنمنٹ ان پر سے نظربندی کے قیود و
پابندیاں اٹھا لے گی، مگر استقلال کے اس کوہ وقار نے ایسا بیان دینے سے قطعاً انکار کر دیا۔
مختصراً یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مسٹر جناب، مسٹر مظہر الحق، ہمارا صاحب محمود آباد اور دوسرے اجاب
نے لاکھ لاکھ کوششیں کیں مگر گورنمنٹ بغیر اس مطلوبہ بیان کے نظربندی سے رہا کر سکی اور نہ
علی برادران نے کوئی ایسا بیان دیا جس سے ان کی آزادی قلب و ضمیر مجروح ہوتی، اور
ہنسی خوشی سے قید و بند کے مصائب پورے پانچ سال تک برداشت کئے اور ملتے پر شکن
تک نہ آنے دی۔

رحمت اللہ کشین | ہرمانس سگیم صاحبہ بھوپال نے جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نازک حالات
دیکھ کر رحمت اللہ کشین کا تقرر کیا سو تو محمد علی کے علی گڑھ سے ہمیشہ جو تعلقات رہے تھے، ان کی
بنار پر محمد علی کے ہر دوست نے انھیں مجبور کیا کہ وہ کشین کے سامنے شہادت ضرور دیں، مگر صلاح
علی گڑھ کا اس سے بہتر موقع کوئی اور نہیں ہو سکتا، چنانچہ بعض ”نوجو خیر علیگ“ حضرات نے کشین
کے سامنے شہادتیں دیں بھی لیکن محمد علی نے سٹے کر لیا تھا کہ وہ اس قسم کی چیزوں سے اپنا مسک
کے اعتبار سے تعاون نہیں کر سکتے، اس لئے کسی ترغیب اور تحریص سے وہ متاثر نہیں ہوئے

نواب صاحب اور ارکان کیشن کی خواہش | حالانکہ نواب صاحب بھوپال کی مرضی اور کیشن کی رائے یہی تھی کہ محمد علی کیشن کے سامنے رائے ضرور دیں، اس موقع پر

ایک اہم خط کا اقتباس غیر دلچسپ نہ ہوگا:

”میرا خیال ہے کہ اگر آپ بھی مسلم یونیورسٹی کیشن میں شہادت دینے جاتے تو بہت چھا ہوتا، ترک تعاون کی بحث سے قطع نظر کر کے محض تعلیمی اصول اور قانون کے نقائص پر آپ بحث کرتے، یہ موقع یونیورسٹی کی تعلیمی اخلاقی اصلاح کا ہے، آپ کا علیگڑھ شہادت کے لئے جانا میرے خیال میں تو بہت ہی ضروری ہے، ہر بٹانس نواب صاحب بہادر اور سربراہ ہم رحمت اللہ اور پروفیسر رحمن کا خیال ہے کہ اگر آپ شہادت دیں تو بہت ہی اچھا ہو“

ان تمام تحریکوں اور التجاؤں کے باوجود محمد علی کے فیصلہ میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔

علی گڑھ جوہلی | ایک موقع اور بھی ایسا ہی سخت آزمائش کا انھیں پیش آیا تھا یعنی علیگڑھ کا پانچواں سالہ جشن جوہلی، محمد علی کو علیگڑھ سے ہمیشہ سے جواہر افتاب تھی اس کا اقتضایہ تھا کہ محمد علی اپنی اور تعلیمی کے اس یادگار جشن میں شریک ہوتے، لیکن اصول کا معاملہ یہاں بھی بہت سخت تھا اور یہ وہ چیز تھی جو محمد علی کو بہت مشکل سے ان کے غم و ارادہ سے پھیر سکتی تھی۔

احسان صاحب کا خط | مسٹر احسان الحق بیرسٹریٹ لاء ایجوکیشنل پور، محمد علی کے بچپن کے ساتھی اور نہایت عزیز دوست ہیں، انھیں جب محمد علی کے اس غم کی اطلاع ہوئی، تو لکھتے ہیں۔

”مسلحہ کے اولڈ بوائز ڈز کے بعد، میں علیگڑھ نہیں گیا، کچھ واقعات ہی ایسے پیش آتے رہے جوہلی میں شامل ہونے کا ارادہ ہی معلوم ہوا کہ تم علیگڑھ جانے پر رضامند نہیں یہ یاد رہے کہ اگر تم نہ گئے تو سیکڑوں اور بھی نہ جائیگے، ہم گمراہ ہی لیکن خیر ہم تمہارے ہیں اور تم ہمارے ہو“

باب

مذہبیت

محمد علی کی سیاسی اور علی زندگی کا ایک اہم جزو، ان کی غیر معمولی مذہبیت ہی مذہب کا رنگ صحیح طور سے ان میں اتنا چرچ گیا تھا، اور اسلام کی تعلیمات نے ان پر اپنا اتنا گہرا نقش قائم کر دیا تھا کہ وہ ایک مومن قانت کی طرح اپنی زندگی کا ہر پہلو، اور سیاسی پیچیدگیوں کا ہر مسئلہ مذہب کی روشنی میں دیکھتے تھے، اور اسی روشنی میں کام فرما ہوتے تھے، یہ عجیب بات ہے محمد علی ان لوگوں میں نہیں تھے جو ایک عرصہ دراز تک زندگانی کا شام پہنچے ہوں، اور پھر بعد کو سیاسی مصلح سے انھوں نے اپنے اوپر مذہبی رنگ چڑھالیا ہو، بلکہ وہ بچپن سے مذہب کے والہ و شیدا تھے اور مذہبی احساس سے وہ کبھی بھی خالی نہیں رہے۔

سریعوب کا بیان | سریعوب کا بیان ہے کہ:

”علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانہ میں شوکت کے اثر اور ولایت جا کر وہاں کی فضا میں محمد علی پر ظاہری انگریزیت کا غلبہ تھا، سوٹ، بوٹ اور ہیٹ میں وہ بڑے چوکس ہتھے تھے لیکن بادیو اس کے مذہبی عقائد میں وہ ہمیشہ مضبوط تھے، اور ولایت میں بھی انھوں نے کبھی رمضان کے روزے قضا نہیں کئے۔“

محمد علی کا بیان | محمد علی خود اپنی مذہبی استقامت پر مصر تھے چنانچہ فتنہ شریف و ابن سعود کے زمانہ میں جب انھوں نے اپنے مرشد مولانا عبدالباری مرحوم سے اختلاف کیا، تو اپنی مذہبیت پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا:

”بھمدا اللہ میں مولنا صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے پیشتر بھی مسلمان تھا، آج بھی مسلمان ہوں، اور انشا اللہ ہمیشہ مسلمان رہوں گا، جب آٹھ برس علی گڑھ اور چار برس آکسفورڈ میں رہ کر مجھ میں کفر والحاد نے سرایت نہ کی تو اب جبکہ اسلام کی خاطر میں نے علی گڑھ سے منہ موڑ لیا اور آکسفورڈ پر بھی لات مار دی، کیا خداؤ کریم مجھے کفر والحاد کی طرف لیجائے گا؟ اب تو یہی دعا ہے کہ مجھ سے سب بیزار ہو جائیں مگر تو اور تیرا رسول نہ بیزار ہوں، کسی سے نکٹ عہد ہو مگر تجھ کو اور تیرے رسول سے نہ ہو دنیا بھر کی بیعتیں فسخ ہو جائیں مگر وہ بیعت فسخ نہ ہو جو سب سے پہلی بیعت ہو، خداوند! میں اقرار کرتا ہوں کہ میں تجھ سے راضی ہوں اور تیرے رسول پاک سے، تیرے قرآن سے اور تیرے رسول کی سنت سے۔ اے کاش تو اور تیرا رسول بھی مجھ سے راضی ہو جائیں۔“

مولنا عبدالماجد کا بیان | مولنا عبدالماجد صاحب دیرابادی کے ایک ضمنی بیان سے بھی محمد علی کی مذہبیت پر کافی روشنی پڑتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

”سلسلہ میں راقم سطور کا ایک فلسفیانہ رسالہ انگریزی زبان میں شائع ہوا، چند واڑہ کے اسیر فرنگ نے اس پر اپنے عنایت ناموں میں نہایت تفصیلی تبصرہ کیا، راقم پر اس وقت تک ”عقلیت“ کی لعنت مسلط تھی، اسے یہ دیکھ کر حیرت پر حیرت ہوتی تھی کہ کامریڈ کے ایڈیٹر کی ایک ایک سطر عشق رسول میں ڈوبی ہوئی ہے۔“

کراچی جیل میں داخلہ | خوبی قسمت سے ہیں محمد علی کی کراچی جیل کی ڈائری کے چند اوراق اور بعض دوسری ڈائریوں کے بھی چند اوراق مل گئے ہیں، جو اگرچہ اس لئے نشہ ہے

جاسکتے ہیں کہ وہ بطور ڈائری ہی کے لکھے گئے تھے کسی کو دکھانے کی غرض سے نہیں ضبط
تحریر میں آئے تھے اس لئے بہت بے ترتیبی، بے پروائی اور حد درجہ شکستہ خط میں منسلک
گھیسے گئے ہیں، تاہم کچھ نہ کچھ مواد حاصل ہی ہو گیا ہے، کراچی جیل میں جب محمد علی داخل ہوئے
ہیں تو کہتے ہیں:

”بجے جیل میں داخل ہوا، رب اذلتی مدخل صدق واخر حنی مخرج صدق
واجلنی من لدنک سلطاناً نصیراً، پڑھ کر داخل ہوا بستر
وغیرہ جیل کا ہی، آتے ہی دو رکعت دو گانہ شکر پڑھی،
پھر آگے چل کر دوسرے درق پر:

”نیندا رہی تھی مگر عشا کے خیال سے نہ سویا، عشا سے فارغ ہو کر لیٹا، رات
کو پہرے والے چلاتے تھے، آنکھ کھل کھل جاتی تھی، غلام مجدد صاحب
بزرگ ہیں، بہت احوصلہ، صبر، ضبط، سکون سب ہی کچھ ہے ..
.. شام کو پچھبے بند ہوئے، کھانا رات کو نہ کھایا، عشا سے فارغ
ہو کر رات کو سو گیا پچھبے اٹھا، تہجد کی توفیق عطا ہوئی“

سنت یوسفی کے پیرو اعظم کی زندگی کا یہ صفحہ ابھی ختم نہیں ہوا، بلکہ ایک سے ایک ٹھکر
مفتی فلسطین کا نکشاف | واقعات سلسلے آتے جا رہے ہیں، سب سے زیادہ قابل توجہ وہ
واقعہ ہے جو مفتی فلسطین امین الحسینی صاحب نے ظاہر فرمایا ہے، اصل ماخذ نمل سکنے کے سبب یادداشت
کے بہرہ و سرچس کی تفصیل یہ کہ محمد علی شرکت موٹر کے لئے حب جواز تشریف لے گئے ہیں
تو ایک روز رات کو بہت دیر کے بعد امین الحسینی صاحب کا مسجد حرام کے اندر خانہ
کعبہ کے پاس گزر ہوا، تو دیکھتے کیا ہیں کہ رات کی اس تاریکی میں خلاف کعبہ پکڑے ہوئے

ایک شخص خانہ کعبہ میں، صاحب خانہ سے مصروف راز و نیاز ہے، اس کی آواز بیٹھی ہوئی ہے، گریہ لگو گریہ ہے، گردن سجدہ میں جھکی ہوئی ہے اور وہ گڑ گڑا کر، رورور کر، عرض کر رہا ہے کہ لے کار ساز عالم مجھے تو جہنم میں جھونک دے، میری کسی آرزو کو پورا نہ کر، لیکن ایک بار ان آنکھوں کے سامنے احیاء خلافت راشدہ کر کے وہ مبارک و مسعود زمانہ پھر واپس لائے جس کو کانوں نے سنا ہے مگر آنکھیں اب تک محروم ہیں، ہندوستان کو آزادی عطا فرماتا کہ وہ پنجہ اغیار سے آزاد ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے،

مفتی صاحب کا بیان ہو کہ میں حیرت سے یہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہا تھا جب اس شخص نے اپنی پیشانی سجدہ سے اٹھائی تو دیکھا کیا ہوں وہ تو زعم شرق محمد علی ہے جس کا نورانی چہرہ آنسوؤں سے تر ہے!

کتاب اجالہ پرتاثرات | اسی طرح جب وہ رسول عالم کتاب اجالہ منظر عام پر آئی، تو محمد علی بیکار و مضطر ہو گئے، اور اس قسم کی نویتوں کے انداد کے لئے جو آئینی و قانونی معقول و بنیدہ کوششیں وہ صرف کر سکتے تھے، وہ انھوں نے صرف کیں، لیکن اس واقعہ سے ان کے دل و دماغ پر بہت زاید اثر پڑا تھا چنانچہ ایک موقع پر اپنے تاثر کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”جہاں تک خود میرا تعلق ہے مجھے نہ قانون کی ضرورت ہے نہ عدالتوں کی حاجت اگر کوئی ہندوستانی بھائی اس قدر شقی القلب ہو کہ مجھ سے تو ایک معمولی جانور کا تقدس منوا کر اس سے متمتع ہو سکے حق سے میری دوست برداری کا طالب ہو، لیکن انسان جو اشرف المخلوقات ہیں، ان میں سے سب سے اشرف نبی سرور کو تو میں اور باعث تکوین دو عالم کا جو تقدس میرے دل میں کوٹ

کوٹ کر بھرا ہوا ہے، اس کا اتنا پاس بھی نہیں کرتا کہ اس برگزیدہ ہستی کی توہین کر کے میرے قلب کو چور چور کرنے سے احتراز کرے تو ہندوستان کو اس غلامی سے نکالنے کے لئے جس میں آج وہ مبتلا ہے اور جو گاؤں پرست ہندوؤں کے وجود سے کہیں زیادہ ہمارے مذہب اور ہماری ملت کی بے حرمتی کا سبب ہو، مجھ سے جہاں تک صبر ہو سکے گا صبر کروں گا اور جب صبر کا جام بربز ہو جائے گا تو اٹھوں گا اور یا تو اس گندہ دل، گندہ دماغ، گندہ دہن کا فر کی جان خود لے لوں گا یا اپنی جان اس کوشش میں کھو دوں گا۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محمد علی اپنی قابل فخر و رشک مذہبیت اور صداقت کا اس وقت اعلان کر رہے ہیں جبکہ وہ بچے کا نگرسی ہیں، اور یہ وہ زمانہ ہے کہ اس فتنہ پر بڑے بڑے لوگوں کی زبانیں گنگا لید محمد علی کے علاوہ اسلامی ہند کے سنجیدہ متین اور بہترین زعماء قفل خاموشی لگائے بیٹھے تھے، اسی طرح ہندوؤں کی بھی یہی حالت ہو رہی تھی، یہاں تک کہ ایک بار اتفاقاً ایسوشی ایٹڈ پریس کا نمائندہ پنڈت موتی لال نہرو کے پاس پہنچ گیا اور اس نے اس مسئلہ پر ان کی رائے مانگی تو پنڈت جی نے اس مسئلہ پر لب کشائی کرنے سے قطعاً انکار کر دیا،

پارلیمنٹ کی گیلری میں نماز | ستمبر میں جب محمد علی بنو علی علاج یورپ گئے ہیں تو کچھ عرصہ تک علان کرنے کے بعد وہ کچھ دنوں کے لئے انگلینڈ بھی چلے گئے تھے، وہاں ایک بار پارلیمنٹ کے وزٹرس گیلری میں بیٹھے ہوئے کارروائی کا مطالعہ کر رہے تھے کہ نماز کا وقت آگیا، اسی وقت وہ محمد کا ہننام اور اللہ کا غلام اٹھا، گیلری کے ایک گوشہ میں نیچا عبا بچھائی اور ماسوا اللہ سے بے نیاز و مستغنی ہو کر، اللہ کی طرف متوجہ ہو گیا، لوگوں نے اس وقت کو بہت تعجب سے دیکھا، لندن کے ایک اخبار نے اس واقعہ کو شائع کیا تھا کہ آج ایک آدمی

سے یہ ”حرکت“ سرزد ہوئی، محمد علی کے شناسا سمجھ گئے کہ وہ ”آدمی“ محمد علی کے سوا کون ہو سکتا ہے؟ واپسی پر ”بیج“ کے محترم ایڈیٹر نے اس کی تصدیق چاہی تو محمد علی نے اعتراض کیا کہ وہ ”آدمی“ وہی تھے!

خود ہندوستان میں ان کے دیکھنے والوں نے اکثر دیکھا ہے کہ خلافت کا نفرین ہو رہی ہو، یا کانگریس، مسلم لیگ ہو رہی ہو یا کوئی اور مجلس، نماز کا وقت آیا اور محمد علی نے ڈانس کے ایک گوشہ پر اپنی عبا بچھائی، اور نماز پڑھ لی، ”خندہ اہل جہاں“ اور ”انگشت نامی“ اجاب، کا اس نے کبھی بھی خیال نہیں کیا۔

ایک مذہبی اصلاحی تحریک | یہ تو تھا ان کا ذاتی جذبہ عمل لیکن اگر کوئی تحریک مذہبی حیثیت سے یا کسی اور خاص حیثیت سے انھیں مفید نظر آتی تھی تو ہمدرد اور کامیڈ کے صفحات اس کے لئے وقف کر دیتے تھے اور خود بھی جہاں تک ہو سکتا تھا، مدد کرتے تھے، ایک باجرن نظامی صاحب نے ایک مفید اصلاحی کام شروع کیا، یعنی انسداد آتش بازی، محمد علی کو اس معاملہ میں مسلمانوں کی بے راہ روی کا احساس تھا اور وہ جانتے تھے کہ اس لغو رسم کو مذہب کا جھوٹا نام دے کر کس طرح مسلمانوں کا لاکھوں بلکہ کروڑوں روپیہ برباد ہوتا ہے، اس لئے وہ تنہا، ہن، دھن، ہر طرح سے خواجہ صاحب کے معاون ثابت ہوئے، ہمدرد کے سب ایڈیٹر کو انھوں نے حکم دیا کہ خواجہ صاحب کے اس قسم کے تمام اصلاحی اعلانات و اشتہارات اور پوسٹر ہمدرد میں بلا معاوضہ شائع ہوں، نیز دہلی خلافت کمیٹی کو خواجہ صاحب کے اس نیک کام کی حمایت کے لئے وقف کر دیا، کہا جاسکتا ہے کہ اگر دہلی خلافت کمیٹی کی امداد شامل نہ ہوتی تو خواجہ صاحب کو اتنی غیر معمولی کامیابی نہ حاصل ہوتی۔

اور پھر خواجہ صاحب کی دلچسپ اور جدت آفریں طبیعت نے ایک اور تجویز آتش بازی کے

جنازہ کی پیش کی تو بقول خواجہ صاحب محمد علی نے اس کی بھی حمایت کی اور خود اس جلسہ اور جلوس میں شریک ہوئے جو اس جنازہ کو جہنا کے کنارہ دفن کرنے گیا تھا۔

تنازعہ دیوبند | اسی طرح اسلامی ہند کے مشہور دارالعلوم دیوبند میں جب اختلاف و ثقافت پیدا ہوا تو محمد علی نے اپنی تمام سیاسی مشغولیتوں کے باوجود وقت نکالا اور خود دیوبند پہنچے حالات کا معائنہ کیا اور صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی، اور اس سعی مسعود میں لگے رہ کر ہر مسئلے کے توجہ بین میں صلح کرادی جائے۔

برلن کی مسجد | ۱۹۲۸ء میں جب وہ یورپ گئے ہیں تو اپنی علالت کے باوجود برلن کی مشہور مسجد کو دیکھنے تشریف لے گئے اور وہاں اسلام و ہندوستان پر لکچر دیا، حالانکہ ان کی حالت کا اقتضایہ تھا کہ وہ پوسے طور سے سکون و اطمینان کے ساتھ آرام کریں لیکن اس قسم کے مواقع جب انھیں مل جاتے تھے تو وہ کب چھوڑنے تھے۔

دعا | ہمدرد کی نشاۃ ثانیہ کے موقع پر محمد علی نے جو دعائیں مانگی ہیں وہ ان کی خاص مذہبیت اور غیر معمولی خشیت باللہ کا نہایت کامیاب نمونہ ہے، ادب و افتاء اور درود و اثر کے اعتبار سے بھی اس دعا کو خاصی اہمیت حاصل ہے، دعا تو بہت طویل ہے اس لئے مجبوراً ”فاش اسے دل“، میں سے بھی انتخاب کرنا پڑتا ہے، ملاحظہ ہو:-

”اے رب ذو الجلال، اے وہ کہ تیری لطف فرمائی اور کرم گتری کے بغیر
ارائے ناکام، حوصلے پست، اور آرزویں صحرائے نامرادی میں تشنگی کیل ہتی
ہیں، تیرا ایک عاجز و خطاکار بندہ محمد علی تیرے حضور میں حاضر ہوا ہے کہ دل
کی تڑپ اور بروج کی بھپنی کے ساتھ دست دعا دراز کرے
میں تو ایک گدا سے بے تو اہوں، ساز و سامان کی جگہ بے سرو سامانی کے

گرداب میں بھٹنا ہوا ہوں، میرے پاس تو اگر کوئی پونجی ہے تو صرف اس قدر کہ دل میں چند ارٹے اور داغ میں چند افکار ہیں، اس کے سوا نہ کوئی ساز رکھتا ہوں نہ سامان، پھر لے عطا بار و خطا پوش خدا کے رحم و کرم میرے لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ تجھ سے بے نیاز ہو جاؤں جبکہ ہر نیاز مند کا مرکزِ ناز تو ہی ہے میرے سامنے کنگاں کے مقدس و محترم قیدی کی پوری تاریخ تھی اور جانتا تھا کہ توقید و بند کی سختیوں کو بادشاہت کے جلال و جبروت سے بھی بدل سکتا ہے، اسی لئے جب قید و بند پر قید نہائی متزلزل کی گئی تو میں نے پورے غرور اور گھمنڈ کے ساتھ عرض کیا تھا کیونکہ اس تاریک کوٹھری میں بھی تو ساتھ تھا،

ہو مستزاد قید پہ تنہائی بھی تو کیا ہے بات جب کہ یا خدا اجنبی آنکے اگلا ساز و رشتہ جنوں میں نہ ہو مگر اتنا تو ہے کہ عرش کو ناب بھی ہلا سکے میں اپنی چھوٹی سی پونجی لے کر بازار جہاں میں نکلا ہوں جو چند اوروں اور چند افکار سے زیادہ نہیں، اس کے سوا میرے ہاتھ خالی ہیں نہ تو میری جیب میں دولت ہے جس کا مجھے غرور ہو، نہ میرے پاس طاقت ہے جس کا مجھے گھمنڈ ہو، نہ اعوان و انصار کی کوئی فوج ہے جس کا بھروسہ ہو، باوجود ان بے سرو سامانیوں کے ایک تیرا وجود ہے جس پر مجھے بھروسہ اور ایک تیری ذات ہے جس پر تکیہ اور سہارا ہے اور یہ اتنا بڑا بھروسہ اور سہارا ہے کہ اگر دنیا کی ہر ایک چیز مجھ سے چھین لی جائے، میرا تمام ساز و سامان بے سرو سامانیوں سے بدل دیا جائے، اور میں دتیا سے اور دنیا مجھ سے

باب ۱۲

شوخ طبع، تقاسم ذوق، نکتہ رسی اور اقوالِ نادرہ

محمد علی اپنی مسلمہ قیادت، اور مشہور مذہبیت کے سبب ایک ”عبوسا قنطریا“ بنے ہوئے، ہر شخص کو نگاہِ خشم آلود سے دیکھنے والے لیڈر نہیں تھے، بلکہ ان کے پہلو میں ایک شوخ دل تھا، وہ خود لطائف و ظرائف کے خوگر تھے اور دوسروں کی پر لطف باتوں سے مخطوظ ہونا جانتے تھے۔ وہ ایک پاکیزہ ذوق کے مالک تھے، اس لئے آرٹ اور فنونِ لطیفہ کے قدران تھے، وہ چونکہ ایک بلند تر دل و دماغ کے مالک تھے اس لئے ان کی زبان سے ایسے آبدار کلمے بھی نکل جاتے ہیں جو ضرب الامثال کا کام لے سکتے ہیں اور اپنی گیرانی مفہوم اور وسعت خیال کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ ان کو سمجھا جائے، اور ان کی وسعتوں پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہم کوشش کریں گے کہ محمد علی کے ان خصوصیات پر بھی کچھ روشنی ڈال سکیں۔
ضیاء الدین برنی کا بیان | مسٹر ضیاء الدین برنی محمد علی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ :

”مسجد کانپور کی ایچیٹن کے زمانہ میں ایک مرتبہ علامہ شبلی مرحوم دہلی تشریف لائے، مولانا محمد علی نے شب کی دعوت ان کے اعزاز میں کی، بہت سے اصحاب مدعو تھے، سب کی فرمائش سے علامہ موصوف نے اپنی چند رباعیات

سنائیں جو سب کی سب کانپور کے واقعہ ہائے متعلق تھیں، اس کے بعد علامہ موصوف نے مولانا محمد علی کی مساعی کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں کیا، جو وہ کانپور کی مسجد کی بجالی کے لئے کر رہے تھے، پھر چند تاریخی مثالیں پیش کر کے فرمایا کہ میں نے جن جن اشخاص کے ناموں میں محمد اور علی کا اجتماع دیکھا ہے انہیں ہمیشہ ممتاز پایا، محمد علی نہایت خاموشی سے پہلے تو اپنی تعریف کو سنائے اور پھر یوں گویا ہوتے کہ ”محمد علی، والی ایران کو شاید آپ بھول گئے؟ اس پر قہقہہ بھی ہوا“

ایک اور لطیفہ | مولانا عبدالمجید صاحب دریا بادی ایک اور حد درجہ دلچسپ لطیفہ کی روایت فرماتے ہیں:

حکیم اجل خاں مرحوم نے ایک بار خلافت کمیٹی کی مجلس مرکزیہ کے جلسہ کے موقع پر نہایت خلافت کو اپنے ہاں مدعو فرمایا، محمد علی بھی تھے، دوسرے رہنمایان خلافت بھی اور بعض احرار پنجاب بھی، حکیم صاحب نے ہمانوں کی تربوز سے بھی تواضع فرمائی تھی، تربوز تمام حاضرین نے بالاتفاق پسند کیا، اور اسی کی تعریف ہونے لگی، ایک صاحب نے فرمایا، دہلی کے تربوز بہت اچھے ہوتے ہیں، محمد علی نے اپنے ایک پنجابی دوست اور لیڈر کی طرف دیکھ کر کہا لیکن پنجاب کے ”خر“ بوزہ بھی بہت اچھے ہوتے ہیں، اس پر ایک فراموشی قہقہہ پڑا۔

”پینے“ کی دیر | ایک مرتبہ ایک سخت نزاع کے موقع پر ایک مختصر جلسہ شوریٰ منعقد تھا، موضوع بحث ایسا مختلف فیہ مسئلہ تھا کہ گفتگو بڑھتی گئی، رات بڑھتی گئی، مگر اختلاف کم نہ ہوا، آخر ہندوستان کے ایک مشہور لیڈر کھڑے ہوئے اور انہوں نے تحریک فرمائی کہ چونکہ رات زیادہ ہو چکی ہے اور کھانے کو دیر بھی ہو رہی ہے، اس لئے اب جلسہ ملتوی کر دیا جائے، محمد علی نے

ہو گئی، محمد علی کے ڈرائنگ روم میں جو صاحب نظر اسے دیکھتا تھا، ممکن نہ تھا کہ ایک گرم آنسو، یا ایک ٹھنڈی سانس اسے بطور خراجِ زمیں کرتا۔

نکتہ رسی | محمد علی نے بہت نکتہ رس طبیعت پائی تھی، جس فن سے انھیں کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا تھا اس میں بھی اپنی طبیعت کی رسائی کا اتنا اندرون نہ پیش کرتے تھے کہ لوگ دنگ رہ جاتے تھے مثلاً قانون میں انھیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن خواجہ حسن نظامی صاحب ایک دلچسپ روایت خواجہ حسن نظامی کی روایت | یہ کرتے ہیں کہ:

”مولانا محمد علی صاحب نے ایک نہایت دلچسپ قانونی بات پیدا کی کہ یہ واقعہ شہادت کی دفعہ میں آتا ہے، کہ مسجد کے اوپر لفظ اللہ، اسلام کی شہادت ہے رہا تھا، اس کو مٹا کر ”اوم“ لکھا گیا، گویا ایک شہادت بدل کر دوسری شہادت پیش کی گئی، اس نے اس پر شہادت بدلنے کا جرم عائد ہوتا ہے، حاضرین اس عجیب نکتہ آفرینی سے پھڑک گئے، میں نے کہا ہم کو اسی واسطے آپ جیسے لیڈر کی ضرورت ہے، مولانا محمد علی کا داغ کیسا لا جواب ہے، وہ آج کی باتوں سے معلوم ہوا۔“

اقوال و حکم | محمد علی کی زبان سے مباحثہ ایسے مختصر سے جملے نکل جاتے تھے جو ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں، اور اپنے اختصار کے باوجود اتنا بلند مفہوم، اور اتنی گیرائی و وسعت کہ اس قابل ہیں کہ انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے۔

جدید طریقہ علاج | اسٹن سپر د ہونے سے پیشتر محمد علی نے مجسٹریٹ کے روبرو کتنی حکیمانہ

لٹ واقعہ یہ تھا کہ قلعہ کے پاس ایک مسجد تھی، اسے ہندوؤں نے ”اپنالا“ تھا، اس کے کتبہ کو مٹا کر دوسرا پتھر لگا دیا تھا جس پر ”اوم“ لکھا یا تھا، دہلی کے مسلمانوں میں اس سے بہت ہیجان پیدا ہوا تھا۔ مولف،

بات فرمائی کہ

”ایک طریقہ علاج یہ ہے کہ جو مرض ہو، اس کا اسی مرض سے علاج کرنا چاہئے
ہندوستان کو بدیسی سوت اور کپڑے نے غلام بنایا ہے، لہذا اگر ہم اپنی چیخ
اور کرگے سنبھال لیں تو ہماری آزادی کے لئے یہی کافی ہے۔“

سوراج کی تشریح | مجسٹریٹ ہی کے روبرو اپنے بیان میں فرماتے ہیں کہ
”سوراج کا مقصد Servo No Raj ہے یعنی کسی حکومت کی
تابع داری نہ کرنا۔“

تشدد اور عدم تشدد | ستمبر ۱۹۲۳ء میں ایک موقع پر محمد علی نے فرمایا تھا کہ :
”غضبناک مجبوروں کا تشدد ایک طرف رکھو اور ان قوانین کو دوسری طرف
رکھو جن سے قوم کو غلام بنایا جا رہا ہے تو میں کہوں گا کہ باوجود اس کے کہ مجھے
تشدد سے نفرت ہو لیکن میں قیامت کے روز عرش الہی کے نیچے تشدد کے
مجرم کی حیثیت سے کھڑا ہونا پسند کروں گا، بہ نسبت اس کے کہ نامردانہ اطاعت
کے جرم کا ارتکاب کروں۔“

وزیر ہند کے نام مکتوب | مسٹر ویجو ڈبن وزیر ہند کو اپنے خط میں فرماتے ہیں
”میری گفت و شنید کی ناکامی کے بعد، جنگ ممکن ہو سکتی ہے، لیکن
جنگ کی سرگرمی ناکام ہے تو پھر صلح غیر ممکن ہو جاتی ہے۔“

ایک اہم تفسیر | ۲۰ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کو لاہور کے ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر فرماتے
ہوئے محمد علی نے اپنی قوم کو نصیحت کی :

”اپنا جوش اس قدر دریا دلی سے خراج نہ کرو، ہمیں آنا بڑا شعلہ نہیں چاہئے

جو ایک ہی دفعہ بڑک کر ختم ہو جائے، یہیں تو وہ ٹٹا آہوا چراغ چاہے جبر ساری
اندھیری رات میں روشنی ملے، تاوقتیکہ سورج، کاک آفتاب نہ طلوع ہو جائے۔
اچھا وکیل | اپنی کراچی جیل کی ڈائری میں تحریر فرماتے ہیں:
”سینئر منڈنٹ آکر ایک تحریر سنا لیا کہ ۲۶ کو مقدمہ ہے تیار ہو جاؤ، الحمد للہ
اس کی ضرورت ہی نہیں، ضرورت اس کو ہو جو بیرونی مقدمہ کرے، ہم کو
توانہ سا ”نعم الوکیل“ چاہئے۔“

باب ۳۱

قومیت اور ملیت

ہندوستانی سیاسیات میں قومیت اور ملیت کا مسئلہ سیدنا زک ہر عام طور پر سیاست میں ہند کے اس بارہ میں دو گروہ ہیں، ایک وہ ہے جو ملیت کا حامی ہے اور اسے مداح حیات کے ارتقا و استحکام کے لئے بطور اساس کے تصور کرتا ہے، دوسرا وہ گروہ ہے جو ملیت کے نام سے بیزار ہے اور وطنیت کا عاشق ہے، اس کے نزدیک ملیت ایک ایسا بے معنی، اہل اور لغو مفہوم ہے جس کی متنور افکار انسانوں کو ضرورت ہی نہیں ہے تو پست خیالی، دن بستی اور تنگ نظری کا حامل ہے، لہذا جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس لفظ کو ہندوستان کے سیاسی لغت سے خارج کر دینا چاہئے۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ ملیت ایک ایسی چیز ہے جو ہر آن، ہر لمحہ اور ہر وقت تبدیل کر لی جاسکتی ہے، لیکن وطنیت ایک ایسا جو اسے جو اگر انسان کی گردن میں پڑ گیا تو ایسا گلوگیر ہوتا ہے کہ کبھی بھی نہیں نکل سکتا، اس لئے ہمیں وطنیت کی جو پرستش کرنی چاہئے لیکن ملیت کے بت کو چکنا چور کر دینا چاہئے۔

محمد علی پہلے گروہ کے ہمنوا تھے، وہ سمجھتے تھے کہ انسانی ترقی و تکمیل کے لئے یہی اپنی ایک اہم پابندی ہے، اور جغرافیائی حدود کا پابند ہو جانا اور محض اس لئے کہ ایک شخص کا ایک مخصوص خطہ ارض سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے اسے ناقابل معافی مجرم سمجھ لینا غلطی ہے، وطنیت کے جنون نے لوگوں کی آنکھوں پر ایک پردہ ڈال دیا ہے جس سے وہ حقائق

کا مطالعہ اور معائنہ نہیں کر سکتے، ان کا خیال تھا کہ ملیت کی مخالفت کرنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص اس کی مخالفت کرنے لگے کہ تم اپنے خاندان، اپنے کنبہ اور اپنے ”عائلہ“ سے دستبردار ہو جاؤ، یہ وطن پروری اور وطنیت نہیں ہوئی بلکہ ایک ایسا مرق جس کا علاج نہ نقان کے پاس تھا اور نہ موجودہ زمانہ کے کسی ”سیج الملک“ یا ”شعار الملک“ کے پاس۔
اپنے خیالات کا اظہار اس باب خاص میں انھوں نے متعدد بار فرمایا ہے۔
خلافت کانفرنس میں تقریر | خلافت کانفرنس کلکتہ کی صدارت فرماتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ :

”میں انسانیت کا قائل ہوں، وطنیت کا نہیں، خدا نے انسان کو بنایا اور شیطان نے انسان کو مختلف جماعتوں میں متفرق اور منقسم کر دیا۔
گول میز کانفرنس میں اظہار خیال | اسی طرح گول میز کانفرنس میں انھوں نے بلاتامل اور بلا تہذیب اپنے خیال کا اس باب میں اعلان فرما دیا کہ :

”میں کہتا ہوں کہ خدا نے انسان کو بنایا اور شیطان نے قوموں کو، قومیت، وطنیت، انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے، لیکن مذہب انسانوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتا ہے۔“

انڈین نیشنل یونین پر تنقید | پنڈت موتی لال نہرو نے ستمبر میں ”انڈین نیشنل یونین“ کے نام سے ایک جدید انجمن کی تاسیس کرنا چاہی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام فرقہ دارانہ انجمنوں سے مستغنی ہو کر اس کی ممبری کا فخر حاصل کیا جاسکتا ہے، محمد علی نے اس پر کتنی سچی تنقید کی ہے کہ :

”بے سوچے سمجھے، کمال تمیم کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ ”کیونلزم“ یا ملیت ”نیشنلزم“ یا قومیت کے منافی ہے اس سے زیادہ وقت نہیں رکھتا کہ کوئی شخص قوم

پروری کے جوش میں لوگوں کو اپنے کنبہ اور خاندان کی پرورش اور ان کی
تنظیم سے منع کرنا پھرے، قومیت کو تنہائے نظر بنانا یورپ کی تقلید جاہد ہے
اور وطنیت خود ”رضیت“ یعنی بت پرستی ہے، اسلام وطن پرور ہے مگر وطن
پرست نہیں۔“

”اسلام وطن پرور ہے مگر وطن پرست نہیں“ کتنا جامع اور کتنا صحیح خیال ہے؟ اور
یہی وہ مستقل نقطہ نظر تھا، جس کی محمد علی ہر وقت، ہر موقع اور ہر ایجنڈے پر تبلیغ کیا کرتے
تھے، خواہ وہ گول میز کانفرنس ہو، خواہ کانگریس کمیٹی کا اسٹیج، خواہ خلافت کانفرنس کا پنڈال ہو
خواہ مسلم لیگ کا ہال۔

باب ۱۴

وطن پروری

سطور بالا سے یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہئے کہ محمد علی کا دل اگر وطن پرستی سے خالی تھا تو وطن پروری بھی اس کے جذبہ عمل سے خارج تھی۔

محمد علی یقیناً وطن پرست کسی معنی میں بھی نہیں تھا، ہاں وہ وطن پرور تھا اور اتنا صحیح ان خیال وطن پرور کہ وطنیت کی قبا پہنے ہوئے اس وقت جو لوگ نظر آرہے ہیں ان سے کسی حالت میں اور کسی درجہ میں بھی وہ کم نہ تھا، وطن کے لئے اس کا دل اُسی طرح کڑھتا تھا جس طرح ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے ہاتھ ”کا کڑھ سکتا ہے، وطن کے لئے وہ اسی طرح سرکھٹا تھا جس طرح کوئی بڑے سے بڑا وطن پرست ہر آن اپنا سر پتیلی پر لئے رہتا ہے اور وطنی خدمت اس نے اسی طرح کی جس طرح اس جیسے بطل حریت سے توقع ہو سکتی تھی۔

سائنس کمیشن | سائنس کمیشن کے زمانہ میں محمد علی نے جو اتھک کوششیں کیں وہ کبھی بھی فراموش نہیں ہو سکتیں، اس نے سائے ملک کا دورہ کیا، مقالات و مضامین لکھے، دوتوں کی مخالفت اور ”ہم وطنوں“ کے سب و نعم کو برداشت کیا اور اپنی پوری کوشش صرف کردی کہ سائنس کمیشن سے تعاون نہ ہونے پائے۔

افغانستان کا حملہ | اپنی مسلمہ مذہبیت کے باوجود جب انڈین پیڈلٹ کے تائیدہ نے محمد علی سے استفسار کیا کہ اگر امیر کابل ہندوستان پر حملہ آور ہوں تو آپ کی روش کیا ہوگی؟ اس نے صاف جواب دیا کہ اگر امیر کابل ہندوستان پر اس لئے حملہ آور ہوں کہ ہندوستانیوں کو انگریزوں

کی غلامی کی لعنت سے نجات دلانیں، تو میں ان کی مدد کروں گا، لیکن اگر ان کی یہ نیت ہو کہ وہ ہندوستان کو اپنا غلام بنالیں اور یہاں اپنی حکومت قائم کریں تو میں ان کی مدد نہیں کروں گا بلکہ ان کے خلاف صف آرا ہو کر ان کا مقابلہ کروں گا، اور اپنے وطن کو کسی غیر کا غلام نہ ہونے دوں گا۔

جنگ چین | اسی طرح چند سال پیشتر ۱۹۲۲ء میں یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ برطانیہ اور چین میں جنگ ہو چاہتی ہے اور برطانیہ نے کارروائی کا آغاز بھی کر دیا تھا، یعنی کچھ فوج روانہ کر دی تھی اور کچھ روانہ ہونے والی تھی تو محمد علی پھر اپنی پوری طاقت کے ساتھ رونما ہوا، کانگریس نے برطانیہ کی اس روش کے خلاف جو تجویز پاس کی تھی، محمد علی نے اس کی تائید کی، حمایت کی اور اپنی ساری طاقت اس پر صرف کر دی کہ ہندوستانی فوجیں، برطانوی سپریمزم کا شکار ہونے چین کے میدان میں نہ جائیں، محمد علی نے خلافت کمیٹی کی طرف سے مسٹر شیخ قسبی کی اس آمادگی کا خیر مقدم کیا جب وہ اپنی خدمات اس لئے پیش کر رہے تھے کہ چین تشریف لیجائیں اور مجروحین و مقتولین کی دیکھ بھال اور مدد کریں گو پاسپورٹ نہ ملنے کی وجہ سے وہ وفد جانا نہ سکا۔

دہلی کا ایک جلسہ | اسی زمانہ میں دہلی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا تاکہ گورنمنٹ کی اس روش پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کرے، جلسہ میں مسٹر سرنیواس آننگر صدر کانگریس، پنڈت موتی لال نہرو، اور مسٹر سوباش چندر بوس بھی موجود تھے، محمد علی نے اس جلسہ میں ایک ایک جبارت انگیز تجویز | ولولہ انگیز تقریر کی اور گورنمنٹ کی روش پر بڑے سخت انداز میں تنقید کی، اور آخر میں یہ تجویز پیش کی کہ اگر گورنمنٹ اپنی حرکت سے باز نہ آئے اور برابر اپنی امن سوز اور ہندوستان آزاد سماعی کا سلسلہ جاری رکھے تو ہمارا فرض ہو گا کہ ہم ریل کی

ان پٹریوں پر لیٹ جائیں اور اپنے آپ کو اس گھاڑی سے کٹوا دیں جس میں ہمارے ہندوستانی بھائیوں کو چین بھیجا جا رہا ہو کہ وہ دوسروں کا حق آزادی سلب کریں اور اپنی غلامی کا اتنا بھونڈا ثبوت دیں کہ ہر شخص کو اس سے شرم آئے۔

محمد علی کی اس ولولہ انگیز تقریر کا کوئی اور دوسری تقریر مقابلہ نہیں کر سکی!

ایک خط | ان صفحات میں محمد علی کی مذہبی حمیت اور احساس کا تذکرہ ہو چکا ہے، ایک بار جب موصل میں جنگ چھڑ جانے کا اندیشہ تھا اور فوجیں لا محالہ ہندوستان ہی سے بھیجی جانیوالی تھیں تو اس زمانہ میں محمد علی جج کا عزم کر رہے تھے، لیکن اس ”عزم“ کے ساتھ کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو جج سے مقدم ہندوستان میں رہ کر کام کرنا ہوگا، چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں مشہور ”یکے ازا سیران کراچی“ مولانا نثار احمد صاحب کو لکھتے ہیں:

”جج کے لئے جانے کی نیت رکھتا ہوں، ڈر موصل کا ہو اگر وہاں جنگ چھڑ گئی تو ہندوستان میں رہ کر کام کرنا، جج پر بھی مقدم ہوگا۔“

باب

جمہوریت پر حیثیت عقیدہ کے

بعض عقائد و خیالات انسان کی طبیعت میں اس طرح مرتسم ہو جاتے ہیں کہ کسی ترغیب سے
تخلیص، کسی جاہ و جلال، اور کسی نفس گری اور سحر کاری سے وہ صفحہ قلب سے محو نہیں ہوتے
اور ہمیشہ اظہار و اعلان کے لئے مضطرب رہتے ہیں۔

ملوکیت؛ وہ لفظ تھا جس کے محمد علی کسی حال میں روادار نہیں تھے، اور اس کے
خلاف اظہار خیال میں وہ کسی چیز کی پروا نہیں کرتے تھے، اور برابر ملوکیت کے نقائص و نقصان
کا اظہار کیا کرتے تھے، خواہ وہ حلقہ احباب ہو یا مجمع اعدا۔

ہماراجہ الور کا ایک ڈنر | ہماراجہ الور محمد علی کے خاص کر مفرماؤں میں تھے، انھوں نے
محمد علی کو بغرض علاج یورپ بھیجا، نواب صاحب راپور سے دشمنی مول لی، محض اس لئے
کہ نواب صاحب مرحوم محمد علی کے اوپر سے وہ پابندیاں اٹھانا نہیں چاہتے تھے، جو وہ
عائد کر چکے تھے، اور جن کی مخالفت ہماراجہ صاحب الور کر رہے تھے، ہماراجہ صاحب مدح
نے اپنی سالگرہ کے جشن میں ہندوستان کے سرکاری و نیم سرکاری حضرات کے علاوہ اپنی
دوستوں کو بھی مدعو کیا تھا، جن میں محمد علی بھی تھے۔

ڈنر کے اختتام پر محمد علی نے بھی ایک دل نشیں اور پچپ تقریر کی، ضمناً اپنے اوپر
ہماراجہ صاحب کے تعلقات کا بھی ذکر کیا اور پھر ملوکیت پر اظہار خیال؛
محمد علی نے کہا، ہماراجہ الور میرے گہرے دوست ہیں اور میں ان کی ذہنی مدد

خصوصیات کا قدردان ہوں، لیکن ملوکیت میرے حلقہ اطاعت سے خارج ہے، میں ملوکیت کا دشمن ہوں اور اس کی حمایت نہیں کر سکتا، میرا اگر بس چلے، تو میں ہمارا جہ صاحب الورد کو دوست متحدہ ہندوستان، "کا پریڈنٹ بنا دوں، میں انھیں "جہویہ ہند" کا صدر بنا دوں، لیکن "ہمارا جہ" نہیں، محمد علی کی افتاد طبع سے چونکہ ہمارا جہ صاحب بھی واقف تھے اس لئے ان کی تقریر سے وہ بد مزہ نہیں ہوئے!

ابن سعود کی مخالفت | سلطان ابن سعود کی جب تک محمد علی کے یہ توقعات وابستہ رہے کہ ان سے تظہیر حجاز ممکن ہے اس وقت تک وہ برابر ابن سعود کی حمایت کرتے رہے، اور ذاتی طور پر انھوں نے ہرقم کے شہداء و مصائب کا مقابلہ کیا، لیکن جب انھوں نے یہ دیکھا کہ توقعات پامال ہو رہے ہیں، امیدیں شکست ہو رہی ہیں، اور مواعید کو پس پشت ڈالاجا رہا ہے تو انھوں نے مخالفت کی اور سلطان ابن سعود کو مخاطب کر کے کہہ دیا کہ یہ قیصر و کسری کی سنت ہے، ابو بکرؓ نے عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ کی نہیں۔

احیاء خلافت راشدہ کی کوشش | چونکہ وہ ملوکیت سے حد درجہ بیزار اور متنفر تھے، اور نظام خلافت راشدہ کو وہ بہترین انداز جہاں بانی و جہاں آرائی سمجھتے تھے، اس لئے وہ ایک سنگٹ کے لئے بھی ملوکیت کے ہم آواز نہ ہوئے۔

جب محمد علی بن سعود کی طلب کردہ شرکت موخر کا دعوت نامہ قبول کر لیا، اور عازم سفر ہوئے، تو انھوں نے ہمدردی میں روانگی سے پیشتر ان خیالات کا اظہار کیا :-
 "میں نے نیت کر لی ہے کہ اس سال حج بیت اللہ سے سعادت اندوز ہوں
 تظہیر حجاز ہو چکی ہے، اگر اس کے بعد حکومت غلط طریقہ پر تشکیل ہوئی تو نہ معلوم
 مسلمان کتنے عرصہ دراز تک ایک آفت سے نکل کر دوسری میں مبتلا رہیں گے۔"

مسلمانوں نے واقعہ کربلا کی اہمیت کو نہ سمجھا، یہیں اس واقعہ پر صرف سید
رسول اور جگر گوشہ بتول کی جانکاہ موت کا ماتم کرنا نہیں ہے، بلکہ نظام
خلافت راشدہ کی موت پر بھی سینہ کوئی کرنا ہے، تطہیر حجاز نے ایک موتر کے
انعقاد کا موقعہ ہم پہنچا دیا ہے اور امیدیں بندھ گئی ہیں کہ خلافت راشدہ کے
منہاج پر ایک صحیح جمہوری حکومت کی تشکیل ہو سکے گی، آج ابن سعود کے
کئے ہوئے انتظامات بہتر سے بہتر سہی لیکن ملوکیت میں جو نقصان مضر ہیں وہ
اصلاح نہیں بلکہ افادہ کے لازمی طور پر محرک ہوں گے، امیر معاویہ کی غلطی کے
باعث مسلمان تیرہ سو برس تک خراب اور پریشان حال رہے، کہیں ایسا نہ ہو
کہ اسی قسم کی ایک غلطی آج ہم سے ہو جائے اور پھر تیرہ سو برس تک ہم ذاتی
اور خاندانی اغراض کے چکر میں گھومتے رہیں، اب نہ بنو امیہ کا دور ہو سکتا ہو
نہ بنو عباس کا نہ خاندان عثمان کا، اب حکومت، اسلام ابن اسلام کی
ہوگی۔“

گول سیز کانفرنس میں محمد علی کا یہ اظہار خیال کہ ”میں اپنے نہاں خانہ تصورات میں
شاہوں اور شاہزادوں کا تصور نہیں پاتا، آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ شہنشاہیت پرستوں کے
مجمع میں اس ”غلام“ نے کیونکر اپنی آزادی رائے اور حریت قلب و ضمیر کا ثبوت دیا۔

ابن سعود کی ایک اور مخالفت | سلطان ابن سعود نے جب ایک ”بلاغ عام“ کے ذریعہ
تہیاءروں اور آتشیں اسلحہ کے لئے لائسنس کی شرط لگا دی تو محمد علی نے اس استبداد کی
بہاراجہ مخالفت کی، ان کا جمہوری احساس اس کا مخالف تھا کہ عوام پر اس قسم کی پھل اور لغو
محمد علی آجائیں اور انھیں رفتہ رفتہ بزدل اور نامرد بنا دیا جائے، ابن سعود کے آج

حکم پر وہ اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :
”ہم اس بلاغ عام پر کس طرح مطمئن ہو سکتے ہیں جو اہل حجاز کو بھی ہماری طرح
بزول بنا دے ، خالد و ضرار کی قوم کو ترکوں نے بھی اس طرح بزول بنانے
کی کوشش نہیں کی ۔“
بہر حال محمد علی کا یہ مستقل عقیدہ تھا کہ اسلام میں مسولینی کی گنجائش باطل نہیں !

باب ۱۶

شاعری

آئیے اس مختصر صحبت میں ایک سرسری نظر محمد علی جوہر کی شاعری پر بھی ڈال لیں۔
 محمد علی کو شعر و شاعری سے بچپن ہی سے لگا ہوا تھا، شاید یہ ماحول کا اثر ہو کہ رامپور تو
 اس وقت مرکز شرا تھا پھر بریلی اور علیگڑھ میں بھی اس قسم کے اثرات پیدا ہوتے رہے کہ ان
 کی طبیعت میں تحریک پیدا ہو، بہر حال یہ واقعہ ہے کہ محمد علی شعر کہتے تھے، انھیں شاعری سے
 دلچسپی تھی اور جب ان کی طبیعت کھلتی تھی تو کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔
 جوہر کی شاعری کے نشوونما اور آغاز سے متعلق ہمیں دلچسپ معلومات خود جوہر ہی کے
 قلم سے معلوم ہو گئے ہیں، شان نزول یہ کہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے ایک
 مکتوب بنام عبد الماجد | استفسار کے سلسلہ میں چھنڈ واڑہ کے نظر بند نے خود اپنے قلم سے
 اپنی شاعری کے متعلق اظہار خیال کیا جس کے اہم اجزاء یہ ہیں:

”آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں؟ بچپن میں تو بہت سے ایسے سامان
 بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا ہوں۔
 میں اس زمانہ میں پیدا ہوا تھا، جب گھر گھر شاعر ہوتا تھا، داغ، امیر، تسلیم، جلال
 عرفیج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمانوں کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے
 آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے، خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا
 شوق ہوا، تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے

حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر
عظمت علی خاں صاحب اور ان کے بھائی حافظ احمد علی صاحب شوق شائ
تھے، گھر پر بارہ شاعرہ ہوا، پھر داغ کو نواب کلب علی خاں مرحوم نے جن کی
نظر ہمیشہ کفایت شعار ہی رہتی تھی، ازراہ پرورش سرکاری اصطل کا داروغہ بھی
کر دیا تھا تاکہ وظیفہ محض کا ربیکا ران کی نظر نہ ہو، ذوالفقار، روزانہ داغ کے
گھر جاتے تھے، اور مجھے بھی لے جاتے تھے، داغ نے پہلے دن پوچھا، کہو کچھ
شعر بھی یاد ہیں، میری عمر بہت ہی کم تھی، مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دے
تھے جنہیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا، میں نے داغ
ہی کے چند شعر انہیں سنا دے، سن کر پھر کڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار
رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو، جناب والا! اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ
کر دوں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں، تو بیجا نہ ہوگا، مگر میرا دعویٰ تو اس سے
بھی بڑھ چڑھ کر ہے، سنئے! میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ ان
کی تونڈ پر کودا ہوں، اسے ہاتھی بنا کر میٹھ پر سوار ہوا ہوں۔“

مولانا عبدالماجد کی رائے | یہ تو تھا خود جوہر ہی کی زبان سے اپنی شاعری کے آغاز و ابتدا
کا بیان لیکن ان کی شاعری کے خصوصیات کیا ہیں؟ رنگ کیا ہے؟ پیام کیا ہے؟ انداز بیان
اور طریقہ ادا کیا ہے؟ اسے جوہر کے ایک بہت بڑے قدر شناس اور اس سے زیادہ دوست
اور اس سے زیادہ نقاد فن مولانا عبدالماجد صاحب کی زبان سے سنئے۔

”جوہر کی شاعری ان کے قلب کی زبان، ان کے جذبات کی ترجمان اور
ان کے واردات کا بیان ہے، آدرد، قصص اور تکلف کا ان کے ہاں گزر

نہیں، ان کے قلب پر جو کچھ گزرتی رہتی ہو وہ بلا تکلف زبان قلم پر آجاتی ہے،
تاثیر اس طرز سخن کا لازمی نتیجہ ہے، اور یہ وصف ان کے کلام میں بدرجہ اتم
موجود ہے ان کی شاعری گل و بلبل، زلف و کاکل، خط و عارض سے یکسر تہی ہوتی
ہے، ان کا کلام ایک حقیقی مسلم کا کلام ہے، ان کے جذبات تمام تر وہ ہیں
جو ایک مسلم صادق کے ہونے چاہئیں، بے شبہ ان کی شاعری بھی چاشنی
عشق سے بیگانہ نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ عشق کی کسک ان کے ایک ایک مصرعہ
میں موجود ہے، البتہ ان کا معشوق نہ ایران کا ”بدر خط“ ہے نہ ہندوستان کا
”بت سیمیں بدن“، ان کا معشوق مردہ نہیں، زندہ ہے، فانی نہیں باقی
ہے، سفاک و سنگدہ نہیں، رحمن و رحیم ہے، ان کا محبوب وہ ہے جو ہر مسلم بلکہ
ہر مسلم الفطرت کا ہوتا ہے۔“

اگر جوہر کی شاعری کی تحلیل کیجائے، تو وہ اسی مذکورہ بالا اصول کے مطابق محدود
ہوگی، اس سے باہر نہیں جاسکتی۔

انتخاب کلام | طوالت کے اندیشہ سے ہم خود جوہر کی شاعری پر کوئی اظہار نہیں کرتے
اس لئے کہ نہ وہ مذکورہ بالا رائے سے بہتر ہو سکتی ہو، نہ اس سے زیادہ عمدہ پیرایہ بیان میں
ظاہر کی جاسکتی ہے، اس لئے اظہار رائے سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم ان کے کلام کا عطف و ش
کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب انتخاب کلام شروع ہوتا ہے:

غزل بزمانہ طالب علمی علی گڑھ کالج ۱۸۹۷ء

کیوں ہے پرست دیکھ کے مدہوش ہو گئے شیشہ میں جو بھری تھی کہ اللہ کا نور تھا

کس زور کی لڑائی تھی اللہ ری کشمکش
تھی رات یاس اور دل نا صبور تھا
کیوں تاب دید حضرت موسیٰ نہ لاسکے
کیا پہلوئے عدو کی طرح کوہ طور تھا
خوش قسمتی کے آگے جھکنا کبھی نہ سر
اس خانہاں خراب کو کتنا غور تھا
میں تیرا گھر سمجھ کے سر راہ گر پڑا
دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دور تھا

ایضاً

ارادہ تھایہ نالوں کا ہلا دیں ربیع سکوں کو
گم لے ہم نفس دل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے
یقین آئے کو تو آجائے تیرے عہد پیاں پر
تری آنکھ لے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے
حرم میں تو کسے اظہار ترکے کشی جو ہر
مگر کج بخت کی بوئے دہن کچھ اور کہتی ہے

راے بریلی اپریل ۱۹۵۹ء

غیر کا خط ہو کہ دل ہے کسی دل دادہ کا
کچھ تو ہے تم نے جو ٹھہری میں چھپا رکھا ہے
یہ تسانے کی نکالی ہے انوکھی ترکیب
نظم کا ام ستارے مگر نے حیا رکھا ہے
آپ آئے ہیں عیادت کو دم نزع عبث
جو ہر خستہ میں اب کیے تو کیا رکھا ہے

بعد امتحان بی اے

جنوں باقی ہوا تک گو تری مغل میں بیٹھا ہو
کہ رہ رہ کنیاں آتا ہو جو ہر کو بیاباں کا

خوف غماز، عدالت خطر، دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے دہاں خوف خدا اور ہی
رب عزت کیلئے بھی کوئی سہتے در خطاب
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور ہی

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہمار سی تری انتہا کے بعد

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے دے میرا لہو بھی خوب ہے تیری خاک کے بعد
قتل حسین اس میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کر بلا کے بعد

نور حق وہ شمع انور ہے جو بجھ سکتی نہیں ہے خدا حافظ چراغ رہ گزار باد کا
آج تک ہو ایک کنفانی سے شہرت مصر کی فیض سے حسرت کے ہو گا نام فضیل باد کا

ہو رشک کیوں یہ ہم کو سردار دیکھ کر دیتے ہیں بادہ ظرف قلع خوار دیکھ کر
اس شان امتیاز کو دیکھو کہ اہل کفر مومن سمجھتے ہیں یہیں خوار دیکھ کر
تیز گئے کر دیا دونوں کا فیصلہ باہم دل و جگر میں یہ تکرار دیکھ کر
ہم خاصگان اہل نظر اور قتل عام جو روستم بھی کر، تو ستمگار دیکھ کر
ہر سینہ آج ہوتے پیکاں کا نظر ہوا انتخاب، اسے نگہ یار دیکھ کر

یا دوطن نائے ہیں کیوں وطن سے دور جاتی نہیں ہو بے چین کیا چین سے دور
گر بے گل نہیں، نہ سہی یاد گل تو ہے صیاد لاکھ رکھے نفس کو چین سے دور
آساں نہ تھا تقرب شیریں تو کیا ہوا تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہن سے دور
ہم تک جو دور جام پھر آئے تو کیا عجب یہ بھی نہیں ہے گردش چرخ کہن سے دور
شاید کہ آج حسرت جہسہر نکل گئی اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و فن سے دور

لہ مولانا حسرت موہانی اس مانیں فیض آباد جیل میں اسیر تھے!

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
ہے سنت ارباب وفا صبر و توکل
دشت رہ غربت میں اکیلا تو نہیں تو
اللہ کے ہاتھوں کا بھی ہے رنگ نرالا
یہ نور خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا
ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہے
ہو جن طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا
سونے کا نہیں وقت یہ ہشیار ہو غافل

دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامن رضا دیکھ
بطحا کے ہاجر کا تو نقش کعبہ پا دیکھ
اس سادگی پر سرخی خون شہدا، دیکھ
کچھ دم نہ اگر تجھ میں تو آ، تو بھی بچھا دیکھ
اللہ کے بندوں کو نہ اس درجہ سادہ دیکھ
ہو صدق طلب پھر اثر آہ رسا، دیکھ
رنگ فلک سپر، زمانہ کی ہوا دیکھ

تشنہ لب ہوں مدتوں سے دیکھے
طاقت پرداز ہی جب کھو چکے
چاک کر سینہ کو پہلو چیر ڈال
لودہ آپہنچا جنوں کا قافلہ
ہوں جو کثرت ہی کے قائل ان پر کیا
رونمائی کے لئے لایا ہوں جان
اب تو کشتی کے موافق ہے ہوا
یہ نظر بندی نو بھلی رد سر
اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا ظلم
اب ہوا ہر ماسوا کا پردہ فاش

کب درمیانہ کو نثر کھلے
پھر ہوا کیا گر ہوئے بھی پر کھلے
یوں ہی کچھ حال دل مضطرب کھلے
بانوں زخمی، خاک منہ پر سر کھلے
راز فتح سب سے پیغمبر کھلے
اب تو شاید چہرہ انور کھلے
نا خدا کیا دیر ہے لنگر کھلے
دیدہ ہائے ہوش اب اگر کھلے
حق کے عقد اب کہیں جا کر کھلے
معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے

فیض سے تیرے ہی لئے قید و نگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے
بیٹے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
تیرے زلفوں کا جو شانوں پہ بکھرا ہے یہی
نقد جاں نذر کر دسو چے کیا ہو جو ہر
ہوس زلیت ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
قید گیسو سے بھلا کون رہے گا آزاد
کام کرنے کا یہی ہو تھیں کرنا ہے یہی

تم یوں ہی سمجھنا کہ منسا میر سے لئے ہو
پنیام ملا تھا، جو حسین ابن علی کو
کیوں جان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے
میں کھوکھری راہ میں سب دلت دنیا
توحید تو یہ ہو کہ خدا شریں کہہ دے
سرخی میں نہیں دستِ حنا بتہ بھی کچھ کم
لے شافعِ محشر جو کرے تو نہ شفاعت
کیا ڈر ہے جو ہوساری خدائی بھی مخالف
ہیں یوں تو قدابِ رسیہ پر سبھی میکش
پر غیب سے سامان بقا میر سے لئے ہے
خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میر سے لئے ہے
ما تم یہ زمانہ میں بسا میر سے لئے ہے
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میر سے لئے ہے
یہ بندہ دو عالم سے تھا میر سے لئے ہے
پر شونِ خونِ شہدا میر سے لئے ہے
پھر کون وہاں تیرے سوا میر سے لئے ہے
کافی ہے اگر ایک خدا میر سے لئے ہے
پر آج کی گھنگور گھٹا میر سے لئے ہے

ہوں لائقِ تفسیر پر الزام ہے جھوٹا
خودِ خضر کو شبیر کی اس تشنہ لبی سے
مجرم تو ہوں بے شک پہ خطا اور ہی کچھ ہو
معلوم ہوا اب بہت اور اتنی کچھ ہو

نے سائل دولت ہیں نہ عزت کے طلبگار
یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی
یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جو ہر
اس در کے فقروں کی صدا اور ہی کچھ ہو
پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہو
لیکن صلہ روزِ حسنا اور ہی کچھ ہو

الوداع لے ماہِ رمضان الوداع
ان دنوں تھا بحرِ حمت جوش پر
قید تنہائی کی رونق تجھ سے تھی
شدت غم سوزِ باں گربند ہے
بہترین نگساراں الوداع
لے زمانِ عفو عسیاں الوداع
لے شریکِ بزمِ زنداں الوداع
تو ہی کہدے چشمِ گریاں الوداع

کیا ڈھونڈتے ہو فصلِ خزاں میں بہار کو
سن لیجے خلوتوں میں اناج کا ادعا
فرصت کے خوشامدِ ثمرِ دیزید سے
اب وہ چمن کہاں ہے وہ رنگِ چمن کہاں
سولی پہ چڑھ سناے وہ اب نعرہ زن کہاں
اب ادعاے پیرِ دی پختن کہاں

تنہائی کو سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
ہر آن تسلی ہے ہر خطہ تشفی ہے
معراج کی سی حاصلِ سجدوں میں ہو کیفیت
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر سنایا کر
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر روز یہی چرچے ہر روز یہی باتیں
اک قاسق و فاجر میں اور ایسی کراتیں
بھیجی ہیں دروہوں کی کچھ سم فی غلاتیں
ٹلتیں نہیں یوں جو ہر اس دس کی برساتیں

پھر مہر رہا ہے شورِ صلائے نرسر عشق
ہاں لے دہان زخمِ جواب، الاماں، نہ ہو
سنے ہی جس کے خلق میں کہرام مچ گیا
جو ہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں، نہ ہو

بے خوفِ غیبِ دل کی اگر تر جہاں نہ ہو
بہتر ہے یہ کہ ایک سرے کی زباں نہ ہو
اک تو جو مہر باں ہو تو ہر اک ہو مہر باں
ادریوں نہ ہو بلا سحر کوئی مہر باں نہ ہو
ہمت نہ ہارے کوئی منزل کے سامنے
پروردگار یوں بھی کوئی ناتواں نہ ہو

مستحقِ در کو حکمِ سر بند سی ملا
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

میرے ہوئے خاکِ وطن لالہ زار دیکھ
اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ
کیا عشقِ ناتمام کی تباؤں سرگزشت
دار و رسن کا اور بھی انتظار دیکھ

پیامِ مرگ ہی پیغامِ یار و مرثوہ وصل
وہ کامِ اجل نے کیا جو صبا سے ہونہر سا

قید ہے، قیدِ غلامی دو برس کی قید کی
دیکھو کب ہو خاتمہ اس قیدِ بے سعاد کا

رہے گی اٹھ کے یہ اکدن نقاب دیکھو تو
ہاں سے رب ہو نہیں سے حجاب دیکھو تو

اس دروِ لادوا کی دوا ہو تو جائے
دستِ مسیح میں یہ شفا ہو تو جائے

ہر شے کو لیکے شکر کیا بھی تو کیا کیا جان دیتے دقت شکر ادا ہو تو جانے

دہان نفس کیا تے فریاد کریں گے	اتنی بھی نہ اب خاطر صیاد کریں گے
وہ جس سو کہیں ہم تجھے دل شاد کریں گے	سمجھو کہ اسے اور بھی برباد کریں گے
جو دشت کو آرام کہ بسط نبی ہے	اس دشت کو لاکھوں بھئی آباد کریں گے

گلے دل ابھی سے کرتا ہے	عشق کا دم اسی پہ بھرتا ہے
جان دیتا ہے عیش فانی پر	بس، اسی زندگی پہ مرتا ہے
جس کو دنیا نے نامراد کہا	وہی ناکام، کام کرتا ہے
آج کر لوجو کر سکوکھل تک	کون جیتا ہے، کون مرتا ہے
تقدم عشق میں گرا سو گرا	اس کا ڈو با کہیں بھرتا ہے
اس قدر احتیاط لے صیاد	کہ نفس میں بھی پر کرتا ہے
وہی دن ہو سہاری عید گدن	جو تری یاد میں گزرتا ہے

بیتاب کر رہی ہو تنائے کر بلا	یاد آ رہا ہے باد یہ پیائے کر بلا
روز ازل سے یہی ہی اک مقصد جیتا	جائے گھر کے ہاتھ ہی سودائے کر بلا
جو ہر صبح و عصر کو ملتی نہیں یہ چیز	ادریوں نصیب سے تجھے بلجائے کر بلا

ہر گز نہ ہولے دل غم جاں کی شکایت کرتا ہو بھلا کوئی بھی یہاں کی شکایت

ہیں عشق کے بیمار بھی دنیا سے زلے ہے درد کے بدلے انھیں درماں کی شکایت

غافل خدا کے قہر سے دیتی نہیں پشاہ سد سکندر می ہو کہ دیوار چین کی

اگلی سی اب وہ زعم میں طغیانباں کہاں
شب بھر میں کیا بھری ہوئی ندمی اتر گئی
صیاد کیا ہوئی وہ تری خوشے احتیاط
مرغ خیال کے نہ مرے پر کتر گئی
انا کہ باں تک آنیکی فرست نہیں نہیں
پوچھو تو آج موت کہاں جا کے مر گئی

ہیں یہ انداز آزمانے کے
اور ہی ڈھنگ ہیں تسانے کے
کر بلا ہے ہسانہ کوثر
جائے صدقے اس بہانے کے
گھر چھٹائیوں کہ چھوڑنے والے
تھے نہ ہم اس کے آستانے کے
ایک اک کے سب کے سب تنکے
کئے برباد آشیانے کے
دیکھے اب یہ گردش تقدیر
کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پر چھتے کیا ہو بود و باش کا حال
ہم ہیں باشندے جیل خانے کے
قید میں اور اتنی بے باکی
سب یہ پھین ہیں مار کھانے کے

نعلین ہی پہ ہونہ کہیں اکسف کلیم
اس آستان پہ آئے تو سر بھی اتارے
وے نقد جان تو بادہ کو خرا بھی لے
ساقی کو کیا پڑی ہے کہ یہ کوا دھارے
رہرہو تمہاراہ عشق کا منزل کجالیسا
اب اور کیا نشان مری لوح مزارے

ہے رشک ایک خلق کو جو ہر کی موت پر
یہ اس کی دین سب سے پروردگار سے

ہو بات تو جب نزع میں تمکین رہے قائم
نامے کی غنیمت ہو اب اتنی بھی برائی
آئی نہ ہونداں میں خبر، موسم گل کی
یاں قافلہ لٹا ہو بس اب یاں سو حل اٹل
مجنوں ہو تو کیا عشق کا احساس بھی کھویا
جس میں تری لیلیٰ ہو وہ محل تو نہیں یہ
مقتل ہو دلا! رقص کی محفل تو نہیں یہ
وہ پوچھ رہے ہیں کوئی سائل تو نہیں یہ
سنتا تو ذرا، شور عینا دل تو نہیں یہ
تو آپ ہی کہہ دے گا کہ منزل تو نہیں یہ
جس میں تری لیلیٰ ہو وہ محل تو نہیں یہ

چھوڑ میری فکر غافل، رو خود اپنی قید پر
جس کو تو زور پور سمجھتا ہے وہی زنجیر ہے

نہ اڑ جائیں کہیں قیدی قفس کے
گراں ہو اب تو شاید سیر گل بھی
ذرا پر باندھنا صیاد کس کے
کچھ ایسے ہو گئے خوگر قفس کے

قید اور قید بھی تنہائی کی
سو جھٹکایا ہیں ان آنکھوں سے
عقل کو ہم نے کیا نذر جنوں
کر گئی زندہ جاوید ہمیں
کھل کو ہے پھر وہی زنداں جو ہر
تھیک کیا آپ سے سودائی کی
شرم رہ جائے شکبائی کی
شرط تھی قلب کی مینائی کی
عمر بھر میں یہی دانائی کی
تیغ قاتل نے مسجائی کی
ٹھیک کیا آپ سے سودائی کی

دعویٰ توحید کا تو کرتا ہے نفس کو مت خدا بنا لیتا
ہوا دھر بھی کبھی نگاہ کرم ہم غریبوں کی بھی دعا لیتا
ایک ہی جام اور یہ سرستی سا قیادیکھ، میں چلا، لیتا
تم کو زیبا نہ تھا دواع کے وقت آنکھ جو ہرے یوں چرا لیتا

تجھے تسکین دل پایا، تجھے آرام جاں پایا نہاں بھی ہر تو کیا تجھ کو جہاں ٹھونڈا ہاں پایا
ہمیں ہر چیز میں آئی نظر، یارب ادا تیری وہ کیسے ہوں گے جن لوگوں نے تجھ کو نشان پایا
ترا وہ مبتلا نا کام سمجھا جس کو دنیا نے اسی کو سرخرو دیکھا اسی کو کامراں پایا
نہیں معلوم کیا ہو حشر جو ہر کا پرانا ہے کہ ہاں نام محمد مرتے دم در درباں پایا

کبھی جو ہر کے پہلو میں بھی اک نقش نشان تھا پراکی بار جو دیکھا تو یہ نہی سادھواں پایا

عشق ہی باعث کمون جہاں ہے غافل تو نے جانا کہ یہ اک شغل ہر بیکاری کا

جو ہر ساسیہ کا راور انجام شہادت اس سے تو کسی کو بھی نہ تھا اسکا گناہ تک

جیل میں اپنی صاحبزادی آمنہ بیگم کی علالت کی خبر پاتے ہیں، بے بال و پری
کے عالم میں صبا یہ پیام اسیر متعلقین تک پہنچاتی ہے۔
میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجھ سے نہیں تجھ سے میں دور ہی وہ تو مگر دور نہیں

امتحان سخت سہی پڑل مومن ہے وہ کیا جو ہر ایک حال میں امید سے مومن نہیں
ہم کو تقدیر اکہی سے نہ شکوہ نہ گلا اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں
تیری صحت ہیں مطلوب ہے لیکن اسکو نہیں منظور تو پھر ہم کو کبھی منظور نہیں

تمہ | جو ہر کی شاعری کا انتخاب آپ کے سامنے پیش کیا جا چکا، ارباب نظر اور
ماہرین فن سے ایک بزرگ کی رائے ان کی شاعری سے متعلق اور خود جو ہر کا بیان اپنی
شاعری کے محرکات و آغاز پر آپ کے سامنے ہے، اب آپ خود انداز لگا سکتے ہیں کہ جو ہر
کی شاعری کس پایہ کی تھی، آمدان کی شاعری کا طغرائے امتیاز تھا یا آدرہ؟

یہاں انتخاب کلام کے متعلق ایک بات عرض کرنی ہے، یہ کہ انتخاب کلام متفرق
سرخوں میں منقسم کر کے پیش نہیں کیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مقصود یہ تھا کہ ان کا کلام
شروع سے آخر تک جو مدایج اور مراحل طے کر چکا ہے، اور ان کے رنگ میں جس طرح تبدیلی
تغیر ہوا ہے، وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔

دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کی مختصر ضخامت اس کی متحمل نہیں ہو سکی کہ ایک
طویل تبصرہ کے ساتھ ان کا کلام پیش کیا جاسکتا، یہی وجہ ہے جو ان کے انتخاب کلام میں
بھی ایک حد تک بخل سے کام لیا گیا ہے، اور اکثر اشعار ابدار محض قلت گنجائش کی وجہ سے
چھوڑ دینے پڑے۔

انتظامیہ آئڈین میں جس کو ہر اعتبار سے زیادہ مکمل کرنے کی کوشش کی جائے
گی، ان ناگزیر کوتاہیوں کی تلافی بھی کی جائے گی۔

باب ۱

طول نویسی

محمد علی اگرچہ ایک وسیع النظر ادیب، اور زبان و ادب سے خاص دلچسپی رکھنے والی طبیعت کے مالک تھے، اور ان کا طرز انشا بھی اپنے اندر ایک مخصوص اسلوب رکھتا تھا، لیکن بالینہ اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ محمد علی کی تحریر خواہ وہ کتنی ہی دلچسپ اور جاذب قویہ ہو، ضرورت سے کہیں زیادہ طویل ہوتی تھی، مکررات کی تعداد بھی خاصی ہوتی تھی، اور سب سے بڑھ کر ستم یہ تھا کہ گزشتہ روز جو مقالہ انتہائی وہ تحریر فرما چکے ہوتے تھے اسی کو بغیر خفیف ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو کا لم تک پھر بیان کرتے تھے اور اس کے بعد اصل موضوع پر گفتگو کرتے تھے، اور اس میں بھی گفتگو کرتے کرتے وہ دوسرے غیر متعلق لیکن نہایت مفید و کارآمد اور دلچسپ پہلوؤں پر بھی گفتگو کرنے لگتے تھے، جس سے کم صبر پڑنے والوں کو باوجود عقیدت اور دلچسپی کے بعض اوقات تکلیف ہوتی تھی۔

بات بھی کچھ ایسی ہو کہ موضوع چاہے جتنا دلچسپ اور شگفتہ ہو، اور لکھنے والا بھی چاہے جس قدر شوخ اور دلچسپ انداز بیان رکھتا ہو مگر ایک ہی موضوع پر زیادہ طوالت ناظرین کو عاجز کر دیتی ہے، اور پھر محمد علی کا سا غضب کا لکھنے والا کہ لکھنے بیٹھ گئے تو ہمدرد کی باریک کتابت میں ۹، ۸-۸، ۸ کا لم کے مضامین لکھ ڈالے، لیکن کیا محمد علی کا ہمیشہ سے یہی انداز تحریر تھا؟ نہیں! جب پہلے پہل انہوں نے میدان عمل میں قدم رکھا ہے اور ان کی خداداد قابلیت اور ذہانت کا ہر طرف سر

نعرہ تحسین اور مرجا کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا، جس وقت ان کے دلوں نے تازہ تھے اور قوتِ عمل جوان، اس وقت محمد علی کا انداز یہ نہیں تھا اس وقت ان کے مقالات افتتاحیہ اور بیانات معیار عام کے موافق ہوتے تھے، لیکن آخر عمر میں جب وہ زرعہ اعداء میں گھرے ہوئے تھے اور ان کی ہر بات ٹھکرائی جا رہی تھی، ان کے اجاب درفتا ایک ایک کر کے ان سے الگ ہو رہے تھے اور ان کے متبعین اور مریدین ان کی اطاعت سے منہ موڑ رہے تھے، ان کی اچھی سے اچھی بات پر کان نہیں دھرے جاتے تھے اور ان کی پیتر سے بہتر تجویز کی مخالفت ”آزادی رائے“ ”حریت ضمیر“ اور ”عدم تقلید“ کا ثبوت تھی اس وقت ان میں یہ نقص پیدا ہوا اور اس وقت ان کی تحریریں بار نظر ثابت ہونے لگیں۔ محمد علی بھی اپنی طول نگاری کے نقص سے نادانف نہیں تھے۔ وہ خود بھی اسے محسوس کرتے تھے اور نہایت شدت کے ساتھ سمجھتے تھے کہ میں ایک ادبی جرم کا قریب ہو رہا ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مغرور تھے، وہ چاہتے تھے کہ اپنے خیالات و احساسات اور اپنے اعتقادات و نظریات کو قبول کرائیں، کہ ایک ”زعیم“ کی یہی خصوصیت ہوتی ہے، لیکن وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ ان کی مخالفت بھی قدم قدم پر ہوتی تھی، اس لئے مجبوراً وہ طوالت سے کام لیتے تھے تاکہ اپنا مفہوم پڑھنے والے کے دل میں پوری طرح اتار دیں ایک مرتبہ شدتِ تاثر میں اس موضوع پر انھوں نے خود بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو ان کی طرف سے بہترین صفائی ہو سکتی ہے۔

محمد علی کا بیان | ”میرے مضامین کی طوالت کچھ اس باعث ہوتی ہے کہ میں

ملک و ملت ہی کے اور کاموں میں ابھارتا ہوں اور مضمون نگاری کے لئے اتنا وقت نہیں ملتا کہ سوچ کر ایسے الفاظ اور فقرے تلاش کروں جن کو مطلب

بھی ادا ہو جائے اور اختصار بھی ہو جائے، ایک صاحب نے اپنے ایک دوست کو بالکل درست لکھا تھا کہ ”معاف کرنا، خط بہت طویل ہو گیا مختصر لکھنے کے لئے وقت نہیں نکال سکا۔“ جو میری طرح قلم برداشتہ لکھنے پر مجبور ہو وہ بچارہ کیا اختصار کر سکتا ہے؟ لیکن میرے مضامین اور میری تقریروں کی طوالت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ میں چاہتا ہوں اپنے قارئین و سامعین کے دلوں میں بھی وہی خیالات بھر دوں جو میرے دل میں بھرے پڑے ہیں، یہی خواہش مجھے یحییٰ کے کہتی ہے اور ہر وقت خوف و انگیز رہتا ہے کہ شاید ابھی یہ میرا مفہوم نہیں سمجھے، ابھی یہ میرے دلائل و براہین سے قائل نہیں ہو ابھی میرے دلی احساسات نے ان کے دلوں میں وہی احساسات پیدا نہیں کئے انھیں اوجھڑا چھوڑنا جاز نہیں، ورنہ تو ان کو اور لکھ دوں، جو سبق ان کو پڑھانا چاہتا ہوں وہ ابھی انھیں یاد نہیں ہوا ہے، اسے پھر ایک دفعہ آہستہ میں خود ہی زچہ پیر دوں؟ کاش میرے بھائی اسے مان لیں کہ میری ساری طوالت اور میری ساری علالت اسی لئے ہے کہ

من قاش فردش دل صد پارہ خویشم

یہ ہیں محمد علی کی ”طوالت اور علالت“ کے اسباب جنہیں ان کی زندگی میں کسی نے نہیں سمجھا، جو شخص تار پر کامرٹیکا ”لینڈنگ آرٹیکل“ بھیجتا ہو، وہ اتنا وقت کہاں سے نکال سکتا ہے، کہ سکون خاطر اور اطمینان قلب سے ہمدرد کے لئے مضامین لکھے، اور جن کے الفاظ بالکل نپے تلے ہوں؟

باب

رفق و محبت اور جذباتیت

جلوت میں محمد علی کا معائنہ کرو، تو وہ ایک جنگجو، بھرپور کر لڑنے والا، باطل کے لئے صاعقہ موت، اور اشرا صفت احرار کے لئے پیام ہلاکت تھا۔

لیکن اگر خلوت کے آئینہ خانہ میں اس کی تصویر دیکھو تو اپنی آل ادلاد، اپنے اعزاء اقربا، اور اپنے دوست احباب کے ساتھ وہ ایک محبت کرنے والا، ان کی مصیبت پر خود بیقرار ہو جانے والا، ان کی تکلیف کا احساس کرنے والا اور ان کے ہر دکھ درد کا شریک نظر آئے گا۔

وہ ایک سنجیدہ مدبر، وسیع النظر ادیب، بلند آہنگ خطیب، اور سحر نگار انشا پرداز تھا، لیکن جب کبھی تھوڑی دیر کے لئے اس کو یہ موقع مل جاتا کہ وہ سیاسی اور سپاک مشغولیتوں سے الگ ہو کر انہی کچھ ساعتیں بسر کر سکے، تو وہ ایک ہنس مکھ، بچوں کے ساتھ کھیلنے والا، اور زندہ دل آدمی تھا۔

اسے اپنے بھائی سے عشق تھا، اپنی ماں پر وہ پروانہ وار نثار ہوتا تھا، اپنی بچیوں سے اسے دیوانہ وار الفت تھی اور اپنے احباب سے نہایت گہرا تعلق تھا۔

بچوں سے محبت | محمد علی کو چھوٹی عمر کے بچوں خصوصاً بچیوں سے بہت محبت تھی، جہاں ان کے سامنے کوئی بچہ آگیا، بس پھر وہ اپنے بے پناہ جذبہ ہر دم محبت کو ضبط نہیں کر سکتے تھے، اور یہ جذبہ ہر دم محبت ”وطنیت اور ملیت“ کے دائرہ میں محدود نہیں تھا بچے

ہوں، اور محمد علی ہوں، پھر ان کی محبت اور شفقت کا کوئی منظر دیکھ لے!

جامعہ ملیہ کے بچے | محمد علی کو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے جو گہرا تعلق تھا، وہ سب کو معلوم ہے، کوچہ چلیاں سے جب قزو باغ میں انھوں نے قیام فرمایا ہے تو قرب مکانی کے باعث جامعہ اکثر تشریف لاتے تھے اور جامعہ کی ہر تقریب میں وہ شریک ہوتے تھے اور جب کبھی وہ چھوٹے بچوں کے ہوسٹل ”خاکا ر منزل“ میں پہنچ جاتے تھے، تو بس جاتے ہی وہ بھی ”بچہ“ بن جاتے تھے اور فرمایا کرتے کہ کاش اپنے ”سینگ“ لگا کر میں بھی ان ”بچھڑوں“ کے ساتھ شامل ہو جاتا! آخر عمر میں تو اکثر وہ اپنے اس غم کا اظہار فرمایا کرتے تھے کہ وہ سیاسی مشغولیتوں سے قطع نظر کر کے بس جامعہ ہی کے ایک گوشہ میں غزلت گزین ہو جائیں گے، گو موت کے بے درد ہاتھوں نے ان کی یہ تمنا اور جامعہ کی یہ خواہش دیرینہ پوری نہ ہونے دی!

ایک اور واقعہ | مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہ روایت فرماتے ہیں کہ وہ ایک بار محمد علی کے ہاں مقیم تھے، کسی سلسلہ میں نواب اسماعیل خاں بیرسٹریٹ لا موجودہ خازن المسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے متعلقین بھی محمد علی کے ہاں فزوش تھے، کمرہ میں محمد علی بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں نواب صاحب کی چھوٹی بچی آگئی، محمد علی اس کے ساتھ بالکل ”بچہ“ بن گئے اور کمرہ بھر میں کبھی محمد علی دوڑتے تھے تو وہ بچی ان کا پیچھا کرتی تھی اور وہ بچی دوڑتی تھی تو محمد علی اس کا تعاقب، کبھی محمد علی کسی طرف چھپ جاتے تھے، اور وہ بچی انھیں ڈھونڈتی تھی، اور کبھی وہ بچی چھپا چاہتی تھی تو محمد علی اسے پکڑ لیتے تھے، مولانا مدسح فرماتے ہیں کہ بڑی دیر تک یہ دلچسپ سلسلہ جاری رہا۔

بی اماں سے محبت | یہ تو تھا بچوں سے ان کی محبت کا حال لیکن اپنے بھائی، ماں اور دوسرے احباب سے بھی ان کو غایت درجہ کی محبت تھی، میر تقی علی صاحب، مولانا شوکت علی

میر محفوظ علی کا بیان | صاحب کے نام ایک مکتوب میں ضمناً ایک بہت موثر واقعہ لکھتے ہیں،
یعنی جب بی اماں سفر حج سے واپس تشریف لائی ہیں، اس وقت محمد علی کی کیا کیفیت تھی؟
وہ فرماتے ہیں:

”مجھے اب تک یاد ہے کہ جب بی اماں مرحومہ، حج بیت اللہ سے واپس
آ رہی تھیں، اور سببی میں محمد علی ایک لبادہ پوش ضعیفہ کو جہاز سے اتارنے گئے
تھے، تو وارنگلی جنوں کی کیا کیفیت تھی“

مکتوب محمد علی | اتفاقاً ہمیں خود محمد علی کا ایک مکتوب مل گیا، جو میر محفوظ علی کے نام ہے اور
جس میں وہ خود ان الفاظ میں اپنے اثرات بیان کرتے ہیں، یہ مکتوب اس زمانہ کا ہے جب
وہ بڑودہ میں ملازم تھے:

”رمضان گزشتہ سے دل بیت اللہ کی طرف تھا اور نعوذ باللہ من ذلک نہ
اس وجہ سے کہ خدا کا گھر ہے بلکہ اس خیال سے کہ میری ماں وہاں خدا کی جہان
ہے۔ ۳۰ اپریل سے سببی میں تھا، اس سے قبل دوڑا ہوا رامپور گیا تھا کہ
کہیں وطن نہ پہنچ گئی ہو، ہر اپریل کو جہاز آیا، کوئی عاشق اپنی معشوقہ سے
ملنے کے لئے اتنا بیتاب نہ ہوا ہوگا، جس قدر اس ضعیفہ سے میں گلے لپٹنے
کے لئے بیتاب تھا۔“

ایک اور واقعہ | میر محفوظ علی صاحب کے اس بیان سے راقم الحروف کو بھی ایک واقعہ یاد
آگیا، کانپور میں محمد علی نے جب ”علما کا نفرنس“ اور ”موتہر اسلامی“ منعقد کرائی ہے تو ندو
سے راقم سطور بھی اس میں شرکت کے لئے گیا تھا، شوکت صاحب اس زمانہ میں جنوبی افریقہ
میں تشریف رکھتے تھے، لیکن عین انہیں تاریخوں میں وہ ہندوستان واپس تشریف لائے

تھے اور سیدھے کانپور پہنچے تھے، پنڈال میں شوکت صاحب آئے تو محمد علی اتنے عرصہ کی مفارقت کے بعد جس بتیالی، محبت اور جوش کے ساتھ شوکت صاحب سے بغلیں گہرائی میں نہایاں ہو سکتی ہے، یہ ضرور ہے کہ وہ سین دیکھنے والے کی نظر سے اب تک محو نہیں ہوا ہو۔

مولانا عبدالماجد کے ساتھ | مولانا عبدالماجد دریا بادی اپنا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں ایک واقعہ | کہ محمد علی لکھنؤ آئے، راجہ (پھر ہمارا راجہ) صاحب محمود آباد کے

ہاں فرود گئے تھے، مولانا موصوف دریا بادی سے صرف محمد علی کی ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے، ابھی پورے طور پر لطف ملاقات بھی نہ حاصل ہونے پایا تھا کہ مکان سے ایک آدمی آیا، جس نے مولانا کی اہلیہ کی سخت اور خطرناک علالت کی اطلاع دی۔ قدرۃ مولانا مدد و سخت پریشان و مضطرب ہوئے، ہمارا راجہ صاحب محمود آباد اور دوسرے حاضرین مجلس نے مدد و کو بہت کچھ تسلی دی، لیکن محمد علی کا اضطراب مولانا عبدالماجد سے کم نہیں تھا۔ اس خبر وحشت اثر نے محمد علی کی ساری نشاط و مسرت چھین لی، انھوں نے فوراً مولانا عبدالماجد صاحب کو واپس بھیجا اور برابر نقطہ اور تار کے ذریعہ سے ان کی خیریت دریافت کرتے رہے اور جب تک وہ پورے طور سے صحت کی طرف سے مطمئن نہ ہو گئے یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

جذباتیت | جس شخص میں رفق و محبت کا مادہ اس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہو، ظاہر ہے وہ بہت زیادہ سریع الاحساس اور نازک جذبات کا ہوگا، چنانچہ محمد علی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے، ان پر جب جذبات غالب ہوتے تھے تو وہ قابو سے باہر ہو جاتے تھے اور کسی طرح بھی اپنے احساس و جذبات کو چھپا نہیں سکتے تھے، میر مختوم علی صاحب کے معلومات سے اس عنوان کے تحت بھی بہت فائدہ پہنچا، وہ فرماتے ہیں :-

”محمد علی مرحوم بھی جذبات کا مجموعہ تھے، اور اسے خامی کہو یا کٹنگی، وہ اپنے جذبات کو ضبط نہیں کر سکتے تھے میں نے انقباضی اور انبساطی، دونوں حالتوں میں دیکھا مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں جلسہ ہوا، راجہ محمود آباد نرم جماعت کے قائد تھے، اور محمد علی گرم جماعت کے روح رواں مگر صبح کو ان کی رائے میں نرمی آگئی، اس پر الہلال نے ایک مضمون لکھا، جس میں یہ شعر لکھ دیا۔

معشوق ماہ مذہب کس موافق است بامشراب خورد و بزاہد نماز کرد
محمد علی نے یہ مضمون دیکھا تو چونکہ ان کے خیال سے واقعات کو الٹ پھیر کر دکھایا گیا تھا، لہذا انھوں نے عجیب حالت تھی کہنے لگے، محفوظ اس کے جواب میں کوئی شعر بتاؤ، میں نہ شاعر نہ شاعر کے کلام کا حافظ، بھلا ایک منٹ میں شعر کیا بتا سکتا تھا، مگر ان کی حالت دیکھ کر کہہ دیا، اچھا ابھی بتاتا ہوں، اتفاق کی بات سعدی کا ایک شعر ذہن میں آگیا، اگرچہ یہ بکلف مناسب موقع ہو سکتا تھا مگر اس وقت اقصائے مصلحت یہی تھا کہ شعر پڑھ ضرور دیا جائے چنانچہ میں نے کہا۔

بر کف جام شریعت بر کف نال عشق ہر ہوس تاکے ناز جام نال باطن
یا تو وہ حالت تھی کہ غصے میں آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے یا دفعۃً منہ سے پھول جھڑنے لگے، مسکرائے، ہنسنے، تہققہ لگایا، پھڑک اٹھے، اور جوش میں آکر مجھے گود میں اٹھا کر سارے بال میں گھومتے پھرے۔“

ہر کرن ناتھ کے ساتھ ایک اقصاء | اس جگہ بھی راقم الحروف کو ایک واقعہ یاد آگیا، وہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے دلچسپ ہے، یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب آویزش نجد و حجاز کا

مسئلہ بہت زور سے ہندوستان کی اسلامی سیاسیات میں ایک ہنگامہ پیدا کر رہا تھا، محمد علی کو اور ان کے مرشد مولانا عبدالباری مرحوم سے اختلاف شدید رونما ہو چکا تھا، اودھر دوسری طرف ہندو مسلم تعلقات بھی از حد کشیدہ ہوئے تھے اور شدھی سنگٹھن اور تبلیغ و تنظیم میں پورے طور سے ٹکڑ ہو رہی تھی۔

محمد علی ایک جلسہ کے سلسلہ میں لکھنؤ آئے اور چودھری خلیق الزماں صاحب کے دو لکھنؤ خیالی گنج میں مقیم ہوئے، ٹھاکر (راجہ) نواب علی خاں صاحب نے جو محمد علی کے سخت مخالف تھے، فرنگی محل میں ایک جلسہ کر کے محمد علی کو اظہار خیال کی دعوت دی، مولانا عبید الماجد صاحب دریا بادی مدظلہ نے مولانا عبدالرحمن صاحب نگرانی مرحوم کے ذریعہ ندوہ سے دو ایسے طالب علم منگوائے جو نسبتاً تیز دست اور زو و نویس ہوں اس سلسلہ میں مجھے نیالی گنج میں محمد علی کے جائے قیام پر حاضری کا شرف حاصل ہوا، وہ جلسہ تو نہ ہو سکا، مگر کئی گھنٹہ تک محمد علی سے شرف حضوری حاصل رہا، اسی اشار میں لکھنؤ کے مشہور، سابق، سیاسی کارکن، پنڈت ہر کرن ناتھ مصراہیر سٹریٹ لا محمد علی سے ملے تشریف لائے، محمد علی کو چودھری صاحب اور پنڈت جی سے جو احتیاط تھا، اس کی بنا پر وہ بیاحتیاطی سے اور فرمایا ”دیکھو“ مسلم ہندو نما ”آ رہا ہے“ اور جب وہ قریب آ گئے، تو محمد علی بغلیں ہو کر، بے تحاشہ اور مسلسل پنڈت جی کے رخساروں پر اپنی ”صدق و فاء“ کی امان اللہ خاں کے ساتھ | ہر لگاتے ہے، اسی طرح بیٹی میں غازی امان اللہ خاں کے رخسار بھی اس کشمکش کے آماجگاہ بن چکے ہیں!

باب ۱۹

اخلاق و رواداری

محمد علی ان لوگوں میں تھے جو ”معاف“ تو کرتے تھے، لیکن ”بھولتے“ کبھی نہیں تھے، سیاسی زندگی میں بار بار انھیں اپنے عزیز دوستوں اور رفیقوں سے اختلاف کرنا پڑا لیکن ایسا بہت کم ہوا کہ ذاتی تعلقات اور مراسم میں بھی کبھی فرق آیا ہو، اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہو جس میں محمد علی اگر منفرد نہیں تو ممتاز ضرور ہیں۔

سر محمد یعقوب کا بیان | سر محمد یعقوب فرماتے ہیں:

”مجھ سے اور محمد علی سے اگرچہ بعض اوقات پبلک معاملات میں اختلاف رائے بھی ہوتا تھا اور آپس میں خوب ٹوٹک جھونک رہتی تھی، لیکن ان کے اور میرے ذاتی تعلقات اور باہمی معاملات میں کبھی فرق نہیں آیا، اور ملاقاتوں میں وہی گرم جوشی اور بے تکلفی قائم رہی، جو طالب علمی کے زمانہ سے شروع ہوئی تھی۔“

سجاد حیدر سے تعلقات | سید سجاد حیدر صاحب یلدرم سے محمد علی کے نہایت عزیزانہ تعلقات طالب علمی کے آغاز ہی سے تھے اور عجیب بات یہ ہو کہ دونوں کی راہ عمل الگ تھی، جس زمانہ میں محمد علی علی گڑھ کو توڑ کر جامعہ ملیہ قائم کر رہے تھے اور اپنی ”اولڈ بوائز لاج“ سے یہ ٹوک نگیں نکالے جا رہے تھے، اس وقت سجاد حیدر صاحب پرانے کالج کے منار کی طرف سے محمد علی کو ”بجھانے“، تشریف لائے تھے کہ اپنی حرکت سے باز آجائے

لیکن محمد علی تحریک خلافت کے علمبردار ہے، جامعہ ملیہ قائم کی، یونیورسٹی اور رباب یونیورسٹی سے سخت ترین مخالفتیں رہیں، سب کچھ ہوا، لیکن محمد علی اور سجاد حیدر کے مراسم و تعلقات تادمِ مرگ اسی طرح قائم ہے جس طرح علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی میں تھے۔

سٹر جناح کے ساتھ ایک واقعہ غالباً ۱۹۳۷ء میں آنریبل رضا علی کی صدارت میں بمقام بمبئی مسلم لیگ کا جلسہ ہوا تھا، محمد علی اور سٹر جناح بھی اس میں شریک تھے، دورانِ مباحثہ میں ان ”محمد علیین“ میں خوب خوب اختلافات ہوئے، ٹونک جھونک ہوئی طعن و تلویح ہوئی، سب ہی کچھ ہوا، لیکن جب جلسہ ختم ہو گیا تو خود محمد علی اٹھے اور نہایت محبت اور گرمجوشی سے سٹر جناح کو سینہ سے لگایا اور ان کے رخساروں کو بوسہ دیا۔

سٹر داس کا ایک واقعہ سٹری، آرداس نے گاندھی جی کے سیاسی پروگرام ”ترک موالات“ سے ناگپور میں سخت اختلاف کیا تو طرح طرح کے اثرات ان پر ڈالے گئے لیکن محمد علی نے اپنے تعلقات و توقعات کی بنا پر داس کو نہ صرف پروگرام کے قبول کر لینے پر مجبور کیا بلکہ اس پر بھی سخت اصرار کیا کہ وہ اپنی پکٹیں ترک کر دیں، داس ان دونوں شقوں سے اختلاف رکھتے تھے، داس کے اور محمد علی کے دوستوں نے بھی محمد علی کو بھجایا کہ وہ داس کو ترک و کالت پر مجبور نہ کریں، لیکن محمد علی اپنی طے کی ہوئی بات سے کب باز آنے والے تھے، آخر کار محمد علی کا خود بیان ہے کہ:

”ایک شب کو رات کے تین بجے کے قریب حیب میں جہا تا جی کے پاس سے داس کے پاس آیا تو داس نے مجھے علیحدہ لہجا کر کہا ”محمد علی تمھاری رائے ٹھیک تھی میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ بیرسٹری ترک کر دوں جس وقت داس نے مجھے اپنا یہ فیصلہ سنایا، میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کس قدر مسرت ہوئی

میں اُس وقت داس سے لپٹ گیا، اور اس کے گالوں کو بار بار بو سے دیتا رہا۔

ایک دلچسپ ”مقابلہ“ | محمد علی ارباب علیگڑھ کی آنکھوں میں ہمیشہ کھلے، ان کی آزادی رائے اور حریت ضمیر وہ چیز تھی جس نے بہتوں کو ان کا دشمن بنا دیا تھا لیکن محمد علی ان باتوں سے آزر وہ خاطر کبھی نہیں ہوئے بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے انھوں نے اس قسم کی تمام مخالفتوں کا مقابلہ کیا۔

اسی قسم کا ایک دلچسپ مقابلہ یہ ہو کہ علیگڑھ کی ٹرسٹی شپ کے لئے محمد علی کا نام پیش ہوا، ارباب کالج نے مخالفت کی، علیگڑھ کے انگریز اسٹاف نے مخالفت کی اور قریب یہ ہو کہ کالج کے سکریٹری نواب اسحق خاں مرحوم نے مخالفت کی، اور ان کے بجائے میجر سید حسین بلگرامی کا نام پیش کر دیا گیا۔

پہلے تو محمد علی پر یہ زور ڈلوا یا گیا کہ وہ میجر بلگرامی جیسی صاحب علم و فضل شخصیت کے مقابلہ میں خود ہی دست بردار ہو جائیں لیکن محمد علی نے صاف انکار کر دیا۔

اب دوسری زبردست ترکیب یہ چلی گئی کہ ہر ہائٹس نواب سر حامد علی خاں مرحوم والی راپور سے زور ڈلوا یا گیا کہ محمد علی اس مقابلہ کے لئے نہ کھڑے ہوں، چنانچہ ایک روز ہر ہائٹس نے نواب اسحق خاں، شوکت صاحب اور بعض دوسرے لوگوں کی موجودگی میں اس کا تذکرہ کیا اور اپنی خواہش ظاہر کی کہ محمد علی مقابلہ نہ کریں تو اچھا ہے، لیکن اب محمد علی کو اور اصرار ہو گیا اور وہ کسی طرح بھی ”دستبردار می“ پر راضی نہیں ہوئے نتیجہ یہ ہوا کہ مقابلہ ہوا اور نہایت دلچسپ و کامیاب! فیصلہ یہ ہوا کہ محمد علی ممبر منتخب ہوئے لیکن اب محمد علی کی بلندی اخلاق، وسعت ظرف اور علوئے ہمت ملاحظہ ہو

کہ کامیابی کے بعد وہ خود میجر بلگرامی کے علم و فضل کے مقابلہ میں مستغنی ہو گئے اور اپنی جگہ ان کے لئے خالی کر دی۔

یہ تھا محمد علی کا کردار، یہ تھی محمد علی کی رواداری!

لاجپت رائے سے | محمد علی کو اپنی زندگی میں کتنا سخت و شدید اختلاف رہا، اس سے ہر اخباریں شخص واقف ہے لیکن بایں ہمہ لاجپت رائے کی خوبیوں کا اعتراف بھی ہمیشہ فرماتے رہے۔

سائنس کیشن کے سلسلہ میں لاجپت رائے نے اسبلی میں (۱۸۷۷ء) ایک مدلل زبردست اور دلنشین تقریر کی تھی جس میں ہندو مسلم اختلافات کی ساری ذمہ داری گورنمنٹ پر ڈالی تھی محمد علی کو انکی تقریر اتنی پسند آئی کہ انھوں نے ہندو میں کئی مقالات اس موضوع پر سپرد قلم فرمائے اور لالہ جی کی تقریر کی دل کھول کر تعریف و توصیف اور مدح و ستائش کی۔

۱۸۷۷ء میں سائنس کیشن کی آمد کے سلسلہ میں لاجپت رائے لاہور میں پولیس کے ہاتھوں لاٹھیاں کھا کر کچھ عرصہ کے بعد وفات پا گئے۔ محمد علی اس زمانہ میں بعض علاج یورپ گئے ہوئے تھے لیکن واپس آتے ہی انھوں نے ہندوستان جو سب سے پہلا بیان دیا تھا اس میں انھوں نے لاجپت رائے کی وفات کو قابل رشک بتایا، اور اپنے لئے تنہا کی کہکاش ایسی سعادت انھیں بھی حاصل ہوئی۔

مالومی جی کا واقعہ | مالومی جی کی ہما سبھائی ذہنیت کا محمد علی نے ہمیشہ تم کیا، اور اپنی ان کی راہ عمل ایک نئے کے باوجود جب کبھی ان کے اور ان کے مقاصد میں تضادم ہوا، تو انھوں نے سخت سے سخت مخالفت کی اور کبھی کوئی رعایت نہیں کی، لیکن سائنس کیشن کی آمد کے سلسلہ میں جب مالومی جی جیسے معتدل بزرگ بھی اس کے مخالف رہے اور مدر اس

کانگریس میں انھوں نے ایک موثر اور دلگداز تقریر کی اور گورنمنٹ کی پالیسی ”لٹراؤ اور حکومت کرو“ کی تشریح کی، اور اپنی بے بسی کا اظہار کیا کہ ہم ہندوستانی کس طرح ”اشاروں“ پر ناچ رہے ہیں، محمد علی کو مالوی جی کی یہ دلگداز تقریر بہت مرغوب خاطر ہوئی اور انھوں نے مالوی جی کے قدم لے لئے اور اپنی تقریر میں فرمایا کہ اگر مالوی جی نے اپنی سچی ذہنیت کا اظہار کیا ہے تو حضرات! سائمن کمیشن کو آنے دیجئے ہیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے جس طرح مصر میں ملز کمیشن سے کہہ دیا گیا تھا کہ جو کچھ پوچھنا ہو مسجد پاشا ز اغلول سے پوچھو، اسی طرح ہم بھی کہیں گے کہ ہم کچھ نہیں جانتے، اقلیتوں کے امین مالوی جی ہیں، جو کچھ ہواں سوچو۔“

سر عبد القیوم کا واقعہ | ساردا بل کے سلسلہ میں محمد علی سے اور سر عبد القیوم و مسٹر جناح سے ایک موقع پر مباحثہ ہونے لگا، رمضان کا زمانہ تھا، تھوڑی دیر کے بعد دو گری بجٹ، نے دوسری صورت اختیار کر لی، لیکن خیر تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ تندی و ترشی ختم ہو گئی لیکن محمد علی کے دل پر اس کا اثر نہیں ہوا وہ مسٹر جناح اور سر عبد القیوم سے حسب سابق ملتے رہے اور اپنے تعلقات میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیا۔

یہ تھا، محمد علی کے اخلاق و رواداری کا ایک دھندلا سامرغ!

باب ۲۰

ایشیار و استغفار

محمد علی کی پرورش اگرچہ ناز و نعم میں ہوئی، اور ان کا ماحول ہمیشہ ایسا رہا جس میں روپیہ کی پرورش ہوتی تھی اور خود ان کی طبیعت بھی کسب زر سے نفور نہیں تھی، لیکن پھر بھی ان کی طبیعت میں شاپانہ استغنا اور غیر معمولی ایشیاری و سیرچی کا جو ہر منظر تھا۔

آکسفورڈ کے ”آنرز میں گریجویٹ“ کو دنیاوی دلفریبیوں نے قدم قدم بھجایا اور سیم و زر کے انباروں نے ان کے قدموں کو چھوا، لیکن دل اتنا مستغنی تھا، طبیعت میں ایشیاری کا ایسا مادہ تھا کہ کبھی بھی اس کی پردا نہیں کی، اگر انھیں صرف روپیہ کی ہوس ہوتی تو بڑا ودھ سے وہ مستغنی نہ ہوتے، راجپوت کی ملازمت نہ ترک کرتے، جاؤ رہ کی وزارت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے، بھوپال کی چیف سکرٹری شب اپنے قبضہ میں رکھتے یا پھر سرکاری مناصب میں سے کسی رتبہ بلند پر سرفراز ہوتے۔

لیکن طبیعت کو ان چیزوں سے کوئی ایسا لگاؤ نہیں تھا کہ ان کی خاطر وہ اسی گور و ہندے میں پھنس جاتے، اور ملک و قوم کی جو خدمت ان سے بن آنے والی تھی اسے نذر تغافل کر دیتے۔

انھوں نے ایسا نہیں کیا، روپیہ کی انھیں ہمیشہ ضرورت رہی، مصارف ان کے ہمیشہ بڑھے چڑھے، آمد و خرچ کا توازن وہ کبھی نہیں قائم کر سکے، اس لئے انھوں نے سر آغا خاں سے امداد بھی لی، اور ہمارا راجہ صاحب محمود آباد سے بھی، ہمارا راجہ الور سے

بھی، اور سیٹھ عبداللہ ہارون سے بھی اپنی ضروریات کے لئے ان کا دست سوال سہیہ
 دراز رہا، لیکن استغناء و اثبار کا یہ عالم تھا کہ آغا خاں سے اختلاف شدید کیا اور ان کی اعانت
 سے محروم ہو گئے، ہمارا جہ محمود آباد سے جب ان کی رائے طمکرائی، انھوں نے بلاتوں
 ان کی مخالفت کی اور بالآخر انھوں نے بھی اپنا دست اعانت کھینچ لیا، ڈاکٹر انصاری نے
 بہت زیادہ محمد علی کی مدد کی، لیکن جب حق و ضمیر کا معاملہ آن پڑا تو محمد علی سے زیادہ اصول
 کے معاملہ میں ڈاکٹر انصاری کی مخالفت دائرہ انسانیت میں رہ کر کسی سے نہیں کی، محمد علی
 ہمیشہ فقیر رہے لیکن لکھ لٹ بھی ہے، ہمیشہ حاجتمند رہے لیکن سبب نیاز بھی رہے یعنی وہ
 رائے فروش کبھی نہیں رہے، گو ان کا دست سوال ہمیشہ اجاب و شناسا کے سلسلے میں دراز رہا۔
 اور انسان کے کردار کا یہی زور دار پہلو ہے کہ وہ حاجتمند ہو، اپنی ضروریات کے
 لئے دوسروں سے طالب اعانت ہو، لیکن اصول کے معاملہ میں کبھی ان باتوں کی پروا
 نہ کرے اور مردانہ دار اپنے اختلافات کا اظہار کر دے۔
 محمد علی کی سیرت اسی اصول کا ایک نمونہ تھی۔

بیگم غلام حسین سے سلوک | راجہ غلام حسین محمد علی کے دست راست تھے، کامیڈ کی
 ترقی اور شہرت میں راجہ مرحوم کی کوششیں کسی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتیں، اپنے
 ایسے عزیز رفیق کا رے محمد علی کو محبت بھی بہت زیادہ تھی، چنانچہ ایک اتفاقی حادثہ
 سے راجہ غلام حسین کا انتقال ہوا تو محمد علی نے ان کی یاد میں نہایت درد انگیز اور
 موثر مرثیہ لکھا، اور جب نظر بندی سے رہا ہوئے نظر بندی کے زمانہ میں کافی تفصیل
 اٹھا چکے تھے، اور تمام کاروبار تباہ ہو گیا تھا لیکن بیگم غلام حسین کی اعانت سے وہ کیسے
 باز رہ سکتے تھے، چنانچہ اپنی تہیہ دستی اور پریشان حالی کے باوجود بیگم غلام حسین کو پانچ سو

کی رقم اور ایک مشین پریس عطا فرمائی، اس پر ایک شخص نے اعتراض بھی کیا لیکن وہ کب باز رہ سکتے تھے؟

زمیندار کی امداد | ہندوستان کے اخبارات میں ”زمیندار“ نے قوم و ملک کی راہیں جن شدائد و مصائب کا مقابلہ کیا ہو اور جس حیرت انگیز استقامت اور استقلال کا ثبوت دیا ہے وہ ہر شخص متاثر ہے، محمد علی کو اس کی پالیسی اور اس کے اذاز صفاقت سے ہمیشہ شہداء اختلاف رہا۔ لیکن انھوں نے اس کے مصائب و فوائب پر کبھی خندہ نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ اس کی اعانت کی، اس کے لئے چندہ جمع کیا اور خود اپنی مفلس اور قلاش حبیب سے بھی جو کچھ ہو سکا مدد کی۔

خلافت کیٹی کا سب سے پہلا چندہ | محمد علی جس وقت نظر بند کئے گئے ہیں اور پوسے پانچ سال تک انھوں نے یہ ایام محن اسی قید میں بسر کئے ہیں، اس وقت گورنمنٹ ہند کی طرف سے انھیں ڈھائی سو کی حقیر رقم ملتی تھی اور چند دائرہ میں محمد علی مع اپنے پوسے خاندان کے مقیم تھے، ظاہر ہے کہ یہ مختصر رقم اتنے وسیع کنبہ کے لئے کیونکر کافی ہو سکتی تھی، ذرائع آمدنی بالکل سدود تھے، ہمدرد کامرڈ بند کر دئے گئے تھے، پریس سے ضمانت طلب ہو چکی تھی، اور کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی نہیں تھا، مجبوراً قرض سے کام چلایا گیا، پھر مراد آباد میں جو جاگیر تھی رفتہ رفتہ وہ ختم ہو گئی، غرض ان مصائب کے ساتھ محمد علی نے اپنے ایام نظر بندی ختم کئے، اور جب وہ رہا ہوئے ہیں تو روٹی کو محتاج تھے، قرض میں بال بال بندھا ہوا تھا، دہلی کے مکان کا کرایہ بھی برسوں سے ادا نہیں ہوا تھا، ہر طرح کی مصیبت اور پریشانی کا سامنا تھا۔

جب رہا ہوئے تو قوم نے ان کی عزت افزائی بھی کی اور ان کے نقصانات کی

تلافی بھی کرنا چاہی، یعنی ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجل خاں مرحوم کی کوششوں اور دوسرے بہادر دان خلافت کی سرگرمیوں سے ایک رقم خطیر جمع ہو گئی اور طے کیا گیا کہ جب علی بردران دہلی آئیں تو وہ رقم ان کی خدمت میں پیش کر دی جائے تاکہ وہ اس سے اپنا فرض ادا کر سکیں اور اپنا کام چلا سکیں۔

چنانچہ جب وہ دہلی پہنچے تو یہاں ان کا نہایت عظیم المثال شاہانہ استقبال ہوا اور ایک ہزار اشرفیوں کا ہار ان کے گٹھے میں ڈالا گیا، لیکن ایثار، استغناء، توکل اور سیرشتی کا یہ عظیم نظیر غور نہ دیکھنا! کہ اس گدے بے نوا نے اسی وقت اشرفیوں کے اس ہار کو سترہ ہزار میں فروخت کیا اور اسی سلسلہ میں دوسری جو رقمیں جمع ہوئی تھیں انہیں جمع کیا کل اتیس ہزار کی گراں قدر رقم ہوئی جس میں سے ایک پانی بھی نہیں لی اور وہ سب کی سب خلافت فتنہ میں داخل کر دی گئی، یہ خلافت کمیٹی کا سب سے پہلا چندہ تھا! جو دو فاقہ مست لیکن دریا دل بے نواؤں کی طرف سے پیش کیا گیا تھا!

چاندی کا سٹ | اسی طرح غالباً حیدرآباد میں ایک موقع پر ایک قدر دان اور عزیز نے ”ایک نہایت قیمتی، بھاری چاندی کا نہایت خوبصورت چار کا سٹ، مع چاندی کی چائے کی پیالیوں کے پیش کیا، مگر جس کو اب جام سفال نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہو، وہ چاندی کے برتنوں میں چار کس طرح پی سکتا تھا، اس لئے وہ خلافت کو دیدیا گیا۔“ یہ تھا محمد علی کی سیرشتی اور دریا دلی کا ایک معمولی سا نمونہ

ندوہ کو چندہ دینا | کانپور میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ حکیم اجل خاں مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوا، اپنی خصوصیت کے اعتبار سے وہ عجیب و غریب جلسہ تھا ایک طرف تو اس میں بڑے بڑے سیاسی زعماء، مثلاً ظفر علی خاں صاحب، ڈاکٹر کچلو ہسرت

موبائی وغیرہ موجود تھے دوسری طرف علماء و فضلا کی ایک خاصی جماعت بھی رونق افروز تھیں
تھی، مثلاً حکیم اجل خاں قاری شاہ سلیمان پھلواری وغیرہ تیسری طرف اس میں حامیان
تعاون کی بھی ایک خاصی جماعت موجود تھی، مثلاً حافظ ہدایت حسین صاحب ممبر گول میز کانفرنس
سر رحیم بخش، اس ”مجموعہ اضاء“ میں محمد علی کی شخصیت سب سے نمایاں تھی!

دوسرے دن حیب عام چندہ شروع ہوا تو صاحب قدرت لوگوں نے یا تو چندہ
دنیا شروع کیا اور یا اعلان کرنا شروع کیا، سب سے پہلے تو محمد علی نے اپنے مخصوص عقیدت مندوں
سے جبراً چندہ کا اعلان کرایا اور پھر اپنی بے بضاعتی اور بے توانی کے باوجود غالباً ڈیڑھ سو
روپیہ سالانہ چندہ کا اعلان فرمایا۔

ایک اور واقعہ | ۱۹۴۷ء میں جب محمد علی عازم انگلستان ہوئے ہیں، اس زمانہ میں
مسٹر سر دجینی ٹاڈ بھی وہیں تشریف رکھتی تھیں، لندن میں مسٹر سکلا تو ال کی کوششوں سے
ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں سائنس کمیشن کے تقرر پر مسٹر سر دجینی ٹاڈ و ادر محمد علی نے ولولہ انگیز تقریریں
کیں اور ہندوستانی مسائل و معاملات پر گورنمنٹ کے اس غیر مدبرانہ اور ایک اخبار کی زبان
پر مضبوط اور طرز عمل پر سخت نکتہ چینی کی، اسی وقت اسی جلسہ میں ایک انجن کی تشکیل بھی ہوئی
جس کا مقصد یہ قرار پایا کہ وہ ہندوستان کے نقطہ نظر اور برطانوی ہوس استعمار کے متعلق پیکٹ
کرے۔

محمد علی اگرچہ دوسرے کے خراج پر ولایت اپنا اعلان کرانے گئے تھے، لیکن اس قہر
پر ان کا فیاض دل بھی متاثر ہوا اور انھوں نے ایک خاصی رقم چندہ میں عطا فرمائی۔

باب ۲۱

رائے عامہ پر رائے

رائے عامہ پر نظریہ | محمد علی عقیدہ جمہوری خیال کے آدمی تھے، ملوکیت اور استبداد کے انھیں قطعی نفرت تھی، خود اپنی ذات کے لئے بھی وہ یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ محض ان کی شخصیت سے مرعوب ہو کر ان کی ہاں میں ہاں ملا دی جائے !

وہ جمہور کو آزاد خیال بنانا چاہتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ جمہور میں حریت رائے اور آزادی ضمیر کے جذبات پیدا ہوں، لوگ خود معاملات کی حقیقت و اصلیت اور اسباب و علل پر غور کرنا سیکھیں اور پھر خود ہی اپنے دماغ کی ہدایت اور اپنے ضمیر کی رہنمائی میں رائے دیں !

یہی وجہ ہو کہ محمد علی نے کبھی اپنی شخصیت کا واسطہ دلا کر لوگوں سے رائے نہیں حاصل کی، نہ اپنی مرعوب کن شخصیت کو بیچ میں ڈال کر لوگوں سے اپنی حمایت میں رائے لینا چاہی، وہ چاہتے تھے کہ لوگ سحر کاری سے مرعوب و متاثر نہ کئے جائیں بلکہ ان میں پختہ کاری کے عناصر ہوں، کہ ملک و قوم کی ترقی کے لئے یہ از بس ضروری ہے۔

لاہور کا ایک واقعہ | نجد و حجاز کی ہنگامہ آرائیوں کے زمانہ میں محمد علی کو بار بار التجائیں کر کر کے لاہور طلب کیا گیا، اس لئے کہ وہاں کے احرار اس صورت حال پر قانع نہیں پاسکے تھے جو وہاں کے خوش عقیدہ حضرات نے پیدا کر دی تھی، پھر نئی خبروں سے اور زیادہ عوام کو سلطان ابن سعود سے متعلق گمراہ کیا جاتا تھا کہ آج قبہ خضر پر حملہ ہوا چاہتا ہے، اور راج

فلاں بزرگ کی قبر سمار کر دی گئی اور آج ”حضرت“ ابو طالب کا مزار کھود کر کھینک دیا گیا! ان حالات میں مولنا طفر علی خاں صاحب نے انھیں لاہور طلب کیا، محمد علی گئے حاجہ کی شرکت کے لئے مولنا احمد سعید صاحب اور مولنا عطار اللہ شاہ بخاری بھی پہنچ گئے تھے، محمد علی، طفر علی خاں صاحب کے ہاں فروکش ہوئے اور انھیں کی صدارت میں جلسہ کیا گیا۔

مولنا احمد سعید کی تقریر | حالات حاضرہ پر مولنا احمد سعید صاحب نے ایک تقریر کی جو اپنے انداز کے اعتبار سے بہت پسند کی گئی۔

بخاری صاحب کی تقریر | پھر پنجاب کے مشہور خطیب مولنا عطار اللہ شاہ بخاری نے اپنی پوری شان خطابت سے تقریر کی، ان کی تقریر کیا تھی، سحر و اعجاز تھی، تمام مجمع گوش بر آواز تھا، اور یا تو مخالفت ہو رہی تھی یا موافقت ہونے لگی کہاں ”غالب کے پرے اڑنے کی خبر گرم تھی“ اور کہاں ایک دوسرا ہی ”تاشہ“ ہونے لگا۔

محمد علی اس کامیابی سے بہت مسرور ہوئے کہ مخالفت کے اس شدید اندیشہ کے باوجود نہ صرف یہ کہ مخالفت نہیں ہوئی بلکہ صدارت احمد سعید صاحب کی خطابت اور سب سے بڑھ کر عطار اللہ شاہ کی سحر کاری نے یہ رنگ پیدا کر دیا کہ مجمع مٹھی میں آگیا، لیکن اس واقعہ سے محمد علی کو اپنی ”کامیابی“ کا یقین نہیں آیا

محمد علی کا ”دعظ“ | انھوں نے بخاری صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا:

”بھائی! میں تمہاری تقریر سے بہت خوش ہوا تم نے سامعین کو بالکل مسحور کر دیا تھا، اگر اس کے بعد تم ان سے کوئی غلط کام بھی کرنا چاہتے تو وہ فوراً کر بیٹھے، جو قدرت تم کو اپنی زبان پر ہے وہ خدا داد ہے اور خدا کی ایک بڑی نعمت ہے، مگر ایک بڑی خطرناک نعمت ہے اور تمہاری مسئولیت اس کے

باعث اور بڑگنی ہے جب تک تم اسے حق کی راہ میں استعمال کر دے، فلاح
دارین حاصل کر دے لیکن اگر کبھی یہ باطل کی راہ میں استعمال کی گئی تو ہزاروں
بندگان خدا کے گمراہ کرنے کے لئے بھی کافی ہوگی لوگوں کا مسح کرنا اچھا
نہیں، مسح کا رمی میں نہ ساحروں کے لئے نہ مسحوروں کے لئے فلاح ہے ضرور
اس کی ہر کہ ہر مسئلہ کے دونوں پہلو سامعین کے سامنے پیش کر دو، اور انہیں سے
اس کا حل اور فیصلہ کراؤ، اس طرح تم عوام کی قوت فیصلہ کو ترقی دے سکو گے
ورنہ عوام کا لانا عام مشہور ہیں، آج تم نے انہیں مسح کر دیا تو کل اسی چرب
زبانی اور ظرافت کے باعث ان پر کسی دوسرے کا جادو بھی چل سکے گا اور
اس طرح انہیں حق و باطل کی تمیز تاقیامت نہ آئے گی، کبھی تمہارے ساتھ
ہوں گے کبھی تمہارے مخالفین کے، آج تم کو تخت پر بٹھائیں گے، کل تمہیں
اتار کر دوسرے کو سریر آرا بنا دیں گے۔“

راے عامہ پر محمد علی کے یہ خیالات ہر زعمیم قوم اور سالک راہ قیادت کے لئے ہمیشہ
شمع ہدایت کا کام دیں گے۔

باب ۲۲

مایوسی

آخری ایام حیات میں محمد علی بہت زیادہ مایوس ہو گئے تھے، وہ جانتے تھے کہ آج ان کی بات سنی نہیں جا رہی ہے، کل تک جو لوگ محمد علی کے لئے فرش راہ ہوتے تھے، وہی آج تیز و تند نظروں سے دیکھ رہے ہیں، کل جو لوگ محمد علی کی قیادت کے گن گایا کرتے تھے، آج وہ اپنے تئیں خود سب سے بڑا لیڈر سمجھ رہے ہیں، کل جن لوگوں کی زبان محمد علی کے ذہن و دماغ، زبان و قلم اور جوہر قیادت کے بیان میں تر ہو رہی تھی، آج انھیں کے نزدیک محمد علی کی آواز بالکل بے وقعت تھی، کل تک علی برادران کی عقیدتمندی اور پیروی رونق عام کے ”فیض“ میں داخل تھی لیکن، انقلاب دہر دیکھے! آج ان کی مخالفت، حریت ضمیر کا سب سے بڑا ثبوت تھی۔

ایک زعیم کے لئے یہ حالات حد درجہ حوصلہ شکن اور ہوش ربا ہوتے ہیں اس کی توجہ فہم منکر زائل ہو جاتی ہے۔ وہ ”مایوس“ ہو کر غلت گزین ہو جاتا ہے یا کم از کم اپنی زبان پر ہر سکوت لگا لیتا ہے۔

لیکن محمد علی اس کلیہ سے بھی مستثنیٰ تھے، انھیں اگرچہ اس کا احساس تھا کہ اب ان کی قدر کم ہو گئی ہے اور لوگ ان کی ہر طرح سے مخالفت کر رہے ہیں لیکن پھر بھی اپنی قوت عمل پر انھوں نے تعطل کبھی نہیں طاری کیا، اور برابر سرگرم جہد و عمل رہے تا انکہ موت کے زبردست ہاتھ نے ان کی سرگرمی کا رکنا خاتمہ کر دیا۔

محمد علی کا بیان | ایک موقع پر محمد علی نے خود ان ناسازگارا اور دل شکن حالات کا اعتراف کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

”مجھ سے زیادہ اسے کوئی محسوس نہیں کرتا کہ ہندوستان میں میرے ہم خیال بہت کم ہیں اور جو میرے ہم خیال ہیں بھی وہ بھی علما میرے ساتھ تعاون کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کچھ میرے لئے دعا کر لیا کرتے ہیں، زیادہ تر لاپرواہ ہیں جو میرے ہم خیال نہیں وہ خود تو اس کی کیا معذرت کرتے کہ کیوں ہم خیال نہیں ہیں، لیکن طرفہ تریہ کہ الٹی مجھ سے شکایت کرتے ہیں کہ تو ہمارا ہم خیال کیوں نہیں ہو؟ اور جس چیز کو اپنے لئے استقامت اور آزادی رہے کے نام دیتے ہیں میرے لئے اسی چیز کو صدا اور خود رانی کے لقب عطا فرماتے ہیں۔“

ایک دوسرا بیان | فتنہ راجپال کے زمانہ میں محمد علی کی پنجاب نے بہت سخت مخالفت کی تھی، لیکن محمد علی کے حامیوں نے لاہور میں ایک جلسہ محمد علی کی صدارت میں کرنا چاہا محمد علی آمادہ بھی ہو گئے، ایک صاحب نے محمد علی کی روش پر نکتہ چینی کرتے ہوئے انھیں چندا ہم ”مشوے“ دے کہ یہ کام کیجئے گا اور وہ کام نہ کیجئے گا، اس کی حمایت کیجئے گا، اس کی مخالفت کیجئے گا، اس کے ہاں جائے گا اور اس سے ملنے گا بھی نہیں۔

محمد علی نے اس ”ہدایت نامہ“ کو اپنے اخبار میں شائع کر دیا، اور جب ذیل رہے کا اظہار کیا۔

”ملاحظہ ہو کہ یہ خط ایک ایسے شخص کا لکھا ہوا ہے کہ جو مجھے ”محترم“ بھی کہتا ہے اور اپنے تئیں میرا ”عقیدہ مند“ بھی ظاہر کرتا ہے، لیکن سارا خط ایسا ہے کہ

مجھ سے کاتب کے ”احترام“ کا پرزور مطالبہ کرتا ہی اور مجھے اس کا ”عقیدہ“ بنانے پر مصر ہے ”احکام عشرہ ربانی“ کے انداز میں میرے لئے احکام صا فرمائے گئے ہیں کہ یہ ضرور کرنا اور یہ ہرگز نہ کرنا یہی وہ نیم حکیم خطرہ جان ”او نیم ملاحظہ ایمان“ ہیں جو آج مسلمانوں اور ہندوؤں کو گمراہ کر رہے ہیں یہی تعلیم یافتہ حضرات ہیں جو اپنے زعم باطل کے باعث ”پبلک“ بن بیٹھے ہیں اور خادمان ملک و ملت کو دبانا، ڈرانا، دھمکانا اور لالچ دلانا چاہتے ہیں، ان کو راضی کر لیجئے پھر آپ کی ”لیڈری“ مسلم، یہ اور ان کے بنائے ہوئے ”لیڈر“ ہی وہ لوگ ہیں جن کی شان میں آیہ ہے کہ ”پیران نرمی پرند مریداں می پرانند“ میں ایسی پیری سے باز آیا، اور ایسے مریدوں کو دور ہی سے سلام کہتا ہوں“

مدیر انقلاب کی روایت | انقلاب کے مدیر روایت فرماتے ہیں کہ:

”محمد علی نے دہلی میں ایک دوست سے دوران گفتگو میں فرمایا تھا کہ ان فوس مسلمانوں نے میری قدر نہ کی ہندوستان کے مسلمان زندہ پرست نہیں، مردہ پرست ہیں، جب میں مر جاؤں گا تو یاد کریں گے، مگر میں بھی ان سرتنگ آیا ہوا ہوں کہ ہندوستان میں مرنے ہی کا نہیں، خدا کرے کہ مجھے ہندوستان میں موت ہی نہ آئے“

سطور بالا سے یہ عبرتناک حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ محمد علی اپنی قوم سے کس قدر مایوس ہو گئے تھے اور ان کی آخری زندگی کس قدر تلخ گزری کہ نہ دوستوں اور عزیزوں کی کوئی جماعت خاص رہ گئی تھی جس پر اعتماد کیا جاسکتا، اور نہ متبعین اور متعقدین کا کوئی ایسا گروہ

رہ گیا تھا جوان کے بتائے ہوئے لائحہ عمل اور ان کی پیش کی ہوئی تجویزوں کو قبولیت اور عمل کا جامہ پہناتا۔

لیکن محمد علی کا یہ کردار بھی عجیب و غریب ہے کہ بایوس ہو جانے کے باوجود وہ اپنے زیر خدمات سے دستکش نہیں ہوئے، امان اللہ خاں کا یہ شعر محمد علی پر کتنا صادق آتا ہے
اے قوم گرچہ سنگ جہا برو لم زدید ایں شیشہ شکستہ ہنوز از زونفا پرست

باب ۲۳

ہندوؤں سے دل برداشتگی کے اسباب

وفات سے کچھ عرصہ پیشتر محمد علی کانگریس کے مخالف ہو گئے تھے، اور ان کا حکم مسلمانوں کو یہ تھا کہ وہ کانگریس کی سرگرمیوں میں قطعاً کوئی حصہ نہ لیں۔

بہ ظاہر یہ بہت تعجب خیز بات ہو کہ محمد علی کانگریس اور ہندوؤں سے برداشتہ کیوں ہوئے، ان کی ساری سیاسی جدوجہد کا ایک خاص مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کو نہجہ اُغیار سے نجات دلا سکے اور پھر اس طرح بالواسطہ سائے عالم سے انگریزوں کی ہیڈیمت اور آستانہ کا خاتمہ کر دیں۔ پھر انھوں نے اپنے مقصد کے خلاف کانگریس سے جنگ کیسے کی؟ اور کسی نہ کسی حد تک انگریزوں کی امات کیونکر ان سے کی گئی۔

جو لوگ مغز حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے یا نہیں پہنچنا چاہتے ان کا فیصلہ تو یہ ہوتا ہے کہ انھیں موتی لال وغیرہ سے دشمنی تھی، اس لئے وہ کانگریس کے مخالف ہو گئے!

دعویٰ جتنا دھچپ ہو دلیل اس سے کہیں زیادہ پرلطف!

اصل واقعہ تحقیق سے تامل اور فکر کے بعد معلوم کر لیا جاسکتا ہے، محمد علی کانگریس میں اس وقت تک شریک رہے اور اپنے بے پناہ جذبہ عمل اور غیر معمولی شخصی اثرات کے ساتھ شریک رہے جب تک وہ اسے ”انڈین نیشنل کانگریس“ سمجھتے رہے اور اپنی اس وفاداری پر انھوں نے اتنی استقامت کا ثبوت دیا کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے، غور کی بات ہو کہ وہ کانگریس میں اس وقت تو شریک رہے جب اس کی ”سربازاری“

شروع ہو گئی تھی، اور تحریک شدہ شیٹھن اور تبلیغ تنظیم نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو کانگریس سے بیزار اور متنفر کر دیا تھا اور علیحدہ کس وقت ہوئے؟ جب اس کی ”گر می بازار“ پھر عود کر آئی تھی، اور بہت سے گوشہ نشین افراد پھر قومیت کے روپ اور کھد کے لباس میں اسٹیج پر نظر آنے لگے تھے۔

جب انھوں نے انتہائے خلوص اور نیک نیتی سے یہ سمجھا کہ یہ کانگریس اب، ”انڈین نیشنل“، نہیں بلکہ ”ہندو ماہا سمجھا“ کا نقش ثانی ہے تو وہ علیحدہ ہو گئے، اور انھوں نے اس کی ذرا بھی پروا نہ کی کہ ہوا کا رخ کدھر ہے بلکہ اس کی کوشش کی کہ ہوا کا رخ جدھر بھی ہو اسے قبضہ میں کرنا چاہئے!

۱۔ سری غور طلب بات یہ کہ ہندوستان میں بدقسمتی سے ایسے انداز میں حکومت کی جا رہی ہے اور ہندو مسلمان دونوں قوموں کو ایسے سانچہ میں ڈھال لیا گیا ہے کہ ایک قوم دوسری کو سخت نفرت، کراہیت اور تحارت کی نظر سے دیکھتی ہے، ہندوستان میں کانگریس ہی وہ ”بیت السلام“ ہو سکتا تھا، جس میں ہر دو اقوام کے نیک نیت، سمجھدار معاملہ فہم، دور اندیش اور غیر متعصب حضرات مصروف عمل ہوں، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یہاں بھی ماہا سمجھا کی ذہنیت چھائی ہوئی ہے، اکثر کانگریسی جب امتحان کی کسوٹی پر کسے جاستے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جوش عمل کی بہترین جولانگاہ ماہا سمجھا کا پلیٹ فارم تھا، تو آخر وہ کیوں نہ کانگریس سے دل برداشتہ ہو جاتے۔

اور پھر یہ بھی سمجھ لینا چاہئے اور یاد رکھنا چاہئے کہ محمد علی کی قوت عمل اسلام کے لئے وقف تھی، اگر کانگریس نے تہا دن کا ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے اپنا ہاتھ بھی نہیں کھینچا، اور انگریز نے تہا دن کرنا چاہا تو انھوں نے اسے بھی موقعہ دیا، اگر وہ صرف ”ہندوستانی“

ہوتے اور مذہب کو پس پشت ڈال کر کانگریس میں شریک ہوئے ہوتے تو ان کی سلیجی موجب حیرت ہو سکتی تھی۔

گاندھی جی کا بیان | ہندوستانی سیاسیات میں گاندھی جی کو جو عظمت و بزرگی اور جو اقتدار و نفوذ حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں، وہی ایک ایسے شخص ہیں جن کے متعلق اکثر مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ ان سے بڑھ کر غیر متعصب، بہی خواہ قوم، اور بہادر و اسلام کوئی نہیں۔

۱۹۳۷ء کے مشہور فساد کو ہاٹ کے اختلاف سے بھی پیشتر گاندھی جی کی بات جو محمد علی کے لئے دل شکن ثابت ہوئی، وہ گاندھی جی کا وہ بیان تھا جو ادھول نے جوہو سے ۲۹ مئی ۱۹۳۷ء کو اپنی رہائی سے ایک ماہ بعد شائع فرمایا تھا، اور جس میں ارشاد ہوا تھا کہ۔

”مسلمان ڈگمی ہیں اور ہندو بزدل“

یہ بیان محمد علی کے لئے اس لئے اور زیادہ دل شکن ثابت ہوا کہ اب تک ان کا طرز عمل یہ رہا تھا کہ جوش رواداری میں ہمیشہ غلطی کا الزام وہ مسلمانوں کے ہی سر رکھتے تھے محض اس امید پر کہ ہندو مسلم تعلقات خوشگوار رہیں، لیکن گاندھی جی کا یہ بیان ان کے لئے بہت افسردہ کن ثابت ہوا۔

صوبہ متحدہ کی سیاسی کانفرنس | محمد علی نے مٹر جناح کی رفاقت میں ”تجاویز دہلی“ تیار کی تھیں، جبکہ اہم جزو مخلوط انتخاب تھا، اب تک مسلمان مخلوط انتخاب سے بیزار تھے لیکن محمد علی نے اسے مسلمانوں سے منوایا پھر کانگریس سے قبول کرایا، یہ پہلا موقع تھا کہ ہندو مسلمانوں نے مشترکہ طور پر صحیح قومیت کے تخیل کو پیش نظر رکھ کر جداگانہ انتخاب سے

اپنی بیزاری کا اظہار اور مخلوط انتخاب پر آمادگی کا ارادہ کیا تھا، ہندوستان کا قوم پرور طبقہ اس پر بہت سرور تھا اور سب محمد علی کو مبارک باد دے رہے تھے کہ انھیں کے تدریج اور جذبہ عمل نے اس مشکل کو بھی حل کیا، لیکن بعد کو یہ صورت نہیں قائم رہی جس کی ضروری تفصیل حسب موقعہ آئے گی یہاں اتنا کافی ہے کہ محمد علی نے اسے مسلمانوں سے منظور کرایا اور کانگریس سے اسے منظور کرانے میں اپنا سارا زور ختم کر دیا اور بالآخر اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے، یعنی مجلس عاملہ نے منظور کیا، پھر کانگریس کے اسپیشل اجلاس نے منظور کیا اور کانگریسی لیڈروں نے منظور کیا، پھر ہاں سبھاؤوں نے منظور کیا، حتیٰ کہ موتی لال نہرو اور پنڈت مالوی اور ڈاکٹر مونجے تک نے منظور کیا، لیکن یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب سری نواس آننگر جیبا صحیح خیال شخص صدر نشین تھا، لیکن بعد کو جو دوسرے تغیرات ہوئے ان کا ذکر آگے آئے گا۔ اس جگہ ربط کے لئے یہ خیال رکھئے کہ محمد علی نے اسے سب جگہ سے منظور کرایا، کچھ عرصہ کے بعد ”صوبہ متحدہ کی سیاسی کانفرنس“ کا ۲۶ - ۲۷ - ۲۸ نومبر ۱۹۲۵ء کو انعقاد بمقام علیگڑھ طے پایا، اس میں زیر بحث مسائل میں ”وہ سمجھتو، بھی تھا جسکی تصدیق و توثیق سری نواس آننگر صدر کانگریس نے کلکتہ میں کرائی تھی۔ محمد علی جب علیگڑھ پہنچے تو ان کے مشاہدات و تاثرات کیا ہوئے؟ اسے انھیں کی زبان سے سنئے۔

”آمنہ مرحومہ کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر جلسہ میں آیا جو باتیں وہاں پہنچ کر سننے میں آئیں انھوں نے قلب کو اور بھی مضحک کر دیا، معلوم ہوا کہ ابھی تک سبکٹ کمیٹی میں ہی بحث چمکتی رہی، جب سبکٹ کمیٹی کی کارروائی کا حال سنا تو سوچنے لگا کہ آمنہ مرحومہ کے لئے روؤں یا اپنے صوبہ کا غم کروں، یہ صوبہ صوبہ کی ہندو

سبھا یا سلم لیگ کا نہ تھا، کانگریس کا جلسہ تھا، اگر یہاں بھی باوجود آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ ہائے منعقدہ بمبئی و کلکتہ، ہندو مسلم تعلقات کے بارے میں استعدائے اختلافات موجود ہیں خود صوبہ کی کانگریس کمیٹی میں ہندو مسلمان اس طرح دست و گریبان ہیں تو اس ملک میں امن و امان کب قائم ہوگا اور اس ملک والوں کو آزادی کب نصیب ہوگی، جلسہ گاہ سراجی مولیٰ خاں صاحب کے مکان پر آیا، جہاں ڈاکٹر (انصاری) صاحب اور شیب قریشی صاحب نہایت فسرہ دل بیٹھے ہوئے تھے، جوں ہی کلکتہ والے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ کے رزلوشن کا وقت آیا صاف معلوم ہونے لگا کہ اکثریت کی ذہنیت بالکل ہندو سبھائی ہے۔“

موتی لال کا تیسرا واسطی سلسلہ میں جب کانگریس کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں ”تجاویز دہلی“ پیش ہوئے تو مجلس عالمہ میں جس شخص نے ان کے منظور کرانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا وہ خود پنڈت موتی لال نہرو تھے اور پھر یہی پنڈت موتی لال نہرو تھے جنہوں نے اپنی ”نہرو رپورٹ“ میں بعض اہم امور میں اس کے خلاف فیصلہ دیا اور سارے ہندوستان سے اور خود مسلمانوں سے بھی منظور کرانا چاہا۔

اب اسے جو کچھ بھی کہئے، اس ”تغیر رنگ“ سے محمد علی متاثر ضرور ہوئے۔

جے رام داس کا اختلاف کانگریس کے اسی جلسہ میں جس میں موتی لال جی ”تجاویز دہلی“ منظور کر رہے تھے، اس میں اسے ان ہما سبھائیوں نے بھی منظور کیا، جو وہاں موجود تھے لیکن جے رام داس دولت رام صاحب جو اس جلسہ میں موجود بھی نہیں تھے انہوں نے ہی سب سے پہلے ان تجاویز کی مخالفت کی۔

گاندھی جی اور دوسرے | یہ وردناک اور انوس ناک صورت حال ابھی ختم نہیں ہوئی
کانگریسوں کا اختلاف | محمد علی کا بیان ہے کہ

”سری نواس آئنگرنے، کلکتہ میں کانگریس کمیٹی کا جلسہ منعقد کیا جس میں گاندھی اور باجے کے متعلق ایک مدبرانہ فیصلہ کیا گیا تھا وہاں بھی دو ہندو مہاسبھائی آخر وقت تک لڑتے رہے جن میں سے ایک اخبار سورا جیہ کے مالک اور ایڈیٹر پرکاشم صاحب اور دوسرے سندھ کے بے رام داس صاحب (بمبئی کے جلسہ میں) مجلس عاملہ کی منظوری کے بعد یہ تجویز سبکدوشی میں پیش ہونے والی تھی کہ ہاتھ جی اپنے گوشہ تنہائی سے برآمد ہوئے اور ڈاکٹر انصاری کو بلا کر فرمایا کہ میں اس لئے آیا تھا کہ کچھ تمہاری مدد کروں اور ہندو مسلم تنازعات کا آخری فیصلہ کراؤں لیکن جب میں نے اس تجویز کو دیکھا جسے مجلس عاملہ نے سبکدوشی میں پیش کرنے کے لئے تیار کیا ہے اور جسے بمبئی اور کلکتہ کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں نے منظور کیا تھا تو میرے ہوش اڑ گئے، اس گائے والے حصہ پر تو میں نہ کوئی اور ہندو راضی ہو سکتا ہے وہ تو بالکل ہمارے مذہبی فرائض کے منافی ہے، مجھے رات بھر اس جنجال کے باعث نیند نہیں آئی کہ میں تو تمہیں مدد دینے کے بجائے فیصلہ پر پہنچنے میں ایک روک بن جاؤں گا تم علی برادران کے پاس جاؤ، انھیں بھی میرے پاس لاؤ، ہم حاضر خدمت ہوئے اور ہاتھ جی کے مذہبی خیالات کا ایک بار پھر اعادہ کیا گیا، میں نے ہاتھ جی کی منطق پر اعتراض کیا، اور بالآخر انھیں ایک ایسی چیز پر لے آیا جو انھیں

بھی قبول تھی اور یہیں بھی۔

یہ تو محمد علی کے ذاتی مشاہدات و اثرات لیکن باہر سے ان کو جو اطلاعات ان کے رفقا کی طرف سے ملتی تھیں وہ بھی ایسی ہی درد انگیز حقیقت کا منظر ہوتی ہیں، یہ اطلاعات ان کو ان رفقا کی طرف سے ملتی تھیں جو خود عقیدہ کانگریسی ہوتے تھے اور ہندو مسلم اتحاد جن کی زندگی کا مقصد ہوتا تھا، لیکن اعتراف حقیقت پر وہ بھی مجبور ہوتے تھے اور فریاد محمد علی ہی کے حضور میں پیش کرتے تھے!

اس قسم کے متعدد افسوسناک واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں جن سے اس عہد کی ہندو ذہنیت کا صحیح مرقع آنکھوں کے سامنے آسکے، لیکن بہر حال یہ اوراق ایک کتاب کے لئے صرف ہوئے ہیں، کسی اخبار کے کالم نہیں ہیں، اس لئے مجبوراً تفصیل واقعات کو گریز کرنا پڑتا ہے ”محمد علی میوزیم“ میں ان کے خطوط کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ چیز بہت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، کچھ مصلحتاً اور کچھ ضرورتاً اس قسم کے تکلیف دہ واقعات کی مثال سے ہم چشم پوشی کرتے ہیں، لیکن یہ ایک واقعہ ہو کے محمد علی کے ثقہ اور معتد رفقاء نے، ان رفقاء نے جن کی زبانیں اس وقت ہندوؤں کی شکایت کر رہی تھیں اور آج جو قید و بند کے مصائب تحریک وطنی کے سلسلہ میں پھر جھیل رہے ہیں، محمد علی کے حضور میں اپنی شکایتیں پیش کیں جن سے محمد علی کا متاثر ہونا یقینی تھا، مختصر یہ اور اسی قسم کے دوسرے اسباب تھے، جنہوں نے محمد علی کو ہندوؤں سے اور آخر میں کانگریس سے اور سب سے آخر میں گاندھی جی سے دل برداشتہ کر دیا تھا،

باب

علاقت

یوں تو کئی سال سے ان کی طبیعت خراب تھی، سترہ سال پہلے یورپ وہ علاج ہی کے لئے گئے تھے مگر وفات سے ڈیڑھ سال پیشتر سے محمد علی کی طبیعت اور صحت پر حد درجہ برا اثر پڑا تھا، ان کی ذیابیطس کی شکایت پھر زور شور سے شروع ہو گئی تھی، آنکھوں کی بینائی پر بھی سخت اثر ہوا تھا چنانچہ ایک آنکھ کی بینائی تو جاتی ہی رہی تھی اور دوسری آنکھ بھی خطر میں تھی، قلب کی حرکت بھی بہت خراب ہو رہی تھی اور شاید ذیابیطس کی وجہ سے ان کی ہڈیاں بھی خراب ہو رہی تھیں، چنانچہ ان کے پیر متوزم رہنے لگے تھے اور ڈاکٹروں کی طرف سے انھیں ہدایت تھی کہ اگر جان عزیز ہے تو سکون اور فراغ خاطر کے ساتھ کسی گوشہ میں تھام علی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ جاؤ۔

لیکن ملکی اور قومی معاملات نے انھیں اس درجہ مضطرب رکھا تھا کہ ان سے خاموشی اور سکوت کی توقع کرنا ایک امر محال تھا، بالخصوص مسلمانوں کی حالت زار نے ان میں اگرچہ ایک حیرت انگیز قوت عمل تازہ کر دی تھی، لیکن اسی سرعت کے ساتھ ان کی صحت انحطاط کے منازل طے کر رہی تھی۔

دہلی میں | جب تک وہ دہلی میں علیل اور صاحب فراش رہے اُس وقت تک ڈاکٹر انصاری ان کی صحت کے نگراں رہے اور برابر مشورہ دیتے رہے کہ گوشہ گیر ہو جاؤ، صحت حاصل ہو جانے کے بعد پھر جوجی میں آئے وہ کرنا، مگر محمد علی اپنے درد قوم اور پاک

ملت کی بنا پر یہ سچا مشورہ نہ قبول کر سکے، پھر آب و ہوا اور تبدیلی علاج کی خاطر شملہ چلے گئے۔

شملہ میں ضمنیاً یہ فائدہ حاصل ہونے کی توقع بھی تھی کہ نسبتاً اطمینان و سکون رہے گا مگر وہاں بھی وہ اپنے اشتغال ملکی سے باز نہ آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ان کی صحت اور زیادہ خراب ہو گئی، اور دل کے متعدد دوسرے اس قدر سخت پڑے کہ حالت نازک ہو ہو گئی۔
دائسرائے کا طبیب خاص | اسی زمانہ میں محمد علی کی حالت سے متاثر ہو کر لارڈ اردن وائسرائے ہند نے اپنا پرسنل سرجن محمد علی کی خدمت میں بھیجا تاکہ صحیح تشخیص کے بعد کوئی معقول علاج کیا جاسکے، اصل غرض لارڈ اردن کی یہ تھی کہ کم از کم محمد علی کی صحت اس قابل ہو جائے کہ وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کر سکیں اس لئے کہ وہ بہت مصرتھے کہ محمد علی گول میز کانفرنس میں ضرور شریک ہوں۔

ہنگامہ اختلاف | وائسرائے کے سرجن کا دیکھنا غضب ہو گیا اور مخالفین کو موقع ہاتھ آ گیا کہ وہ محمد علی کی ”ٹوڈیت“ اور ”گورنمنٹ پرسی“ پر جس طرح چاہیں اپنے اہمیت کو بڑا کر کریں چنانچہ لوگوں نے اس بہانے سے خوب اپنے دل کی دیرینہ تمنائیں پوری کیں اور پورے طور سے محمد علی کو آماجگاہ سب و شتم بنالیا۔

ایک اخبار کا طنز | محمد علی کی علالت کے زمانہ میں سب سے زیادہ افسوس ناک اور قابل ملامت نکتہ چینی اس اخبار کی تھی جو پنجاب کے ایک ”آقا“ کی ملکیت میں نکل رہا تھا، اس کو اس کا خیال بھی نہیں رہا کہ ایک بیمار پر اور ایسا بیمار جس کو نقل و حرکت بھی دشوار ہو اس کو لشکر اور ”سنسنی خیز“ انداز میں تنقید کرنا، صحافی ذمہ داری، شرافت اور انسانیت کا نہایت بے دردی سے خون کرنا ہے۔

بہر حال اس نے محمد علی کی ”اس منفعت بخش“ علالت پر خوب خوشیاں منائیں اور علی الاعلان ان کی اس علالت کو ایک ڈھونگ سمجھا جو جلب زریا کسی اور مقصد کی خاطر رچایا گیا تھا۔

سریعوب کا مشاہدہ | اسی زمانہ میں سر محمد یعقوب محمد علی کو دیکھنے گئے اور ان تاثرات کے ساتھ واپس آئے۔

”محمد علی سے میری آخری ملاقات گزشتہ جولائی میں شملہ کے رپن ہسپتال میں ہوئی، آخر جون میں جب میں شملہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ محمد علی وہاں مقیم ہیں دوسرے روز شام کو میں ان سے ملنے گیا، ”دھول پور ہاؤس“ میں وہ ٹہرے ہوئے تھے، میرے آواز سننے پر ایک نوکر لڑکا باہر آیا، اس نے کہا کہ رات میاں کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اور اس وقت ذرا آنکھ لگ گئی ہے، اپنا کارڈ چھوڑ کر میں واپس ہو رہا تھا کہ اوپر سے محمد علی کی آواز آئی یعقوب، یعقوب، یہاں آ جاؤ، میں اوپر پہنچا، دیکھا کہ محمد علی پلنگ پر بیٹھے ہیں، سائنس کمیشن کی رپورٹ ہاتھ میں ہے اول حسب معمول نہایت گرمجوشی سے مصافحہ اور علیک سلیک ہوئی، میں نے مزاج کا حال پوچھا کہنے لگے ”کہ کل شام سائنس رپورٹ ہاتھ میں آئی رات کو دو بجے تک میں اس کو پڑھتا رہا، اسی حالت میں دورہ ہو گیا اور دل میں تکلیف پیدا ہو گئی، رات بھر اس رپورٹ کو پڑھتا رہا، اور اب قریب ختم پہنچ گیا ہوں“ قریب ایک گھنٹہ کے بڑے جوش کے ساتھ رپورٹ پر کتبہ چینی اور تنقید کرتے رہے، میرے واپس آنے کے بعد اسی شب میں پھر دل کا دورہ پڑا۔“

گول میز کانفرنس | اس حالت میں لارڈ ارون نے انھیں گول میز کانفرنس کے لئے مدعو کیا، واقعہ یہ تھا کہ اپنی صحت کے باعث محمد علی قلعہ اپنا سفر ملتوی کر دیتے لیکن انھوں نے دیکھا کہ کانفرنس کے مسلم مندوبین میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ان کی جماعت کا ہو، ان کا ہم خیال ہو، یا کم از کم ایسا ہو جس پر وہ اپنے عقائد سیاسی میں پورے طور سے اعتماد کر سکیں اس لئے مجبوراً انھوں نے اپنی سخت ترین علالت کے باوجود شرکت کا ارادہ کیا اور ہزاروں مخالفین اور کتہ چینی کے باوجود وہ شریک ہوئے، جب وہ عازم انگلستان ہوئے تو ان کی حالت کیا تھی؟

ایک شاہد معنی | ایک صاحب جو محمد علی کو رخصت کرنے اور الوداع کہنے پہنچی آئے تھے وہ کہتے ہیں کہ:

”محمد علی، کی روانگی (گول میز) کا نظارہ بڑا رقت انگیز تھا، جس وقت آپ کو اسٹریچر پر لٹا کر سائل بمبئی سے وائسرائے آف انڈیا جہاز پر سوار کرایا گیا، اس وقت تمام حاضرین کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، گویا زندہ جنازہ جا رہا ہے

مولنا عبدالمجید بدایونی کا سوال | مولنا عبدالمجید صاحب بدایونی مرحوم نے جب مولنا (محمد علی) سے پوچھا کہ آپ اتنا طویل سفر کیوں اختیار کر رہے ہو تو آپ نے عجیب مسکراہٹ سے جواب دیا ”مرنے کو لئے جس وقت راقم الحروف آپ کو الوداع کہنے کے ارادہ سے بمبئی گیا تو مرحوم دار الخلافہ کے بالاخانہ پر خون کی قے کر رہے تھے“

ان حالات میں ملک و ملت کا یہ فدا فی اور اخلاص و اثبات کا یہ مجسمہ متحرک، دوسروں کے کندھوں پر لہ کر جہاز پر پہنچا یا گیا اور بالآخر انگلستان روانہ ہو گیا، کاش محمد علی کو لندن نہ جانا پڑتا، لندن خود محمد علی کے قہقہوں میں آگیا ہوتا“

پیرس | جب محمد علی پیرس پہنچے تو ان کی حالت وہاں پھر خراب ہو گئی اور اتنی زیادہ

خراب ہو گئی کہ ڈاکٹروں نے لندن جانے سے منع کر دیا، لیکن محمد علی نے اس قدغن کا جواب یہ دیا کہ پریس ہی میں اپنا مشغلہ شروع کر دیا، یعنی پریس کے طلبہ کے سامنے اسلام اور قوت و غیرہ پر تقریر۔

وہاں علاج میں بہت سرگرمی اور تندہی کا اظہار کیا گیا، دماغ، زبان، دل، نبض تھوک، پاخانہ، پیشاب ہر چیز کے ماہروں نے ہر چیز کا الگ الگ ”ٹسٹ“ کیا۔ اور پھر علاج شروع ہوا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی صحت اتنی سنبھل گئی کہ وہ لندن جا سکیں چنانچہ ڈاکٹروں کی اس ”دینی دینی رائے“ سے بھی محمد علی نے پورا فائدہ اٹھایا اور لندن چل کھڑے ہوئے، وہاں پہنچ کر ایک بہت ہی عجیب و غریب اور دلنواز تقریر کر کے پھر علیل ہو گئے اب کی مرض نے پہلے سے زیادہ سخت حملہ کیا۔

مکتوب بنام عرفان | چنانچہ مولانا عرفان صاحب کو محمد علی لکھتے ہیں۔

”جبکہ یہاں آیا ہوں دوبار صاحب فراموش ہو چکا ہوں ۱۵ کو اپنی تقریر کرنے کے بعد سخت تکلیف اٹھائی اور شب کے بارہ بجے تک درد و قویخ میں مبتلا رہا، دل کی خرابی کے باعث دوران خون ٹھیک نہیں ہے اس لئے نیچے کا سارا جسم سخت درد میں مبتلا ہے، دوسرے والوں کی طرح شب میں سانس چلتی ہے، اس لئے لیٹ بھی نہیں سکتا مگر گھنٹہ برابر بنگ پر بیٹھا رہنا پڑتا ہے۔“

تقریر میں تذکرہ | اپنی مشہور گول میز والی تقریر میں ضمناً نواب صاحب بھوپال کی اس عنایت کا کہ شملہ میں وہ اپنے سابق ”ٹیوٹر“ کی علالت سخت دیکھ کر اپنے ساتھ بھوپال لے گئے اور ”گسٹ ہاؤس“ کو ایک ”ہسپتال“ میں تبدیل کر دیا، گو وہاں بھی

ان کی حالت خراب ہی رہی لیکن بہر حال شکر یہ ادا کرتے ہوئے اپنی علالت کا تذکرہ دیکھنے کے لیے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں، بیمار ہیں، زار و نزار ہیں لیکن اپنی تقریر میں ایربہاڑیں ہر شخص خوش، ہر شخص مسرور۔ فرماتے ہیں :-

”جب مجھے شملہ کے شفاخانہ میں بھیجا گیا تو ایک یورپین خاتون نے ہمارے ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ بڑے میاں کو کس مرض کی شکایت ہے؟ ڈاکٹر نے جواب دیا کہ یہ نہ پوچھو کہ اسے کیا شکایت ہے بلکہ یہ پوچھو کہ کتنی شکایت نہیں ہے

علالت کی تفصیل | میری کیفیت ہو کہ قلب کی حالت درست نہیں، بنیائی میں فرق آگیا ہے پانوں متورم ہیں، ذیابیطس کا عارضہ ہے بیماریوں کی اس طویل قہرست سے جو میں نے پیش کی ہو، میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں کرنل گڈنی ایک طبیب کی حیثیت سے قشریح امراض کے معاملہ میں مجھے اپنا رقیب نہ سمجھ لیں (قہقہہ) میں کہتا ہوں کہ جس آدمی کے حواس بجا ہیں وہ ان بیماریوں کے ساتھ میل کا سفر بھی نہیں طے کر سکتا، لیکن پھر بھی میں خشکی اور سمندر کے ساتھ ہزار میل کا سفر طے کر کے یہاں پہنچ گیا ہوں کیونکہ جہاں ہندوستان اور سلمان کا معاملہ آجاتا ہے وہاں میری حالت دیوانوں کی سی ہو جاتی ہے۔“

غرض اس نازک حالت میں بھی محمد علی اپنی کارگزاری اور علی قوت کا برابر ثبوت دیتے رہے۔

باب ۲۵

وفات

صفحات قبل میں آپ محمد علی کی علالت کے مفصل حالات پڑھ چکے ہیں۔
جو شخص اتنی سلسل علالت کے باوجود ڈاکٹروں اور طبی مشیروں کی مخالفت کے باوجود
سرگرم رہے اور وہ بھی اس طرح کہ نہ دن کا خیال نہ رات کا، نہ کھانے کی فکر نہ پانی کی، نہ
اعزاء و اقربا کی طرف توجہ نہ دوست احباب کی طرف، صرف ایک دھن ہوا اور اسی محور پر
ساری قوت عمل گردش رہی ہو، تعجب ہو کہ اس کی وفات اتنی دیر میں کیوں ہوئی !
اسے تو شملہ میں ختم ہو جانا چاہئے تھا ! یہ خدا کی مشیت ہو جب تک وہ کسی سے کام لینا چاہتا
ہے اس وقت تک موقع دیتا ہے اور وہ چرنے صبح کی طرح بھڑک بھڑک کر اپنی مصنوع اور
افسردہ روشنی سے کسی نہ کسی حد تک ضیا باری کرتا ہے، پھر جب وقت آجاتا ہے تو یاد
کا ایک جھنڈکا اس جھللاتے ہوئے چراغ کو ختم کر دیتا ہے، محمد علی کی مثال ایسی ہی تھی !
تقریر کے بعد گول میز کانفرنس کی تقریر کے بعد سے محمد علی کی حالت جو گری تو پھر نہیں
سفلی اور اس کا کوئی امکان بھی نہیں باقی رہ گیا تھا۔

وفات کی شب بلا سے پیشتر وہ رات بھر کام کرتے رہے۔
ہندو مسلم سکیم | ہندو مسلم تعلقات پر جو انہوں نے ایک مفصل سکیم تیار کی تھی، اس کا
مسودہ ٹھیک کراتے رہے، اور وزیراعظم کے پاس اس کے بھیجنے کی فکر کرتے رہے۔
وفات | حالت بظاہر اگرچہ اتنی تشویش انگیز نہیں تھی کہ ان کی جان کا خطرہ کیا جاتا

اسی لئے شوکت صاحب ایک دوست سے ملنے آئرلینڈ تشریف لے گئے تھے لیکن اپنی اس اسکیم کے بعد وہ بیہوش ہو گئے اور کئی گھنٹہ کی بیہوشی کے بعد صبح کو کچھ دیر کے بعد آنکھ کھلی، اس وقت تھکا مائد ابوڑھا بھائی بھی پہنچ چکا تھا کہ دیکھتے دیکھتے محمد علی کی روح عالم ہلا کو سدھار می! انا للہ وانا الیہ راجعون -

دیار غیر میں موت سے دیکھی "کی خواہ کتنی ہی "شرم" رہ جائے، لیکن ہوتی بڑی عبرتناک ہو۔ اس بیوی پر کیا کچھ نگزر گئی ہوگی جو ان امیدوں اور آرزوں کے ساتھ تیارواری اور چارہ سازی کرنی ہوئی گئی تھی کہ اپنے محبوب شوہر کے ساتھ واپس ہوگی لیکن آہ! اب اس کے ساتھ محمد علی کے بجائے ایک جسد بے روح ہے جس کے سر جانے بیٹھی وہ حق و فاداد کر رہی ہے لیکن کب تک؟

اس بھی پر کیا نہ بتی ہوگی، جو باپ کے ساتھ نہ جاسکی تھی اور دہلی ہی میں بیٹھی ہوئی روزانہ خطوط کا انتظار کیا کرتی تھی، خبر صحت کی جو بارہتی تھی اور اس کی منتظر کہ غم قریب ہر پدر سے پھر لطف اندوز ہوگی! لیکن آہ جب اسے زبان برق نے اس کے پیائے باپ کی خبر وفات سنائی ہوگی، اس وقت اسے اپنی محرومی پر کتنی حسرت، کتنا آسف اور کتنا نااہل برداشت صدمہ ہوا ہوگا کہ وقت آخر بھی وہ اپنے پیکر رفیق و محبت باپ کی زیارت نہ کر سکی! اور آہ! اس بوڑھے لیکن جواں ہمت بھائی کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی جس کا وہ دست راست تھا، دل کی طاقت تھا اور وجہ شکیبائی تھا، دونوں بھائیوں کی دستان محبت کیسی کچھ مشہور ہے؟ شوکت نے سچ کہا کہ محمد علی اس کا بھائی بھی تھا، بیٹا بھی، عاشق بھی تھا اور معشوق بھی! اس بڑے بھائی نے اپنے سامنے اپنی زندگی کی کمائی کو لئے ہوئے دیکھا اور خاموش رہا۔

یہ سب کچھ ہوا، نالہ و شیون بھی ہوا، نوحہ و ماتم بھی ہوا، سینہ کو بی اور چاک
و امانی کا مظاہرہ بھی ہوا، لیکن اس کا کیا علاج کہ محمد علی ہم سے ایسا جدا ہو کہ اب اس
عالم خاکی میں، آنکھیں اس کی کبھی بھی زیارت نہ کر سکیں گی، فیا للہ حسرة۔

باب ۲۶ قابل شکشکشی

خبر وفات | محمد علی کی خبر وفات آنا فانا سائے ملک میں پھیل گئی اور جوق در جوق لوگ آنا شروع ہوئے کہ مراسم تعزیت ادا کریں۔

مہاراجہ الور کی حالت | علالت کے زمانہ میں مہاراجہ صاحب الور کی یہ حالت تھی کہ قہر طر و اضطراب کے عالم میں تنگے سر اور ننگے پیر بار بار دوڑ دوڑ کر آتے تھے، وفات جب ہوئی تو انھیں اور بھی صدمہ ہوا، و فوراً رنج و تاثر کا یہ عالم تھا کہ وہ شوکت علی صاحب سے اکٹھے نہیں ملا سکے تھے۔

التوا | اب زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ لاش دفن کہاں کی جائے؟ بعض اہباب کا خیال تھا کہ تدفین لندن ہی میں ہونی چاہئے لیکن گھروالے اس کے خلاف تھے، یگیم محمد علی انھیں ہندوستان سے طلبی | لیجانا چاہتی تھیں اور خود ہندوستان سے سیکڑوں تار پیچھے کہ نقش یہاں لائے تاکہ ہم قشتہ کا مان زیارت آخری زیارت ہی سے مشرف ہو جائیں، لیکن ابھی استحقاق | اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ ہندوستان کے مختلف شہروں سے دعوتیں پہنچیں کہ محمد علی کی نقش یہاں آئے اور اس سر زمین سے بڑھ کر کوئی دوسری سر زمین نہیں ہو سکتی

راپور | راپور نے یہ استحقاق پیش کیا کہ اسے محمد علی کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے اس لئے محمد علی کو وہیں سپرد خاک ہونا چاہئے، جہاں سے ان کا خیر ہے۔

لکھنؤ | لکھنؤ نے یہ استحقاق باصرار پیش کیا کہ اس سے بڑھ کر اس امانت کا حق دار کوئی نہیں ہو سکتا کہ یہیں ان کے مرشد مولانا عبد الباری مرحوم کی آخری آرام گاہ ہو، یہیں محمد علی نے انجمن خدام کعبہ کی تاسیس اور جمعیتہ خلافت کے قیام کی کوششیں کیں اس لئے محمد علی کو اپنے مرشد کے پاس آسودہ خاک بھی ہونا چاہئے۔

اجمیر | اجمیر نے استدعا پیش کی کہ محمد علی کو سلطان الہند غریب نواز خواجہ معین الدین اجمیری قدس اللہ سرہ کے سایہ بہا پایہ میں آخری موقع استراحت ملنا چاہئے اس لئے بھی کہ خود محمد علی کو درگاہ خواجہ سے بہت عقیدت تھی اور وہ اکثر یہاں حاضری دیا کرتے تھے اور اس لئے بھی کہ ہندوستان سے اس آستانہ سے بڑھ کر کوئی اور ایسا آستانہ نہیں کہ اس خصوصیت میں اس کا ہم سر ہو سکے۔

کلکتہ | کلکتہ نے کہا کہ آرزوؤں اور تمناؤں، حوصلوں اور کوششوں، سرگرمیوں اور کارگزاریوں نے یہیں عمل کی صورت اختیار کی اور یہیں ان کی ابتدا ہوئی، مگر یہ بھی یہیں نے سکھایا اور ان کی پلک زندگی کا آغاز بھی یہیں سے ہوا لہذا واجب ہے کہ اس کی آرزوؤں اور اس کے جد خاکی کا مدفن وہی قرار دیا جائے جو مطلع رہ چکا ہے۔

علی گڑھ | علی گڑھ آگے بڑھا اور اس نے کہا کہ محمد علی کے ذہن و دماغ کی نشوونما یہیں ہوئی، تعلیم و تربیت یہیں ہوئی، حوصلوں اور ولولوں نے یہیں پرورش پائی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محمد علی طلوع بھی یہیں سے ہوا تھا، لہذا غریب بھی یہیں ہو۔

دلی | شاہان مغلیہ کی راجدھانی، دلی ایک سو گوارانہ انداز سے آگے بڑھی اور اس نے کہا کہ محمد علی چکے نہیں، پھلے پھولے نہیں، کامیاب و کامگار یہاں ہوئے، ناکام و نامرادی کی زندگی یہاں بسر کی، چھند واڑہ کی ربانی کے بعد دلی ہی نے سب سے زیادہ عظیم المثال

شاہانہ استقبال کیا تھا، اور اب دہلی ہی اپنی اس متاع عزیز کو جس نے اسے اپنے وطن ثانی کی حیثیت دیدی تھی، اپنے آغوشِ جلد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آرام کی نیند سلائے گی اور پھر بستیج بھی اسے حاصل ہو کہ محمد علی کی چہیتی ماں آبادی بانو کی آغوشِ تنہا نہیں اس کے لئے کھلی ہوئی۔

بیت المقدس | لیکن بیت المقدس کی سرزمین نے اپنے مقدس بازوؤں کو پھیلا یا اور محمد علی سے کہا، تیری ساری زندگی اور ساری جدوجہد، تیری دوستی اور دشمنی اللہ کے لئے تھی، دیکھ یہ گزیدہ انبیاء مرسلین کے جسد پاک اور شمار اولیاء بقولین کے اجسامِ مطہرہ میرے سینہ میں محفوظ ہیں، آ میں تجھے ایک گوشہِ مافیت انسی سرزمینِ مین و سلام کا دیتی ہوں بول منظور ہے؟ محمد علی کی روح مسکرائی اور آگے بڑھی، مسجد عمر نے اپنا سینہ شق کیا اور محمد علی اُس میں سا گیا، کیا قسمت تھی!

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا!

یاں کی زمین سے مرتبہ پست آسمان کا ہو کہتے ہیں جس کو عرش وہ فرش اس مکاں کا ہو

(میر انیس)

باب ۲

تکفین و تدفین

بیت المقدس کی دعوت منظور | بالآخر بہت غور و فکر اور کشمکش کے بعد سرزمین قدس کی دعوت منظور کر لی گئی اور اس کے انتظامات ہونے لگے کہ محمد علی کو اس سرزمین کفر و الحاد سے اُس سرزمین قدس میں منتقل کر دیا جائے۔

ناز جنازہ | جس ہوٹل میں مولانا تقیم تھے وہاں سے نقش رات کے بارہ بجے لفٹ سے نیچے اتاری گئی، نقش ایسی معلوم ہوتی تھی کہ جیسے کوئی شخص سکون و آرام سے سو رہا ہے، نقش کو دوکانگیشن لے کر آیا کر دیا گیا تھا کہ دس برس بھی نہ بگڑے، نقش پر شب و روز قرآن خوانی ہوتی رہی، ۲۱ جنوری ۱۹۸۲ء کو شوکت علی، عبدالرحمن صدیقی اور مظفر نے نقش کو غسل دیا اور شام کے چھ بجے حسب اعلان لینڈنگ ہال میں ناز جنازہ ادا کی گئی۔

شرکا | جس میں اراکین گول میز کانفرنس، سفراء ایران، مصر، کابل و زیر ہند لارڈ سینکے، وزیر اعظم کا نائندہ اور دیگر مغزین شریک تھے۔

پورٹ سعید اور مصر | نقش بذریعہ تار کنڈ اہواز ٹیلری بندر سے بیت المقدس روانہ کی گئی، ۲۱ جنوری کو پورٹ سعید پہنچی۔

حکومت مصر کا استقبال | شاہ مصر کے نائندے وزیر اعظم مشائخین شہر پورٹ سعید جلوس میں شامل تھے، مسجد عباس میں ناز جنازہ ادا کی گئی، مصری پولیس

نے سلامی دی اور جازہ اپنے کندھوں پر اٹھایا، شہزادہ محمد علی نے
شہزادہ محمد علی کا تحفہ | محمد علی مرحوم کے لئے خلاف کعبہ کا ایک مکڑہ تابوت پر
 رکھنے کے لئے مرحمت فرمایا، مرحوم کا کفن خالص کھدر کا تھا۔
بیت المقدس میں | ”یروشلم ۲۳ جنوری آج شہید ملت مولانا محمد علی کا تابوت
 یہاں پہنچا، پبلک کا ایک جم غفیر اس عظیم الشان جلوس کے چاروں طرف موجود
 تھا، تمام عربوں، مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں وغیرہ کی دکانیں
 شہید ملت کے اعزاز میں بند تھیں، یہودیوں نے عربی پریس کو چاروں
 طرف سے ہمدردی اور تعزیت کے پیام بھیجے ہیں، مولانا شوکت علی نے
 اعلان کیا ہے کہ میرے عزیز بھائی کا یروشلم میں دفن ہونا مشرقی ممالک کے
 ابدی اور مستحکم اتحاد پر دلالت کرتا ہے، جلوسوں میں مولانا شوکت علی اور
 یروشلم کے مفتی اعظم پیش پیش تھے اور ان کے پیچھے تمام دنیا کے ماتم کرنے
 والے ہزاروں کی تعداد میں ساتھ ساتھ آ رہے تھے، تابوت بالکل مقبرہ
 تھا، قاہرہ، عمان، یونس وغیرہ ممالک سے آئے ہوئے اصحاب نے پرورد
 مرنے پڑے، جب تابوت بیت المقدس میں پہنچا تو مجمع اس قدر بڑھ گیا تھا
 کہ بہت مشکل سے تابوت گاڑی سے باہر نکالا جاسکا، مسلمانوں، عیسائیوں
 اور خوامین کے وفد یکم صاحبہ محمد علی کی خدمت میں حاضر ہوئے دو لاکھ سے
 زیادہ مردوں عورتوں کا مجمع تھا جو جلوس کی صورت میں اسٹیشن سے حرم
 شریف تک تابوت کے ساتھ آیا، سڑکوں کے دونوں طرف مکانوں کی
نظارہ | کھڑکیاں اور جھنڈیں آدمیوں سے بڑی بڑی تھیں، ہر طرف آدمیوں کے

سرہی سر نظر آتے تھے، لوگوں کا سڑک پر سے گزرتا شکل ہو رہا تھا، تابوت کوئی تین گھنٹہ میں حرم شریف پہنچا، سب قوموں کے معززین، برطانوی حکومت کا نمائندہ، امیر عبداللہ اور شاہ حسین کے قونصل اور ہر شہر کے پرنٹنٹ اور گریک چرچ کے مذہبی پیشوا اس وقت موجود تھے اور سب نے تعزیت کی، بعد نماز جمعہ جنازہ کی نماز پڑھی گئی، مسجد قحطی کے اندر اور باہر سائے صحن میں مردوں اور عورتوں کا بڑا زبردست مجمع تھا، ہزاروں خواتین کی موجودگی جو چار چار کی صورت میں برقعہ اوڑھے ہصف بستہ کھڑی تھیں، نہایت متاثر کن تھی، تابوت صخرہ شریف کے آگے رکھا گیا اور تمام مشہور مسلمانوں نے آخری تقریریں کیں۔

اور اس طرح بالآخر ہندوستان کا یہ سپوت آب و گل کے جھگڑوں اور آلائشوں سے چھوٹ کر ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو گیا۔

مولنا سید سلیمان ندوی کا اثر | مولنا سید سلیمان ندوی نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا کہ

”تو ملت کا عزادار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو، تو امت محمدیہ کا سوگوار تھا، فرض ہو کہ پوری امت محمدیہ تیرا سوگ کرے، تو نے دنیا سے اسلام کا ماتم کیا تھا، منراوار ہو کہ دنیا سے اسلام تیرا ماتم کرے، ہندو کا ماتم دار، طرابلس کا سوگوار عراق کے لئے غزوہ، بلقان کے لئے لشکر کشا، پرگیاں، انگورہ پر مریخ خواں، حجاز کا سوختہ غم ادبیت المقدس کے لئے وقف، لم، لے ہند کے آوارہ گرد مسافر، تیرا حق سرزمین اسلام کے چپے چپے پر تھا، مناسب یہی تھا کہ تیرے لئے اولین قبلہ اسلام کا سینہ پھٹ جائے اور تو یہیں سنبھلا“

باب ۲۸

جلوس اور جلسے

عام حالت | محمد علی کی خبر وفات ایسی نہیں تھی کہ اپنا اثر ظاہر کئے بغیر رہتی، اس کی شخصیت ایک عالم سے اپنا لوہا منو چکی تھی، اسی لئے ایک عالم نے اس کا ماتم کیا ملک غیر میں جہاں جہاں محمد علی کا نام اور محمد علی کی شہرت پہنچی تھی، وہاں اس کی وفات پر ماتم کیا گیا۔

کابل میں ماتم | ہندوستان کے پڑوسی ملک "افغانستان" نے بھی محمد علی کا دل کھول کر ماتم کیا، ہاجرین ہند کے اس جلسہ تفریت میں ہر محب شاہ نادر خاں فرمانروائے افغانستان نے بقیہ نفس شرکت کا ارادہ کیا اور بعد کو ایک خاص مانع کے سبب وہ نہ آ سکے تو اس جلسہ میں اپنے وزیر اور اسٹاف کو اپنی نمائندگی کے طور پر شرکت کے لئے بھیجا۔

ہندوستان میں ماتم | ہندوستان میں جب یہ خبر پہنچی ہے تو سارے ہندوستان پر ایک شٹاٹ چھا گیا، اور گو اس زمانہ میں تحریک سول ناسابعت جاری تھی جس کے محمد علی سخت مخالف تھے، مگر پھر بھی ہندوستان بھر میں ان کا زبردست ماتم کیا گیا جلوہ نکالے گئے، تقریریں کی گئیں، ان کے خدمات سر لہے گئے اور ان کے کارنامے بیان کئے گئے اور اس اظہارِ غم و الم میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے جس طرح خلافت کمیٹیوں اور محمد علی کے ہم خیالوں نے ان کا سوگ منایا، بالکل اسی طرح کانگریس کمیٹیوں اور ہندوؤں نے محمد علی کے ماتم میں حصہ لیا اور ہر مال وغیرہ سبیل انھوں

نے اپنے کو برابر کا شریک و ہم ثابت کیا۔

لکھنؤ کا جلسہ | لکھنؤ کا جلسہ چونکہ راقم الحروف کے سامنے ہوا تھا اس لئے اس کے متعلق تفصیل سے بتایا جاسکتا ہے تاکہ لکھنؤ کے جلسہ سے دوسرے جلسوں کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے۔ اس خبر کے پھیلنے ہی لکھنؤ پر حزن و الم کا بادل چھا گیا، ہر شخص متاثر تھا، عام اس سے کہ وہ محمد علی کے خیالات سے اتفاق رکھتا ہوا اختلاف۔

مولانا ظفر الملک کا تاثر | چنانچہ راقم الحروف مولانا ظفر الملک کی خدمت میں حاضر ہوا اس خبر بد کی اطلاع کو دور روز گزر چکے تھے، بریلیل تذکرہ محمد علی کا ذکر آگیا تو ظفر الملک صاحب کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ آنسو روکنا چاہتے تھے مگر نہیں روک سکے، انہوں نے بولنا چاہا مگر گریہ گلوگیر ہو گیا، یہ منظر اتنا موثر تھا کہ بیان نہیں کیا جاسکتا، یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ مولانا ظفر الملک صاحب کو محمد علی کی آخری آرا و افکار سے سخت اختلاف تھا اور کچھ ہی عرصہ پیشتر وہ گزشتہ تحریک سول نافرمانی (نہم سازی) کے سلسلہ میں جیل سے رہا ہوئے تھے۔

دوسرے روز پھر حاضری کا اتفاق ہوا، پھر اس روز بھی ممدوح کے دفور تاخر کا یہی عالم تھا۔

جلسہ کے انتظامات | مسلمانان لکھنؤ کے اظہار غم و الم کے لئے لکھنؤ کے ہر طبقے کی طرف سے ایک جلسہ کا اعلان کیا گیا، اور ہڑتال کا مطالبہ کیا گیا۔

ایک دوسرا جلسہ | اس جلسے کے انتظامات ابھی مکمل نہیں ہوئے تھے لیکن سلسلہ جاری تھا، اس سے ایک روز پیشتر لکھنؤ کی ”اسٹوڈنٹس یونین“ نے ایک عظیم الشان جلسہ کے انتظامات کئے، جس میں لکھنؤ یونیورسٹی، دارالعلوم ندوۃ العلماء، کرسچین کالج، جوہلی کالج، شیعہ کالج، امین آباد مسلم ہائی اسکول، حسین آباد ہائی اسکول کے تمام طلبہ نے نہایت

سرگرمی و مستعدی سے حصہ لیا اور شام کو وہ بجے نظیر آباد سے طلبہ کا ایک جلوس ہزاروں تاشائیوں کے ساتھ ننگے سر، بازو پر سیاہ نشان باندھے، دو دو کی صف میں چلا۔ اس نے قیصر باغ، روشن دولہ، گولہ گنج، مولوی گنج، خیالی گنج، اور امین الدولہ پارک کی طرف کے تمام حصوں میں گشت کیا، اور پھر گنگا پرشاد میموریل ہال میں داخل ہوا، حاضرین کی کثرت سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، تل رکنے کی گنجائش نہیں تھی اور پرکی گیلریاں بھی آدمیوں سے پرتھیں۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک طالب علم کی صدارت میں وہ جلسہ ہوا اور بہت دیر تک جاری رہا، لکھنؤ یونیورسٹی دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دوسری درسگاہوں کے طلبہ نے نہایت پر جوش اور درد انگیز تقریریں کیں، خوش قسمتی سے راقم الحروف کو بھی اس جلسہ میں تقریر کرنیکا اعزاز حاصل ہوا

اصل جلسہ | دوسرے روز اصل جلسہ بڑی شان و شوکت سے منعقد ہوا، پہلے تو رضا کاڈ کے تمام دستے جنھوں نے سائے شہر میں گشت کیا تھا، آئے پھر کانگریس کے والٹیر آئے، پھر دوسری انجمنوں کی کوریس آئیں اور پھر حاضرین آنا شروع ہوئے، حالت یہ تھی کہ امین الدولہ پارک میں آدمیوں کا سمندر لہریں مار رہا تھا، اور اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہیں تھی، ہر فرقہ، ہر جماعت، ہر خیال اور ہر مسلک کے عام و خاص خصوصاً عام لوگ موجود تھے۔
شرکاء | جلسہ کے مخصوص و ممتاز حاضرین میں بھی مختلف الخیال اور مختلف العقائد حضرات کا گروہ نظر آ رہا تھا، مثلاً قطب الدین عبدالوالی صاحب، صبغۃ اللہ صاحب شہید، غایت اللہ صاحب فرنگی محل، مولانا ظفر الملک صاحب، مولانا عبدالمجید صاحب دریا باوی، چودہری خلیق الزماں صاحب، مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی پنڈت ہر کرن ناتھ مصرا، اس کے

علاوہ اور بہت سے معززین ہندو مسلم شریک تھے۔

مولنا صفی کی نظم | مولنا صفی نے اپنی دلگداز نظم سے حاضرین کو تڑپا دیا، وہ نظم اپنے موقع سے آئے گی، اسی طرح اور دوسرے حضرات نے تقریریں کیں اور مرتے پڑے اور اپنے غیر معمولی غم و الم کا اظہار کیا۔

جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ بڑے عرصہ تک ہوتا رہا۔

راقم الحروف نے مولنا عبدالماجد صاحب دریا بادی سے اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ اتنی غیر معمولی کامیابی کا ارتقاع نہیں تھی، انھوں نے فرمایا ”حضرت جو ہر خود فرما گئے ہیں۔“

ہو تم تو نذر عشق نہ لکھیں وہ مرثیہ یہ بات ہے مروت اہل سخن کو دور

باب ۲۹

عام اظہار آرا

اخبارات :-

محمد علی کی وفات کے بعد ملک کے اکثر اخبارات و رسائل نے ”رئیس الاحرار نمبر“ بھالے، اور ان میں محمد علی کے سوانح و کوائف ان کے خدمات اور ان کی ایثار و قربانی پر زبردست مقالات لکھے، ان میں خاص طور پر قابل ذکر انقلاب مدینہ اور خلافت کے نمبر کہے جاسکتے ہیں، انھوں نے مواد پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس کے علاوہ عربی اخبارات نے بھی ان پر بہت کافی معلومات جمع کئے اور شائع کئے۔ مصر وغیرہ کے تمام اخبارات نے بڑے بڑے مقالات سیاہ جداولوں میں شائع کئے۔ اور بلا تفریق عیسائیوں اور یہودیوں اور مسلمانوں کے اخبارات نے اس حادثہ فاجعہ پر اپنی دلی تاسف کا اظہار کیا۔

مصر کی قوم پرور پارٹی ”وفد“ کا آرگن اخبار لکھتا ہے۔

المسار | ”دو دن ہوئے ہندوستان کے قلب و جگر پر ایک گہرا زخم لگا ہے، یہ زخم جو بد توں مندمل نہ ہو سکے گا۔ یہ زخم مولانا محمد علی کی انتہائی افوناک موت کی وجہ سے لاحق ہوا ہے، مرحوم ہندوستان کے ایک نہایت ہی جلیل القدر اور شاید سب سے زیادہ جرمی رہنما تھے، خدمت وطن میں انھوں نے بے شمار مصائب برداشت کیں اور بالآخر میدان جہاد ہی میں جام شہادت

نوش کیا۔

محمد علی فطرۃ انقلابی تھے اور جب ہم کسی کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ انقلابی ہے تو پھر یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ وہ برطانیہ کا دشمن ہو کیونکہ برطانیہ ہی سب سے بڑی ملک گیر طاقت ہے، محمد علی کی پوری زندگی برطانیہ کے خلاف جہاد میں گزری، یقیناً ہندوستان انھیں مدتوں یاد رکھے گا۔
اے مجاہد اعظم فردوس ہیں لازوال زندگی حاصل کر اور پروردگار سے التجا کہ تیرا وطن اور سارا مشرق جلد آزاد ہو جائے، وہ مقصد جس کے لئے تونے

جان دی ہے“

المقطم | عیسائیوں کا اخبار المقطم لکھتا ہے:-

”لندن سے ہمیں یہ جانکاہ خبر پہنچی ہے کہ مولائی محمد علی کا انتقال ہو گیا مولائی محمد علی ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے رہنما اور دنیا کے مسلم رہنماؤں میں ایک بلند تہ کے مالک تھے، انھوں نے اسلام ہندوستان اور پورے مشرق کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔
یہ تو تھے عربی اخبارات کے دو بلند تر اخبارات کے انکار و آراء، اب انگریزی اخبارات پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیجئے۔

ڈیلی اکسپریس | ڈیلی اکسپریس لکھتا ہے:-

”مولانا محمد علی موت کی آغوش میں انگلستان تشریف لائے، تاکہ گول میز کانفرنس کی شمولیت کر کے اپنے ملک و ملت کی بہترین خدمات انجام دیں، ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آخری وقت بالکل قریب ہے اور

ان کو بتایا گیا تھا کہ وہ چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے لیکن باوجود اس کے روحانیت کے اس جذبہ کے ماتحت جواہل مشرق کو مخصوص ہے اپنے اپنی زندگی کی آخری رات بھی ڈیلی گتیوں کو اپنا آخری اور الوداعی پیام لکھوانے میں گزار دی تاکہ کسی طرح فرقہ دارانہ پیچیدگی کو سلجھا کر وطن کی آخری خدمات سرانجام دیں، اپنے لندن ہوٹل میں داعی اہل کو لبیک کہا، والیا ملک اس قائد اعظم کی بالیں پر اشکبار تھے، ایک ہاتھ اپنی عاشق زار بیگم کے ہاتھ میں اور دوسرا اپنے شیدائی برادر بزرگ کے ہاتھ میں جو تمام اہل آئرلینڈ میں سفر کرتے ہوئے موت سے چند ہی گھنٹے پہلے پہنچے تھے ہندوستانی شہزادہ باربارکہ میں آتے تھے اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے تھے۔

ٹائمز آف انڈیا | ٹائمز آف انڈیا کا لندنی واقعہ بھار جو غالباً اس کا کوئی سابق ایڈیٹر ہے لکھتا ہے:-

”مرحوم کے ساتھ میری دوستی سا لہا سال سے چلی آرہی تھی جبکہ وہ ہمارے ریاست بڑودہ میں محکمہ اونیون کے افسر تھے اور اس تنگ حلقے کی بے لطفیوں کی تلانی مضمون نگاری سے کیا کرتے تھے جب وہ (ابکی) لندن آئے اور میں ان سے ملا تو مجھے ان کی صورت دیکھ کر بہت صدمہ ہوا، وہ اہل میں برب مرگ تھے اور اس حقیقت سے خود بھی آگاہ تھے لیکن وہ کانفرنس کی ایک نہایت طویل اور بے حد دل کش تقریر کرنے تک زندہ رہے مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں امن اور صلح کے لئے آیا ہوں۔“

باب

عام اظہار آرا

اقوال مشاہیر:

ملک معظم اور مسٹر میکڈونلڈ وزیراعظم کے علاوہ خاص خاص حضرات کے تاثرات یہ ہیں:-

مولانا شوکت علی - میراجائی ایک بہادر اور شجاع سپاہی تھا جس نے لڑتے لڑتے میدان جنگ میں جان دی۔

مولانا حسرت موہانی - اسلام کے سپاہی کے لئے اس سے بہتر اور کیا انجام ہو سکتا ہے کہ اس نے لڑتے ہوئے اپنی جان دی۔

مولانا حسین احمد - مولانا محمد علی آزاد کی سب سے بڑے علمبرداروں میں سے تھے اور انھیں اپنے ملک کی سیاسی نجات کے ساتھ خاص شغف تھا، ان کی نظر، سیاسی، مذہبی اور فقہی معاملات میں اس بلندی پر پہنچ جاتی تھی، جہاں تک ہر شخص کی نگاہ کا پہنچنا محال ہے۔

سروباش چندربوس (میر کلکتہ کارپوریشن) - مولانا ایک بلند ارادہ اور عظیم انظیر قائد تھے جو صرف اول میں مصروف جنگ تھے، آپ کی سرگرمیاں صرف مادر وطن تک محدود تھیں بلکہ آپ کی نگاہ وسیع ترقی اور اتحاد مشرق آپ کی زندگی کا خواب تھا، مولانا میرے ذاتی دوست تھے، حال ہی میں چند امور میں مولانا

محمد علی سے اختلاف ہو گیا تھا لیکن بلاشبہ اور بلا خوف تروید کہا جاسکتا ہے کہ ان امور میں جن میں لوگ ان سے متفق نہیں تھے، مولانا کا مقصد محض خدمت خلق تھا۔ مولانا کی زندگی آنے والی نسلوں کے لئے ہمیشہ ایک قابل تقلید مثال ہوگی۔

فیڈرل سب کمیٹی کے ارکان - مولانا محمد علی ایک ایسی شخصیت تھے جنہوں نے اپنے فرض کی حمایت میں اپنی کمزوری اور تکالیف کا مطلق پاس نہ تھا۔ مسٹر جیکر - مولانا محمد علی ہندوستانی سیاسیات میں ایک اہم سستی تھے اور انہوں نے قومی مفاد کی زبردست خدمت انجام دی۔

سسر، سی پی، راماسوامی، آئزر - مولانا محمد علی ایک طاقتور اور با اثر شخصیت تھے۔ لارڈ رینڈنگ - مولانا محمد علی زبردست قوت عمل کے مالک تھے، وہ اپنے عقائد کو نہایت پختگی کے ساتھ پیش کرتے تھے ان کی ہمت اور جرأت کو دیکھتے ہوئے ہمارے قلوب میں تعریف و توسیف کا جذبہ موجزن ہے۔

سرجایس نے رکن حکومت ہند - مولانا محمد علی نے ملک و قوم کو اپنی مشکلات پر ترجیح دی اور بالآخر ملک و وطن پر فدا ہو گئے۔ مسٹر آرتھر مور - مولانا محمد علی ایک شیر دل سپاہی تھے۔

سسر ہری سنگھ گوڑ - مولانا محمد علی نے ہندوستان کی جو خدمات انجام دیں، وہ تاریخ ہند کے صفحات پر ہمیشہ یادگار رہیں گی، ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو مرحوم کی حب الوطنی سے انکار کر سکے۔

سرتیج بہادر سپرو - میں مولانا محمد علی سے تیس سال سے واقف تھا، ان کی شخصیت شاندار اور زوردار تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے ملک سے

بہت محبت کرتے تھے اور ان کی وفات ایسے وقت میں ہوئی جبکہ ہندوستان کو ان کی اشد ضرورت تھی۔

سراکبر حیدر می - مولنا محمد علی نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک ملک کی خدمت کی۔ مشہور مصنف ایچ جی، ولیمز - مولنا محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا، ان کی زبان برک کی زبان تھی، ان کا قلم میکائیل کا قلم تھا۔

مسٹر بن وزیر ہند - محمد علی ایک طویل القدر مسلمان، ایک زبردست محب وطن اور عام انسانیت کے ایک عظیم القدر پیشوا تھے۔

لارڈ ویل سابق وزیر ہند - مولنا محمد علی میرے رفیق کار تھے، اور مجھے ان کے انتقال سے بے انتہا ہیچ ہوا ہے۔

مسٹر فزبرا کوے ممبر پارلیمنٹ - مولنا محمد علی بہترین دل و دماغ کے مالک تھے۔ لارڈ سینکے - مولنا محمد علی اول و آخر ہندوستان کی فلاح و بہبود کے طالب تھے سر محمد شفیع - مولنا محمد علی محب وطن وراثت شعار انسان تھے۔

پنڈت موتی لال نہرو - مولنا محمد علی میرے پرانے دوست، بچہ مسلمان اور زبردست شخصیت تھے۔

کلکتہ کارپوریشن کے ارکان - مولنا محمد علی کی قبر پر امن، اتحاد اور رواداری کا مندر تعمیر۔

امین الحسینی مفتی فلسطین - محمد علی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے سب کچھ قوم و ملت اور اسلام کے لئے قربان کر دیا۔

ہمارا جبریکا نیر - مولنا کاکیر کیر اعلیٰ اور اوصاف پندیدہ تھے۔

مسٹر بھروچہ - مولنا ایک سحر بیان مقرر، صاحب قلم، بہادر جنگجو، اسلام کے پر جوش اور سچے پیرو تھے۔

مدیر ٹائمس لندن - محمد علی اصول کے لئے جئے، اصول کے لئے مصیبت اٹھائی اور اصول کے لئے مرے۔

مولنا سید سلیمان ندوی - افسوس وہ پرورد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۰ء تک ہندوستان اور دنیا کے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صورت بن کر بلند ہوتی رہی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی، وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بیتاب ہو جاتا تھا اور اوروں کو بیتاب کرتا تھا قیامت تک کے لئے ساکن ہو گیا، وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں جسے تاکہ ان کی روانی ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی، وہ متر فم جب جو ہر زرم میں خوشنوا بلس بن کر جھکتے تھے، ان کے ترانے اب ہائے کان نہ سنیں گے، و آتش زبان جو ہر زرم میں تیغ براں بن کر حکمتی تھی، اس کی تابش اب کسی سرکہ میں ہمارے آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پر جوش سینہ جو ہائے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہا لجاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ کے لئے ٹھم گیا، وہ پر زور دست و بازو جو شب و روز کی خدمتگزاری اور نبرد آزمانی میں مصروف تھے۔ وہ اب ایسے تھکے کہ پھر اٹھیں گے اور افسوس کہ شکست خواہ وہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعدا کے زرعہ میں تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گر کہ پھر نہ کھڑا ہو گا، الوداع! محمد علی، الوداع! والسلام الی یوم القیام!

مسٹر رملوی ایڈیٹر پبلیٹی کریٹیکل - مولنا محمد علی کی وفات سے صرف مسلمانان ہند ہی کو

نہیں بلکہ تمام ہندوستان کو ایک نقصان عظیم پہنچا ہے، ان کی زندگی ہائے ...
ایک انمول تحفہ تھا۔

مسٹر جی کے، نریمان - میرے قلب پر محمد علی کی صاف گوئی، اور کشادہ دلی کا بہت
اثر ہے، محمد علی زبردست سیاست دان تھے اور بہت سی سیاسی مجالس میں
ان کی فتح کا باعث ان کا وہ بی مثال کیرئیر ہوتا تھا، جس نے ملک معظم تک سے خرچ
تحسین حاصل کر لیا، مجھے محمد علی کی وہ مخصوص خصائل پر رشک آتا تھا ایک یہ کہ وہ
خطرہ کے نازک ترین وقت پر بھی اپنی عقل و حواس کو قابو میں رکھتے تھے اور
دوسرے یہ کہ ان کی طاقت کا خزانہ ہمیشہ معمور رہتا تھا۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی - مولانا مدوح اپنے ایک گرامی نامہ میں مولانا
عبدالماجد صاحب مدیر پیچ کو تحریر فرماتے ہیں :-

”محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے بیان نہیں کر سکتا، خدا جلنے
کتنی دفعہ دعا کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں، مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد
اور اس اعتقاد کی بنا پر محبت ہو۔ وہ صرف ایک صفت مسلمانوں کی سچی
محبت بے غرض ہے، باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں
میں نے کبھی دیکھا نہیں، اس لئے ایک ہی صفت سے محبت ہر اور
کو میں روح الصفات سمجھتا ہوں“ اشرف علی

باب

نذر عقیدت

مرثیوں کی صورت میں!

محمد علی کی وفات ایک ایسا سانحہ کبریٰ تھا کہ ہر طبقہ اور ہر جماعت نے ان کے غم و الم میں نمایاں حصہ لیا، چنانچہ ان کی وفات پر چہاں تقریریں ہوئیں، جلسے ہوئے، تجویزیں پاس ہوئیں، مضامین و مقالات لکھے گئے، اکابرین ملک نے بیانات کی صورت میں اپنے غم و الم کا اظہار کیا، وہاں شعرا نے اپنے جذبات کو اشعار کی صورت میں مدون کیا، اور محمد علی کے حضور میں اپنا یہ خراج عقیدت، بصد نوح و تعب پیش کرنے کا افتخار حاصل کیا۔

ان محدود صفحات میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ وہ سارے مرثیے آپ کی خدمت میں پیش کئے جاسکیں، مجبوراً چند پر قناعت کرنی پڑتی ہے اور ان میں بھی اختصار و اقتصار سے کام لینا پڑتا ہے، سیرۃ کے آئندہ مطول ایڈیشن میں کوشش کی جائے گی کہ تمام قابل ذکر مرثیے، بہت سارے شائع کئے جاسکیں۔

اس سلسلہ کا آغاز مشرق کے زبردست شاعر علامہ اقبال کے ان چند اشعار سے کیا جاتا ہے جو گو تعداد میں کم ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان چند اشعار کے اندر محمد علی کی سیرۃ اور خصوصیت کا پورا مرقع علامہ مدوح نے پیش کر دیا ہے۔

۱۔ اقبال

یک نفس جان نزار اتپسید اندر فرنگ تا مژہ برہم ز نیم از ماہ و پروں در گذشت

لے خوشامشت غبار او کہ از جذبِ حرم از کنار اندلس و از ساحل بر برگزشت
خاکِ قدس اورا بر آغوشِ تمنا در گرفت سوئے گردوں و رفتِ رہے کہ پیغمبرِ گزشت
می نہ گنجِ جزیرِ آں خاکے کہ پاک از زنگِ بوت بندہ کو از تمیزِ اسود و احمر گزشت

جلوۂ اوتا بد باقی بہ چشمِ آسیاست

گرچہ آں نورِ نگاہِ خاور از خاور گزشت

۲۔ مرگِ غربت

(از مولانا صفی لکھنوی)

کیوں اشکبار بند نہ ہو صورتِ سحاب مغرب میں جب غروب ہو مشرق کا آفتاب
وہ مردِ ذی کمال کہ جس نکتہ سنج کی تحریرِ بے نظیر تھی قفسِ سریرِ لاجواب
اسلامیوں کے واسطے سینہ سپر وہ شیر تیغِ زباں سے موکہ آرا و فتیاب
آزادی وطن کی تمنا کا خضرِ راہ وابستہ جس کے شیب سے تھا قوم کا شباب
مسلم ہوں یا بنود ہوں وہ چاہتا یہ تھا اپنے وطن کے دونوں نہیں مالکِ الرقاب
وہ نچتہ مغر فائدِ عظم، بلند فک ہر دم تھا جس کے پیش نظر جاوہ صواب
وہ حق پسند جس کی زباں پر چڑھی ہوئی اللہ کے رسول پر اتری ہوئی کتاب
آزادی وطن کے لئے دیکے نقد جان پتا ہے وہ سافرِ احسان
ہر صوبہ بے رہا ہے جسے دعوتِ قیام آنکھیں بھپا رہی ہر لمحہ برفِ فرشِ خواب
جس بے نوا کی قبر پہ چھڑکاؤ کے لئے آمادہ طفلِ اشک بھرے شیشہ گلاب
بیاختہ زباں پہ یہ جباری ہوا صفی دشتِ اثرِ خبر سے بڑھا جبکہ اضطراب
ہنگامِ نزع قوم ہی کا دل میں در تھا حقِ مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

۳۔ جوش

ہندوستان کے مشہور شاعر حضرت جوش ملیح آبادی نے بھی محمد علی پرچہ اشعار کے
ہیں اور حق یہ ہے کہ جوش نے اپنے اشعار میں سوز و گداز اور حقیقت و بیان و واقعہ کا بہت کمال
امتزاج کیا ہے، اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

لے کر تھاناخن پہ تیرے عقدہ حق کا مدار	لے متاع بروہ ہندوستان و ایشیا
ختم تھی قدموں پر تے نیرنگی لیل و نہار	غش تھا کاوش پر تری اندازہ صبح و سار
موت جس عالم میں مٹی ہو حیات پامدار	لے غرور ملک ملت تو دواں لیتا تھا سانس
سیرت پیغمبر اسلام کے آئینہ دار	وقت کے سیلاب سے تیرا سفینہ ہے بلند
جس بہادر زندگی کو موت پر آتا ہو پیار	تجھ کو بخشی تھی مشیت نے وہ برتر زندگی
لے دل ہندوستان کے غم تند و استوار	تیرے آگے لرزہ بر اندام تھی روح فرنگ
تھی حسین ابن علی کی استقامت آشکار	ظننے سے تیری ہمت آفریں آواز کے
تیرے ہیچے میں لکھتی تھی وہ تیغ آبادار	دوب جاتی تھی دل ہل میں لہراتی ہوئی
اہل بدعت کی کلائی خنجر قاتل کی دھار	موڑ کر رکھ دی تھی تو نے جنگ کے میدان میں
لے کر ہمت تھی تھی تو شہنشاہ سلطان شہکار	تجھ سے آتا تھا پسینہ افسروں اور جنگ کو
خون میں تیرے دولت تھا مزین ذوالفقار	خون میں تیرے نہاں تھی خنجر نبض علی
تیری فطرت میں تھی نہاں سطوت پرورگار	تیری سیرت میں تھی صغر صولت پیغمبری

روئے ملت پر ہے تیری موت کی تابندگی
کچھ ہوئی جاتی ہے اتھے پر کلاہ افتخار

۴۔ سر پھرا ملاح

(از حفیظ جالندھری)

حضرت حفیظ نے اپنی یہ نہایت ہی پسندیدہ نظم یہاں جامعہ میں جامعہ کے یوم تہیں ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے موقع پر سنائی تھی ایسر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب بھی موجود تھے۔
حفیظ صاحب نے جس وقت نظر سے محمد علی کے ماحول اور کردار کی نقاشی کی ہے وہ ہر شخص کا کام نہیں، یہ انھیں کے موقف کو قدرت حاصل ہے۔

نظم اپنے کیف و تاثر کے اعتبار سے اس کی مستحق ہے کہ وہ بلا کم و کاست پوری کی پوری شائع کر دی جائے لیکن قلت گنجائش کی وجہ سے ہم اپنی یہ تنابھی آئندہ ایڈیشن کے لئے اٹھائے رکھتے ہیں اور اس صحبت میں صرف چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

نہنگان اجل کی نیتیں بیدار پرائیں	شب تاریک بیم موج، گردابے چنین حاصل
فضا کی سسکیاں قسمت کا رونا، موت کھنٹنا	غضب تھا اک شکستہ ناؤ کا منہ جا بھینٹنا
ہولے آب کے جنوں کو شیطانوں سے لڑا تھا	فقط اک سر پھرا ملاح طوفانوں سے لڑا تھا
یہ سب ملاح کے ہم قوم تھے یعنی مسلمان تھے	اگرچہ ناؤ میں انبوه در انبوه انسان تھے
مگر آرام سے لیٹے ہوئے تھے ناؤ کے اندر	یہ سب تھے عقل و جرات میں ارسطو اور اسکندر
ابھرتی بیٹھتی، دہتی، دوباتی اور چکراتی	چلی جاتی تھی کشتی شملگیں موجوں سے لکراتی
کبھی اس کے اٹاے پر کبھی آسکے اٹاے پر	کہیں گرداب کے منہ پر کہیں پر شور مٹاے پر
پہاڑا ٹھٹھا کے ٹکراتے تھے پانی کی جھپٹیں	ہوائی دوش پر خونخوار عفرتوں کی فوجیں تھیں
کہ طوفان میں نظر آتی تھی خامی بالکالوں کو	تعجب ہو کوئی پروا نہیں تھی ناؤ والوں کو
گھڑی بھر میں یہ ٹیرا اب نہ تیرا ہو نہ میرا ہے	انھیں معلوم تھا طوفان نے کشتی کو گھیرا ہے

انہیں دعویٰ تھے بحر زندگی میں ناخدائی کے
یہ طوفانوں پر کر سکتے تھے لہجے دار تقریریں
انہیں گریا دتھے گرداب میں شکل کشائی کے
دکھا سکتے تھے تقریروں میں طوفانوں کی تصویریں
ہوا کا رخ ذرا بدلے تو سب کچھ جان جائے تھر
یہ سب جو پانوں پھیلائے ہوئے کشتی میں بیٹھ تھر
پرنے ناخداؤں اور ملاحوں کے بیٹے تھے

مگر وہ سر پھرا ملاح تھا کیسا تھا
وہ چلاتا تھا اٹھو، بھائیو، ہمت کرو، آؤ
ادھر پانی کی شدت تھی ادھر موجوں کا ریا تھا
ذرا ہمت دکھاؤ دست و بازو کام میں لاؤ
ادھر سیلاب پھر آتا ہوا معلوم ہوتا ہر
یہ گرداب بلا شاید دہان گور ہو جائے
نہیں ہنگام سونے کا کھڑے ہو جاؤ تن جاؤ
حوادث کے مقابل آہنی دیوار بن جاؤ

وہ چلایا وہ چنیا، منتیں کیں آہ وزاری کی
نہ آمادہ ہوا کوئی بھی جرات آزمائی پر
شکستہ ناؤ کا ملاح بیدم ہو گیا آخر
گرا دریا میں چپو ہاتھ سے پتواری بھی چھوٹی
تھکن کا ہو رہا تھا اب اثر آہستہ آہستہ
وہی سر جو ہواؤں کی نہ طوفانوں کی جھکتا تھا
نہ جھکتا تھا کبھی میر و وزیر و شاہ کے آگے
تعب سے ردائے ابر میں سیرق نے جھانکا
مگر بے سود تھا سب کچھ کسی نے ٹھنی یاری کی
سبھی ہنتے رہے ملاح کی ہرزہ سرائی پر
بڑھا کر حوصلہ تن میں ہو کم ہو گیا آخر
شکستہ ہو گئے بازو مگر ہمت نہیں ٹوٹی
لگا جھکنے وہ سرفراز سر آہستہ آہستہ
نہ فزوں سے جھکتا تھا نہ ہاتوں کی جھکتا تھا
وہ سہرا ایک مرتبہ پھر جھک گیا اللہ کے آگے
کہ یہ اک آخری سجدہ تھا اس مرد مسلمان تھا

شکستہ ناؤ میں طوفاں کی اس چیر دستی میں
 وہ اپنا فرض پورا کر چکا تھا اس بھرستی میں
 یہ تو تھے ہندوستان کے شعرا نامدار کے نالہ ہائے دل نگار، لیکن مالک اسلامی کے
 شعرا نے بھی اپنے قطرات اشک کی نذر اس بارہ گاہ عالی میں چڑھائی ہے۔

۵۔ امیر الشعراء مصر کا مرثیہ

اجاز الشوریٰ "مصر میں احمد شوقی کا یہ بلند پایہ مرثیہ شائع ہوا تھا جس کے جذبہ
 اشعار کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے، پورا مرثیہ طوالت کے خیال سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔
 اے قدس! تو اپنی تربیت کے مہمان کی وجہ سے قابل مبارکباد ہے، آج تو اس کی
 ملاقات سے سرفراز ہو۔

نبیؐ نے اس کے لئے اپنے براق کے بیٹھنے کی جگہ کھول دی اور اس کے آنے کا
 مقام وہ ہو جہاں سے نبیؐ رات کو گئے تھے۔

مشرق کے حقوق کے لئے لڑنا اس کا کام تھا اور اسلام کا تفسیل اس کی عمار۔
 مشرق کے لئے جو اسے تڑپ تھی یا ہندوستان کے واقعات کے لئے اس کی بے خوابی
 اسے غریزہ ہندوستان فراموش نہیں کر سکتا۔

نیل اپنی مصیبتوں میں اس کی آواز کو یاد کرے گا، اور ترک اس کی سچی سڑپ کو فراموش
 نہیں کریں گے۔

آپؐ نے زندگی میں وہاں کے باشندوں کی مدد و معاونت کی تو آپؐ وہاں کے لئے
 اجنبی کیسے ہو سکتے ہیں؟

باب ۳۲

لحظے چند

بیت المقدس میں جب محمد علی لائے گئے اور ان کی نماز جنازہ ادا ہوئی تو مشرق کے چند بڑے بڑے بزرگوں نے تابوت کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے احساس قلب کا اظہار کیا تھا جن میں سے دو کے تاثرات مختصر اہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ احمد زکی پاشا

آپ نے مسجد اقصیٰ میں کھڑے ہو کر فرمایا۔

لے بزرگان مسجد اقصیٰ! اے ابنائے عرب! اور لے امت اسلام!

مولانا محمد علی کی زندگی جہاد کی ایک مسلسل لڑی تھی، زمانہ نے اسے دیکھا اور تاریخ نے اسے محفوظ کیا اور یہی نہیں بلکہ آج کے بعد لوگ ہمیشہ یہ دیکھیں گے کہ ہمیشہ کیلئے وہ قربانی کی انٹ یادگار رہے گا وہ اس امر کا عنوان رہے گا کہ وہ شخصیت کا سخت دشمن تھا۔

ہم اس کے گواہ ہیں کہ شہید اپنے ہم عصروں میں لسان صدق تھا اور ہمارے دل اس ایمان سے پر ہیں کہ خدا نے اس پر انعام کیا اور اس کو آخر میں بھی لسان صدق بنادیا۔

اس ہندوستانی لیڈر نے اپنی زندگی ملک کے لئے وقف کر دی تھی، اس نے اپنے ملک کی آزادی کے لئے وہ جہاد کیا کہ جہاد کا حق ادا کر دیا۔

فقید علم اور خادم اسلام پر خدا کی سلامتی۔

۲۔ شہزادہ محمد علی پاشا

محمد علی پاشا سابق وزیر اوقاف و زعم جماعت احرار مصر نے کھڑے ہو کر فرمایا۔
جنگ بلقان میں، جنگ عظیم میں، ترکوں اور یونانیوں کی لڑائی میں محمد علی نے جو کچھ
کیا وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا اور اس غرض کے لئے جو کچھ اسے جیل خانوں اور مالی تکلیفوں کا مقابلہ
کرنا پڑا وہ بھلایا نہیں جاسکتا۔

اس کا شعور اس خیال سے اس پر حاوی تھا کہ:
”قوت حق نہیں، لیکن حق قوت ہے“

اے معزز مسافر، یہ مصیبت بڑی ہے، تکلیف بھاری ہے، لیکن ہم صبر کے اجر سے
برداشت کر لیں گے، میں اس لئے آیا ہوں کہ تم کو سلام کہوں، تم مرے نہیں بلکہ زندہ ہو۔
ہماری نسلی تمہارے بعد تمہارے کام میں جو ہمیشہ رہیں گے، تیرے جانے سے قبل
تیرے اعمال آگے چلے گئے، انہوں نے جنات کے دروازے تیرے لئے کھول دیے اور
تیرے اقربا کے لئے بزرگی کو چھوڑ گئے۔

باب ۳۳ یادگار کی تجویزیں!

محمد علی کی وفات کے بعد سارے ہندوستان میں ان کی یادگار کا مسئلہ اٹھایا گیا اور ہر طرف سے مختلف تجویزیں پیش ہوئیں۔

مجموعہ کی تجویز | جناب نیا زفتح پوری نے نگار میں محمد علی کا نام کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ”زندہ“ قوموں کی طرح محمد علی کے لئے ایک مجسمہ تیار کرایا جائے جو ان کی یادگار کا کام دے۔
دائرہ سیاسہ | مولانا حسرت موہانی اور بعض دوسرے زعماء نے یہ تحریک کی محمد علی کی یادگار میں ایک دائرہ سیاسہ کی بنیاد ڈالی جائے جس میں محمد علی کے نظریہ سیاست کی تعلیم و تبلیغ ہو۔
جامعہ ملیہ | ملک کے ایک بڑے گروہ نے یہ تجویز پیش کی کہ محمد علی کو جامعہ سے جو تعلق تھا اور جامعہ کو اپنی تائیس میں محمد علی کے شرف و جود سے جو بزرگی حاصل ہوئی تھی اس کا تقاضا یہ ہو کہ جامعہ ملیہ کو محمد علی کی یادگار بنایا جائے، اور اسی پر ساری کوششیں صرف کر دی جائیں جلا زعماء قوم نے اس کی تائید کی اور ”برکت“ کے لئے مجلس کارکن میں ان تمام بزرگوں کے اسمائے گرامی بھی رکھے گئے، لیکن ان تجاویز کا جو نتیجہ ہوا، انھیں ناظرین ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

متفرق یادگاریں | لیکن اس بڑی یادگار کے علاوہ مختلف شہروں اور میونسپلٹیوں نے اپنی اپنی باط کے موافق جو کچھ امکان میں تھا اس سے دریغ نہیں کیا۔
دہلی میونسپلٹی | دہلی میونسپلٹی نے یہ یادگار مناسب سمجھی کہ اس کے ایوان میں محمد علی

کی تصویر آویزاں کر دی جائے۔

بہی کارپوریشن | بہی کارپوریشن نے دو سڑکیں ”محمد علی روڈ“ کے نام سے نامزد کر دیں، ابھی وہاں ایک ”محمد علی ہال“ کی تجویز بھی زیر غور ہے اس کا نتیجہ دیکھنے کب نکلتا ہے۔

الہ آباد میونسپلٹی | الہ آباد میونسپلٹی میں بھی یہ مسئلہ اٹھایا گیا، چنانچہ اس کے غیور ارکان نے فوراً یہ تجویز منظور کر لی اور ایک پارک ”محمد علی پارک“ کے نام سے اور ایک سڑک ”محمد علی روڈ“ کے نام سے نامزد کر دی، لکھنؤ میونسپلٹی کی خاموشی پر تعجب ہے۔ شاید اس کے صدر محمد علی کے ایک مشہور رفیق کا رشتہ۔

محمد علی میموریل ہائی اسکول | اجیر کے مسلمانوں نے مرزا عبدالقادر ایم اے ال ال بی (علیگ) اور معین الدین صاحب بی اے ال ال بی کی ساعی سے نہایت عمدہ یادگار قائم کی، یعنی بیاور میں ایک ”محمد علی میموریل ہائی اسکول قائم ہو گیا جس میں تعلیم جارہی ہے۔

علی گڑھ میں یادگار | علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں محمد علی کے پرانے دوست اور ساتھی مسٹر اسان الحق جج نے ایک تجویز ان کی یادگار کے متعلق پیش کی تھی۔

محمد علی کو علی گڑھ سے جو تعلق ہمیشہ رہا اس کا اقتضایہ تھا کہ محمد علی کی ایک یادگار وہاں ضرور قائم کی جائے چنانچہ سن ہے کہ وہاں بھی یہ معاملہ ”زیر غور“ ہے۔

تبصرہ | حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور تلخ اور پرمردہ کن حقیقت نہیں ہو سکتی کہ مسلمان قوم نے اپنے پیشواؤں اور رہنماؤں کی یادگار قائم کرنے میں ہمیشہ نکل اور تعاضل سے کام لیا، گو اس نے ماتم میں سینہ بہت زور زور سے کونٹا اور گریبان

بھی خوب چاک کئے۔

دقار الملک، محسن الملک، خود سر سید، سید محمود، شبلی، حالی، آزاد، اندیرا احمد
اجل خاں اعظم، ان بزرگوں میں کس کی ”یادگار“ قوم نے تیار کر دی جو خواہ مخواہ غوغا
کے شہات کا لطف اٹھانے کے لئے محمد علی کی یادگار کا مسئلہ پیش کر دیا گیا نتیجہ وہی
جو اس قسم کی ”آل انڈیا میموریل“ کمیٹیوں کا ہمیشہ سے ہوا کرتا ہے۔
کمیٹی بنی ہوئی ہے اس کے ارکان مصروف خواب ہیں، انہیں نہ یادگا
کے مسئلہ سے کوئی خاص عملی دلچسپی ہے نہ فکر، پھر محمد علی کی یادگار قائم ہو تو کیونکر؟

حصہ دوم بہد و عمل

باب

ملازمت

پہلے حصہ میں محمد علی کی سیرۂ کاوہ مرقع پیش کرنیکی کوشش کی گئی تھی جس میں محمد علی کے وہ خدو خال نمایاں ہو سکیں جن کا تعلق ان کی ذاتی زندگی سے تھا، یعنی اخلاق و عادات افتاد طبع اور رنگ مذاق، ابتدائی نشو و نما وغیرہ۔

لیکن اس حصہ میں یہ بتانا مقصود ہو کہ محمد علی کی علی زندگی کن کن صبر آزما ادوار سے گزری، ان کو ملک و قوم کی خدمت کی راہ میں کیسے کیسے بہت مشکل حالات و مصائب سے دوچار ہونا پڑا، اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنی بے نظیر قوت عمل، قوت فیصلہ اور قوت تدبیر سے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دے، نیز ان کی علی زندگی کی ابتدا کس طرح ہوئی اور کس طرح زچہ رفتہ وہ ”مسٹر“ محمد علی سے ”مولانا“ محمد علی ہو گئے۔

انگلستان سے واپسی | سول سروس کے امتحان میں ناکامی کے بعد محمد علی واپس بلاتے گئے اور رامپور میں ان کی شادی کر دی گئی، اب وہ تلاش معاش میں سرگرداں ہونے والے ہی تھے کہ ایک بار ان کے برادر بزرگ مولانا شوکت علی نے پھر مدت کی اور دوبارہ انگلستان بھیجا تاکہ وہ بی۔ اے کی ڈگری آکسفورڈ یونیورسٹی سے حاصل کر سکیں۔

انیکٹر جنرل تعلیمات رامپور | وہاں سے قابل رشک کامیابی کے ساتھ وہ واپس آئے اور نواب صاحب رامپور نے انھیں اپنی ریاست میں سب سے بڑا افسر تعلیمات بنا دیا اور اسی کے ساتھ رامپور ہائی اسکول کی پرنسپل شپ کے فرائض بھی محمد علی سے متعلق ہو گئے۔

سازش | محمد علی اپنے یہ دو گناہ فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کر رہے تھے لیکن جیسا کہ ریاستوں میں عام قاعدہ ہے، ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں کہ کسی طرح انھیں اس منصب سے معزول کر دیا جائے، اس لئے کہ ریاست کے ان لوگوں کی جو دربار میں کسی نہ کسی حد تک رسائی رکھتے ہیں یہ سب سے بڑی خوشگوار خدمت ہوتی ہے کہ وہ الی ریاست کو اعلیٰ عہدیداروں اور ریاست کے بھی خواہوں کے خلاف بھڑکاتے رہیں

نواب ناصر علی سے تعلقات | نواب ناصر علی خاں صاحب، جناب نواب حامد علی خاں صاحب والی راجپور کے برادر خور دھبی اس زمانہ میں آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے غیر ملک میں قدرۃ اپنے ہموطنوں سے زیادہ خصوصیت ہو جاتی ہے لہذا فطرۃ محمد علی کو نواب ناصر علی کے ساتھ زیادہ ارتباط اور انس ہو گیا، اور جب محمد علی ہندوستان واپس آئے تو نواب صاحب راجپور کی خدمت میں انھوں نے میجر اور معتبوب بھائی کا ہدیہ عقیدت و محبت پیش کیا۔

بس یہ چیز محمد علی کے لئے غضب ہو گئی اور اسی پر ساری سازش کی عمارت تیار ہو گئی۔ نواب صاحب کے کان اس طرح بھرے گئے کہ محمد علی نے اپنے زمانہ قیام انگلستان میں ناصر علی خاں سے سازش کر لی ہے اور یہ چاہتے ہیں کہ بندگان عالی متعالیٰ کو تخت حکومت سے محروم کر کے نواب ناصر علی خاں کو فرماں روا اے راجپور بنادیں۔

نواب صاحب مرحوم کے دل میں یہ بات جم گئی اور وہ محمد علی سے کبیدہ خاطر رہنے لگے اور اپنی کشیدگی کا اظہار اپنے طرز عمل سے ظاہر فرمانے لگے، یعنی ہر ایٹ ہوم، ڈنڈا اور سرکاری تقریب پر تمام قابل ذکر لوگ بلائے جاتے تھے، لیکن محمد علی کو عملاً نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

دل برداشتی | ان حالات سے محمد علی بہت دل برداشتہ ہوئے، اور اپنے لئے انھوں نے کوئی دوسرا گوشہ عمل اختیار کرنا چاہا کہ وہاں وہ بے غل و غش اپنی محنت، قابلیت، ذہانت مستعدی اور ایمان داری کا ثبوت دے سکیں۔

شوکت کی طلبی | چنانچہ انھوں نے مولانا شوکت علی صاحب کو جو اس وقت محکمہ انیون کے ایک انسر اعلیٰ تھے مارے کر بلایا، شوکت صاحب بھائی کا تار پا کر فوراً عازم رامپور ہوئے۔

محمد علی نے ان سے تمام حالات بیان کئے اور اس بہت شکن صورت حال کا تذکرہ نواب صاحب کے ملاقات | کرنا چاہا، چنانچہ شوکت صاحب ہربانس نواب صاحب رامپور سے ملے۔ ہربانس شوکت صاحب پر بچپن ہی سے بہت ہربان تھے، ہم عمر اور ساتھ کے کھیلے ہوئے بھی تھے، اس لئے شوکت صاحب نے بے تکلفی کے ساتھ نواب صاحب کی خدمت میں عرض حال کر دیا۔ اس وقت تو نواب صاحب مطمئن ہو گئے لیکن ایسی باتیں دل سے نکلتی کم ہیں، رفتہ رفتہ پھر وہی طرز عمل ان کے کردار سے ظاہر ہونے لگا۔

شوکت صاحب کا مشورہ | آخر شوکت صاحب کی یہی رائے قرار پائی کہ محمد علی رامپور سے استعفیٰ دیدیں اور کہیں اور قسمت آزمائی کریں۔

چنانچہ وہ استعفیٰ لے کر شوکت صاحب کے پاس چلے گئے اور ایک عرصہ تک خدمت صاحب ہی کے ”مہمان“ رہے اور فکر روزگار میں سرگرداں، اسی زمانہ میں الہ آباد یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان بھی دیا لیکن ایک مضمون میں ناکام رہے۔ بالآخر وہ برسر روزگار ہو ہی گئے۔

کنور فتح سنگھ سے تعلقات | کنور فتح سنگھ وسیع حکومت بڑودہ اور محمد علی سے دوران قیام

انگلستان میں بہت گہرے اور مخلصانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، کنور صاحب موصوف کی ایک عرصہ سے یہ تنہا تھی کہ وہ محمد علی کو اپنی ریاست بڑودہ میں بلوالیں۔

بالآخر انھوں نے اپنے والد کو مجبور کر دیا کہ محمد علی بڑودہ ضرور بلوائے جائیں اور ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے۔

بڑودہ میں تقرر | چنانچہ ہمارا راجہ صاحب بڑودہ نے انھیں نہایت شفقت سے بلایا اور بڑی محبت سے رکھا، اور محکمہ ایفون میں ایک اعلیٰ منصب پر تقرر کر دیا۔

حیرت انگیز ذہانت | محمد علی وہاں کی زبان سے نا آشنائے محض تھے، اس لئے ان کے تقرر کے وقت یہ شرط بھی لگا دی گئی تھی کہ جب تک وہ وہاں کی زبان سے واقف نہ ہو جائیں اور عرائض وغیرہ خود نہ سمجھ سکیں، اس وقت تک فیصلہ پر محمد علی کے ساتھ ایک دوسرے افسر کے دستخط بھی ہوا کریں گے تاکہ کسی قسم کی غلطی نہ ہونے پائے۔

محمد علی اس شرط کو اپنے اوپر ایک پابندی خیال کرتے تھے، اس لئے انھوں نے چند ہی مہینہ کے اندر اس زبان پر اتنی دسترس حاصل کر لی کہ عرائض وغیرہ کو پورے طور سے سمجھنے لگے، اس کے بعد وہ شرط منسوخ ہو گئی۔

کارگزاری | محمد علی نے وہاں جاتے ہی اپنی کارگزاری اور مستعدی کے حیرت انگیز ثبوت دینا شروع کئے، محمد علی نے بڑودہ میں کم و بیش سات سال تک ملازمت کی اور پانچ سال کی قلیل مدت میں انھوں نے سترہ لاکھ کا خالص منافع کرایا، جو گزشتہ سالوں کے اوسط منافع سے دو ہزار پندرہ فیصدی کی تعداد میں زیادہ تھا۔

یہ غیر معمولی کارگزاری اور حسن انتظام کا کارنامہ ایسا تھا جس نے ہمارا راجہ کی نظر میں محمد علی کو اور زیادہ وقیع اور زیادہ محبوب بنا دیا، اور ”گیلوار بڑودہ“ کی شفقتیں بہت زیادہ

بڑھ گئیں، چنانچہ اسی کارگزاری کے صلہ میں محمد علی کو ریاست کے ضلع نوساری کا کمشنر مقرر کر دیا گیا۔

نوساری کی کمشنری | اس منصب جلیل پر پہنچ کر محمد علی کی قوت عمل میں اور اضافہ ہو گیا یہاں انھوں نے متعدد اصلاحات نافذ کیں اور خصوصاً گراں قیمت پر زمین خریدنے کے متعلق غریب پر جو ظلم ہو رہا تھا اس کا پورے طور سے استیصال اور قلع قمع کر دیا، اس کا ردوائی نے انھیں اور زیادہ مقبول، ہر دلعزیز، اور لوگوں کی نظروں میں محبوب بنا دیا۔
دیانت و امانت | ”دوران ملازمت میں آپ کی دیانت و امانت کے متعدد ثبوت ملے، مثلاً ایک دفعہ ایک ٹھیکے کے سلسلہ میں آپ کو ایک بہت بڑی رقم بطور ہدیہ مل رہی تھی، آپ کو بتایا گیا کہ یہ ریاست کا ایک دستور قدیم ہے، اور سب افسر اس قسم کے ہدایا قبول کر لیا کرتے ہیں، لیکن آپ نے بہت سختی سے انکار کر دیا، بلکہ دوسرے افسروں کو بھی اس ”لقمہ تر“ کے اُگلنے پر مجبور کیا۔“

نوساری کی کمشنری کے زمانہ میں دولتمند اور ذمی اثر پارسیوں کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور زمین کی جبری خریداری کے دستور قدیم کو قائم رکھنے کی استدعا کی، لیکن آپ نے فرمایا کہ ”جب ظلم معلوم ہو جائے تو پھر مجھ سے اس کی پروہ پوشی نہیں ہو سکتی۔“

پرنل اسٹنٹ | اس کے بعد محمد علی ولعہد ریاست (کنور فتح نگہ) کے پرنل اسٹنٹ مقرر کر دیے گئے، اور اس حیثیت سے بھی بہت مفید خدمتیں انجام دیتے رہے۔
اس عہدہ پر تقرر اس لئے ہوا کہ کنور موصوف شراب کے بہت زیادہ عادی ہو گئے تھے، ہزاروں جتن کئے گئے مگر یہ لیت نہیں گئی، پھر محمد علی کو ان کا پرنل اسٹنٹ مقرر

کیا گیا تاکہ وہ اپنے دوستانہ تعلقات کا اثر ڈال کر اس عادت قبیحہ کو ان سے ترک کرا سکیں، مگر یہ عادت مشنومہ کہیں چھپتی ہے، بالآخر کنور صاحب موصوف کثرت شراب نوشی کے باعث انتقال فرما گئے۔

شعلہ تحریر | محمد علی کی تخلیق اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ وہ ایک ریاست میں کشنری یا محکمہ افیون کی افسری میں اپنے ایام حیات بسر کریں، قدرت کو ان سے بڑے بڑے کام لینے تھے، اپنی ملازمت کی کثیر مصروفیتوں کے باوجود وقت نکال کر ملکی و قومی مسائل پر وقت و قوت ناموز آف انڈیا بمبئی وغیرہ میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

گپ | اپنی ملازمت سے پیشتر دوران قیام الہ آباد میں انھوں نے اپنی اس دلچسپی کو مستقل طور پر قائم رکھنے کے لئے ایک مختصر سا تقویمی انگریزی رسالہ گپ اپنے رفیق آکسفورڈ کنور جگدیش پرشاد (سابق چیف سکریٹری یو پی گورنمنٹ) کی رفاقت میں نکالا، مگر افسوس کہ اس کے صرف دو پرچے نکل سکے، اور اس کے بعد کوئی نمبر نہ نکلا۔

ملازمت سے بیزاری | اس عرصہ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ پہلے تو محمد علی نے ریاست کی ملازمت سے نکل کر گورنمنٹ کی ملازمت کے حلقہ میں داخل ہونا چاہا اور اس کے لئے شملہ کے بعض ذمہ دار انگریزوں نے ان سے وعدہ بھی کر لیا کہ ہم عنقریب کوئی اعلیٰ عہدہ دلوائیں گے، مگر پھر ان کا ملازمت ہی سے جی ہٹ گیا اور ان کی طبیعت اپنے لئے ایک وسیع تر میدان عمل تلاش کرنے لگی۔

افسرا علی سے مخالفت | محمد علی انھیں تفکرات میں تھے کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے انھیں ملازمت سے باطل بیزار کر دیا۔

لے ایک پرچہ (پہلا نمبر) میر محفوظ علی صاحب کی عنایت سے ”محمد علی میوزیم“، جامعہ ملیہ میں موجود ہے۔ مؤلف

مکتوب بنام محفوظ علی | چنانچہ نو ساری سے اپنے رفیق قدیم میر محفوظ علی صاحب کو ایک مکتوب
میں وہ اس کی تفصیل و اسباب کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

”میں نے اپنی ترقی کی درخواست دی، عالم ٹولا ہوتی رہی مگر اس عرصہ میں مسرت کا نزول ہوا، اونگھے کو ٹھیلے کا بہانہ ان کی رائے میری ترقی کے خلاف ہوئی، اس لئے مجھے کوئی جواب نہ ملا، اس عرصہ میں نماز آٹھ بار میں چند مضامین میرے شائع ہوئے جس میں مسلمانوں کے حقوق کی پیروی کی گئی تھی اور مسٹر گوگل کی دوست نادشینی کا پردہ فاش کیا گیا تھا۔ مسرت سخت ناراض ہوئے اور میرا جواب طلب کیا، میں نے جواب اس قدر دندان شکن دیا کہ کچھ بن نہ پڑی، کونسل میں جواب پیش ہوا اور کچھ نتیجہ نہ نکلا سوائے اس کے کہ ایک عام سرکل شائع کیا جائے اور وہ بھی خفیہ کہ سرکاری عہدیداروں کو ایسے مضامین لکھنا مناسب نہیں جن کی وجہ سے مختلف مذاہب اور اقوام میں مخالفت پیدا ہو۔ سر ہیرلڈ اسٹورٹ کو شش کر رہے ہیں کہ سکرٹریٹ میں کوئی عمدہ عہدہ دلادیں، اگر چاہتا تو کچھ کام نہ کر تا مگر عادت کو احساس فرض | کیا کروں سست بیٹھا نہیں جاتا، حرام کی روٹی کھانا منظور نہیں دوسرے یہ بھی خیال ہو کہ چلو ایک اور محکمہ کے کام سے واقفیت ہو جائے گی کام کی وجہ سے سر چھپانے کی جہلت نہیں ہے، اس ریاست سے سخت بیزار ہوں، اور دراصل نوکری سے بیزار ہوں۔“

اجرا کا مرید کا خیال | بالآخر ان پر یہی خیال غالب آیا کہ وہ نوکری ہی سے اپنی بیزاری
کا اعلان کر دیں چنانچہ انھوں نے ۱۹ جنوری ۱۹۱۱ء کو یہ خط میر محفوظ علی صاحب کو لکھا تھا،

اور سلمہ کے اختتام تک پورے طور سے یہ طے کر لیا کہ وہ اب ملازمت نہیں کریں گے بلکہ انہیں بھالیں گے اور اس ذریعہ سے قوم و ملک کی خدمت کریں گے، چنانچہ حسب بیان میر محفوظ علی صاحب لکھنؤ میں ایک اسکیم تیار ہوئی کہ اخبار کلکتہ سے نکالا جائے، محمد علی اس کے ایڈیٹر بنیں اور میر محفوظ علی صاحب اس کے منیجر۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم بھی اس مشورہ میں شریک تھے جاؤرہ کی وزارت | لیکن ابھی قدم قدم پر محمد علی کے لئے موانع موجود تھے، وہ اس حلقہ سے نکلنا چاہتے تھے، لیکن یہ حلقہ تھا کہ خود محمد علی کو لپٹ رہا تھا۔

سر نائل اوڈواڑ کا اصرار | سر نائل اوڈواڑ نے محمد علی کے خاص تعلقات تھے، اس زمانہ میں وہ پنجاب کے ایک اعلیٰ عہدہ دار تھے، نواب صاحب جاؤرہ نے محمد علی کو جاؤرہ کی وزارت پیش کرنی چاہی اور سر نائل اوڈواڑ نے نواب صاحب سے تائید اور محمد علی سے اصرار کیا، دوسری طرف بیگم صاحبہ بھوپال نے بھی محمد علی کو اپنی ریاست میں چیف سیکریٹری کا عہدہ دینا چاہا، مگر محمد علی طے کر چکے تھے کہ وہ اب ملازمت نہیں کریں گے، اس نے انھوں نے ان دونوں ”پیش کش عہدوں“ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کامیڈ کے اجراء کا انتظام کرنے لگے۔

بڑوہ سے علیحدگی | چنانچہ محمد علی نے پہلے تو دو سال کی رخصت لی، اور اس کے بعد ہمارا جہ بڑوہ پر یک معظمت کی توہین کا جو الزام لگا تھا، اور محمد علی نے جس کی صفائی دی تھی اس واقعہ کے بعد وہ مستعفی ہو گئے، اگرچہ ہمارا جہ صاحب ان کا استعفیٰ کسی طرح منظور کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔

صلہ کارگزاری | محمد علی نے سات سال تک وہاں ملازمت کی اور نہایت امتیاز و شان کے ساتھ وہاں اپنی زندگی بسر کی لیکن جب وہاں سے وہ علیحدہ ہوئے ہیں تو

سات سال کی مدت کا رگزار می پر انھیں نیشن تو کسی طرح بھی نہ مل سکتی تھی، ہاں ان کے افسر بالا دست نے حسن خدمات کے صلہ میں یہ تجویز کی کہ سات ہزار کی رقم محمد علی کو بطور انعام پیش کیا جائے، اور پھر محمد علی نے اس رقم کو بھی حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔
مدیر ”پیج“ کی رائے | پیج کے محترم ایڈیٹر نے بالکل سچ فرمایا کہ

”کامریڈ کے ایڈیٹر کے لئے دنیوی ترقی کے بہتر سے بہتر مواقع موجود تھے
ہندوستان کا ذکر نہیں انگلستانی صحافت میں بلند سے بلند کرسی ادارت
اس کے لئے خالی تھی، مناصب سرکاری میں بڑی سے بڑی فہمت
اس کے لئے چشم براہ تھی، عزت، ثروت، اقتدار، و جاہت کے اصنام
کبیرہ نے قدم قدم پر اسے لیٹھایا، لیکن اس کشتہ عشق نے ماسوا کی جانب
نظر اٹھانا بھی گناہ سمجھا اور سائے رشتے چھوڑ کر صرف ایک کا ہو رہا۔“

باب

کمریڈ

بڑی آرزوؤں اور تمناؤں، بڑی کوششوں اور صبر آزمائیوں کے بعد بالآخر کمریڈ
کلکتہ کی افق سیاست سے طلوع ہوا۔

ہاتھ بے تاب ہو ہو کر بٹھے کہ کمریڈ کو حاصل کریں نظریں بڑھ بڑھ کر پڑیں کہ کمریڈ کے جنت
بگاہ، صفحات سے لطف دید حاصل کریں، اور لوگوں نے دوڑ دوڑ کر کمریڈ کو لینا چاہا کہ کہیں اس
سیاست کی اس متاع گرانا یہ سے وہ محروم نہ رہ جائیں

اس اشتیاق و کشمکش کا مظاہرہ ہندوستان کے ”کائے“ لوگوں نے نہیں کیا بلکہ
”انگلستان“ کے ”مگوروں“ نے کیا، حکومت کے افسروں نے کیا۔ اور بڑے بڑے صاحب
یہادروں نے کیا۔

میر محفوظ علی کا بیان | میر محفوظ علی صاحب فرماتے ہیں کہ:
”انگریزوں کی اچھی خاصی تعداد کمریڈ کی خریدار، اس کے مضامین کی شائق
اور اس کے طرز نگارش کی مداح تھی۔“

ایر کیلنسی کا اضطراب | وائسرائے (لارڈ ڈارڈنگ) کی سکیم صاحبہ وقتاً فوقتاً ٹیلیفون پر دریا
کرتی رہتی تھیں کہ ”کامریڈ کس وقت چھپ کر ان کے پاس پہنچ جائے گا۔“
محمد علی کا بیان | خود کمریڈ کے ایڈیٹر کا بیان ہے کہ:

”کمریڈ نے ارباب حکومت کی ایک بڑی اور نہایت معتد رجاعت کو اپنی

طرف مبذول کرایا، لارڈ ہارڈنگ (وائسرائے ہند) کے نام جو اعزازی پرچہ جاتا تھا اس کو وہ خود ہفتہ بھر تک نہ چھوڑ سکتے تھے۔

لیڈی ہارڈنگ کی خریداری | اس لئے بیچاری لیڈی ہارڈنگ نے خود ایک پرچہ دام مے کر اپنے نام الگ جاری کرایا۔

ولیم ہرجرنی کی خریداری | اور ان کے ہمان ولی عہد جرنی نے (جو اسی زمانہ میں ہندو بغض سیاحت آئے تھے) بھی دام مے کر اپنے نام ایک پرچہ جاری کیا۔

حکومت ہند کا کوئی محکمہ ایسا نہ تھا جس کے عامل نے ممبر اور سکرٹری سے لے کر انڈر سکرٹری تک کمر ٹیکہ نہ منگایا ہو۔

گورنر کی قدر دانی | اور یہی حال صوبہ کے حکمرانوں اور ان کے مشیروں (ڈائریکٹروں) کے ممبران کا تھا۔

مسٹر میکڈانلڈ کی قدر دانی | اسٹینڈنگ کمیشن جس کا ذکر کہیں حسب موقع آچکا ہے، جب ہندو

آیا تو مسٹر میکڈانلڈ (موجودہ وزیر اعظم) جو اس وقت پارلیمنٹ کے لیبر ممبر تھے، ہندوستان تشریف لائے تھے، لکھنؤ میں انھوں نے محمد علی سے اپنی ملاقات کے وقت اس کا بہت ذکر کیا تھا کہ وہ کمر ٹیکہ کو بالائے تمام پڑھتے ہیں، اسی طرح اور بہت سے انگریز افسران پر دازوں نے محمد علی کے کمر ٹیکہ کو بہت زیادہ سراہا، اور اس کے حسن انشاء اصابت رائے اور غیر معمولی ہمارت زبان کا اعتراف کیا۔

مدیر | میر محفوظ علی صاحب ایک دلچسپ ہدیہ کا تذکرہ کرتے ہیں کہ:

”سرفیٹ و ڈولش“

ہندوستان

کے وزیر مالیات، جب ولایت جانے لگے تو محمد علی ان سے ملنے گئے،

باتیں کرتے کرتے وہ محمد علی کو اس کمرہ میں لے گئے جہاں ان کا سامان سفر بندھ رہا تھا کھلو کر کہنے لگے، محمد علی، دیکھو اس میں کیا ہے، دیکھا تو کامریڈ کے پرچے تھے، کہنے لگے ”میں لندن پنچ کے ایڈیٹر کو یہ تحفہ لے جا رہا ہوں“ محمد علی بولے ”پنچ کے ایڈیٹر کو تو کامریڈ برابر جاتا ہے، کہنے لگے، وہ او بات ہو، میں اپنے دوست سرادون کین

ایڈیٹر پنچ کو ان کے مذاق کے لائق اس سے بہتر ہدیہ ہندوستان سے نہیں لے جاسکتا، تمھارے اور ان کے طرز تحریر میں جو یک رنگی ہے کہ بعض اوقات تمھارے اور ان کی تحریر میں تمیز کرنا مشکل ہے، اس کی داد دہی دے سکتے ہیں“

غرض اس محیر العقول اور شاندار انداز میں کمریڈ چلتا رہا۔ اور ملک اس کی قدر افزائی کرتا رہا تا آنکہ وہ پریس ایکٹ کے منحوس ہاتھوں بند ہو گیا جس کا پبلک اور پریس نے بہت شاندار طریقے پر احساس کیا۔

نشآۃ ثانیہ | سیجا پو جیل سے رہائی کے ایک سال بعد اکتوبر ۱۹۳۷ء میں محمد علی نے اپنی صدارت کانگریس کے دوران میں کمریڈ کھالا تھا، لیکن اب ملک کی سیاسیات میں اتنا تغیر ہو چکا تھا، ان کے مشاغل میں اتنا اضافہ ہو چکا تھا اور ان کی ذمہ داریاں اس قدر بڑھ گئی تھیں، نیز راجہ غلام حسین، اور ولایت علی بمبوق جیسے یگانہ روزگار رہنما سے وہ اس طرح محروم ہو گئے تھے کہ کمریڈ جینا کھانا چاہتے تھا ویسا نہیں کھا لے سکے، اور اس کا خود انھیں بھی سخت احساس تھا۔ لیکن عالم یہ تھا کہ تنہا وہ کمریڈ کا بار اٹھائے ہوئے تھے۔ سب ایڈیٹر کی لاکھ تلاش کی مگر جیسا سب ایڈیٹر وہ چاہتے تھے نہ مل سکا، اس لئے اکثر اس دوسرے دور میں کمریڈ

بعد از وقت نکلتا تھا۔

اپنے طور پر وہ بہت کوشش کرتے تھے کہ اس کی شان برقرار رہے، اس میں نوع پیدا کیا جائے، اور وہ وقت پر کل سکے، لیکن انصاف شرط ہے، جو شخص مسلسل بیمار بھی رہتا ہو، یونٹی کا نفرنس میں بھی شریک ہوتا ہو، ہندو مسلم فسادات کے موقع پر محل واردات پر بھی جے پہنچا پڑتا ہو، کانگریس کے جلسوں میں بھی جسے شرکت کرنی پڑتی ہو، نظام خلافت کے استحکام و ترقی کی ذمہ داریاں بھی جس شخص پر ہوں، مسلمانوں کو تبلیغ و تنظیم کے پھندے میں جس طرح چھانسا جا رہا تھا اس کی گرہ کشائی بھی اسی کو کرنی پڑتی ہو، غرض ہر قومی اور ملکی معاملہ میں اسے پیش پیش رہنا پڑتا ہو اور ہندوستان کا دورہ کرنا پڑتا ہو اور پھر سب سے بڑھ کر ستم یہ کہ سب ایڈیٹر نہ ملتا ہو اس سے یہ توقع ہی غلط تھی کہ وہ سابقہ معیار پر کمریڈ کنو کال سکے گا۔

ذاتی کوششیں | پھر بھی محمد علی اپنی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوئے، کسی جلسہ کی صفا کے لئے، کسی مسئلہ کے حل کرنے کے لئے، کسی تہنیت کے تصنیف کے لئے محمد علی باہر گئے، بلکہ جانا پڑا، کمریڈ کی تاریخ اشاعت سرپا رہی ہے تو جہاں وہ گئے وہاں انھوں نے رات کی نیند حرام کر دی، دن بھر جلسہ میں تھکے اور رات کو بیٹھے ہوئے رات بھر کمریڈ کا ”یڈنگ آرٹیکل“ لکھ رہے ہیں اور بلگام کانگریس (دسمبر ۱۹۲۰ء) کے موقع پر یہاں تک ہوا کہ بہ صرف زر کشیر اپنی ناداری و افلاس کے باوجود تار پر پورا مضمون بھجوا یا، کچھ تار ”بابو“ صاحب کی غیر معمولی ”انگریزیت“ نے اور کچھ بعض اور حضرات کی کرمفمائوں نے دفتر ہی میں مضمون منسوخ کر دیا۔ اب کمریڈ جو شائع ہوتا ہے تو محمد علی نے جو کچھ لکھا تھا، اس کے علاوہ سب کچھ ہے اور نہیں ہے تو وہ جو انھوں نے لکھا تھا!

بی اماں کی وفات | محمد علی کو بی اماں سے جو غیر معمولی محبت تھی اس کا شخص کو علم ہوگا اپنی ماں پر وہ فدا تھے اور ذرا بھی ان کی تکلیف ان سے نہیں دیکھی جاتی تھی، لیکن اس فرض کا یہ نامور نمونہ ملاحظہ ہو کہ اس جہیتی ماں کا انتقال ہو چکا ہے، لوگ تفریت اور شرکت جنا کے لئے آ رہے ہیں، تجھیز و تکفین کا سامان ہو رہا ہے لیکن محمد علی ہیں کہ ایک گوشہ میں رو بھی پئے ہیں اور کمر ٹیکے پر دف کی تصحیح بھی کر رہے ہیں کہ اخبار وقت پر شائع ہو جائے۔

التوا | آغاز سترے سے صحت بہت خراب ہوئی تو بالآخر انما سازگار حالات سے مجبور ہو کر محمد علی نے کمر ٹیکے کی اشاعت اس امید پر سترے میں ملتوی کر دی کہ جب تک کوئی قابل اور مستعد سب ایڈیٹر نہیں ملے گا وہ اجراء کمر ٹیکے کا خیال بھی دل میں نہیں لائیں گے، چنانچہ نہ سب ایڈیٹر ملا اور نہ محمد علی کمر ٹیکے کا سہارا اجرا کر سکے۔

لیکن اس گئی گزری حالت میں بھی کمر ٹیکے نقصان میں نہیں چل رہا تھا، نہ صرف یہ کہ وہ اپنا خرچ پورا کرتا تھا بلکہ ہمدرد کے غیر معمولی خسارہ کا بوجھ ہلکا کرنے میں بھی محمد علی کی مدد کرتا تھا۔

باب مسلم یونیورسٹی

سر سید کے بعد | سر سید کے زمانہ تک تو مسلمانوں کا یہ ”مدرستہ العلوم“ ایک خاص اسلوب اور ایک خاص شان کے ساتھ چلتا رہا، لیکن ان کی وفات کے بعد ہی سے اس میں گھن گنا شروع ہو گیا، اگرچہ ان کے لائق اور نادر روزگار جانشینوں نے اپنی پوری زندگی ان کے اس مشن کے لئے وقف کر دی، اور اپنے ذاتی مصاحح و حالات کو باطل پس پشت ڈال دیا، اور پوری مستعدی و سرگرمی سے علیگڑھ کی خدمت منہمک ہو گئے، لیکن یہ ایک واقعہ ہو کر علیگڑھ کالج پھر وہ رنگ حقیقت نہیں قائم کر سکا جس کی اس سے توقع تھی۔

انگریز اسٹاف | سب سے زیادہ جس جماعت نے علیگڑھ کو محمد علی کے معیار سے نقصان پہنچانے میں حصہ لیا وہ وہاں کا انگریز اسٹاف تھا!

انگلش اسٹاف تنخواہ دار ملازم تھا لیکن اس ہیئت آفریں نام کی ہیئت خود اس کے ٹرٹی صاحبان پر چھائی ہوئی تھی اور اس کے وجوہ بھی تھے، اس جماعت کو نظم و انتظام کا دعویٰ تھا۔ یہ غرہ تھا کہ علیگڑھ کی ساری شہرت اس کے دم سے وابستہ ہو اور سب بڑھ کر یہ گھنڈ تھا کہ اس کا تعلق حکمران قوم سے تھا اور ”حکمران“ قوم نے بھی اپنی ”سرپرستیوں“ سے ثابت کر دیا تھا کہ علیگڑھ کی سیاسیات میں اگر وہ دخل فے سکتی ہے تو اسی معاملہ میں جب انگریز اسٹاف کے ارکان شاکی ہوں، ”ہنر اکیڈمی پیرن“ کی توجہ اس وقت پر سے اولے حکمرانی سے منطف ہوتی تھی جب ٹرٹیوں اور انگلش اسٹاف کے درمیان کشمکش ہو رہی ہو۔

مٹر آرچبولڈ | لیکن سب سے پہلے اس ظلم سامری کو سرسید کے لائق، جبری اور ”سلمان“، جانشین نواب وقار الملک مرحوم نے توڑا، مٹر آرچ بولڈ اس وقت علیگڑھ میں پرنسپل تھے۔ اور سکریٹری کے احکام و ہدایات ان کے لئے سامان تفریح سے زیادہ نہیں تھے، نواب صاحب مرحوم نے انھیں اطاعت پر مجبور کیا، انھوں نے قانون و آئین کے بالکل خلاف براہ راست اپنے اختلاف کا معاملہ ”ہنر کیلنسی پٹرن“ کی خدمت میں پیش کر دیا اور ہنر کیلنسی نے بھی ازراہ انصاف پر درمی و عدالت پر وہی اس معاملہ میں اپنی پوری سرگرمی ظاہر فرمائی، مگر وقار الملک کی کوہ وقار ہمت میں خلیش نہیں ہوئی اور وہ یقیناً کسی تہدیر و ترغیب سے متاثر نہیں ہوئے۔ (صفحہ ۱۹۶)

خود سری | یہ اسٹاف ”ڈپلن“ کے سلیغ ہونے کے باوجود ”ڈپلن“ کا سب سے بڑا دشمن تھا تعلیمی و انتظامی ہر معاملہ میں اس کا وقار اور اس کی ہیبت کام کر رہی تھی اور لوگ مجبور تھے کہ اس کے جذبات و خیالات کا احترام کریں اور خود گورنمنٹ نے بھی اپنے طرز عمل سے اسے ثابت کر دیا تھا کہ علی گڑھ کالج کا وہ انگریز پروفیسر جسے علیگڑھ سے شکایت ہو اس کے لئے حکومت ہر قسم کی آسانیاں پیدا کرنے کو مستعد تھی، اور گورنمنٹ کی اسامیاں اس کے استقبال کے لئے چشم براہ۔

اندرونی حالات | دوسری طرف اندرونی حالات نہایت نازک ہو رہے تھے، فرقہ بندیوں میں، قدم قدم پر جتنے تھے، تفرقے تھے، ہنگامے تھے، ایک جماعت چاہتی تھی کہ علیگڑھ میں اسی کا اقتدار رہے، دوسری جماعت کی خواہش تھی کہ پہلی جماعت کو زک نے کہ خود برسر اقتدار ہو جائے، غرض مقصد حقیقی خدمت کسی کا بھی نہیں تھا، سب اپنا اقتدار اور اپنا تسلط چاہتے تھے۔

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن | اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قائم اس لئے ہوئی تھی کہ اولڈ بوائز میں ارتباط پیدا کرے، انھیں علیگڑھ کی خدمت پر آمادہ کرے، ان کے لئے مواقع بہم پہنچائے کہ وہ علیگڑھ آئیں اور اپنی تعلیم گاہ کے انحطاط یا ارتقاع کا معائنہ کریں تاکہ ان کے دلوں میں خدمت کا جذبہ پیدا ہوا۔

مگر اسے بھی خود غرضیوں اور نفس پرستیوں کا اکھاڑہ بنالیا گیا، سمجھایہ گیا کہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن چرس جماعت کا قبضہ ہوگا، وہی کالج میں بھی ایک خاص رسوخ کی مالک ہوگی اور وہی جماعت ٹرسٹیوں میں بھی ممتاز و قوی ہوگی، اسی کو کارگزاری کا زیادہ موقع ملے گا۔ اس لئے قوم میں بھی وہ اپنی جگہ پیدا کر لے گی۔

بس اس خیال نے منافست کی تخم پاشی کی اور اختلاف میں اضافہ ہوتا رہا، اور اس کی کوششیں ہونے لگیں کہ اس جماعت پر بھی ہمارا ہی قبضہ ہو۔

ٹرسٹیوں کی حالت | تیسری طرف ٹرسٹیوں کی حالت اور زیادہ ابتر ہو رہی تھی، ٹرسٹی شپ ہمیشہ سے ایک خاص اعزاز کی مرادف تھی اور پھر ملک و سرکاری دونوں حلقوں میں اس لئے ہر ”صاحب دل“ کا یہ حوصلہ تھا کہ وہ ٹرسٹی ضرور منتخب ہو، اور اس رتبہ بلند پر فائز ہو جانے کے بعد وہ مطمئن ہو جاتا تھا اور اس کی قوت عمل سرد پڑ جاتی تھی اس لئے کہ اسے اطمینان ہو جاتا تھا کہ اب تو ”تاجین حیات“ وہ اس منصب رفیع سے معزول ہوتا نہیں اس لئے کہ بورڈ آف ٹرسٹیز کا ایک قاعدہ یہ بھی تھا کہ اس کے ارکان دمی ہوتے تھے، دوسرے ٹرسٹی خود ہی ٹرسٹی منتخب کرتے تھے اس لئے زندہ عمر کو رائے دی اور عمر نے اپنا ہاتھ زید کے لئے اٹھا دیا، حساب کتاب برابر۔

خود کوزہ و خود کوزہ گرد خود گل کوزہ!

سب سے زیادہ جو جماعت علیگڑھ کی سیاسیات پر قبضہ رکھتی تھی اور علیگڑھ کالج پر قبضہ کرنا چاہتی تھی، وہ وہی جماعت تھی، جسے اصطلاح میں ”ارباب علیگڑھ“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور بالخصوص اپنی کوششیں صرف کرنے والا۔
ان میں کوئی مقرر تھا، کوئی اقتدار تھا!

یہ تھے علیگڑھ کے سیاسی حالات جن کا محمد علی نے مقابلہ کرنا چاہا، اور جن کی اصلاح کرنی چاہی۔

محمد علی کی دلچسپی | محمد علی کو علی گڑھ کالج سے مرتے دم تک بڑی دلچسپی رہی اور وہ نہایت خلوص و محبت سے اس کی خدمت کرنے کا دلولہ اپنے دل میں موج زن پاتے رہے، اور جب کبھی بھی انھیں موقع حاصل ہوا انھوں نے نہایت جوش اور تندہی کے ساتھ اپنی اس تعلیم گاہ کی خدمت کی جس میں وہ پروان چڑھے تھے اور جہاں ان کے ذہن دو باغ کی نشوونما ہوئی تھی۔

پیش کش | اس اقتضائے وفا و محبت کے خیال سے سب سے پہلے محمد علی نے اپنے کالج کے لئے اپنی خدمات پیش کیں، اور چاہا کہ اس طرح کالج کے ان احسانات کی جو اس نے ان کے قلب و دماغ پر کئے تھے ہلکانی کریں خود نواب محسن الملک مرحوم کی دلی خواہش تھی کہ محمد علی علیگڑھ کالج میں رہیں اور ان کے پیش قیمت خدمات سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر علی گڑھ کو فائدہ پہنچایا جائے۔

مشرارین کی مخالفت | لیکن مشر مارین جو طالب علمی کے زمانہ میں محمد علی کو عزیز رکھتے تھے، ان کی ترقیوں سے خوش ہوتے تھے، اور ان کے ایک مضمون کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں نہایت زبردست داد دے چکے تھے، وہ اپنے اس شاگرد کی ذہنیت سے بھی وہم

تھے، علیگڑھ کی طالب علمی کے زمانہ کی اس کی رہنمائیاں، یونیس میں اس کی تقریریں، اور انگریزوں کی خود سری اور آزاد روی کے متعلق اس کا مسلک بھی انہیں معلوم ہوا تھا، اس لئے انھوں نے سخت مخالفت کی اور کسی طرح بھی اس پر راضی نہ ہوئے کہ محمد علی علی گڑھ کالج کے اسٹاف میں داخل ہو سکیں، اور اپنے اس مقصد میں وہ کامیاب بھی ہوئے، اس لئے کہ ان کی ہمت اور ان کی رائے کی عظمت ”سب کے دلوں پر تھی اور جن پر نہیں تھی ان پر نہرا کیلنسی پٹن کی تھی۔“

اہل اختلاف | محمد علی کو اہل اختلاف یہ تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ ٹرسٹیوں کا انتخاب ٹرسٹی ہی نہ کر لیا کریں بلکہ اس کا تعلق دوسروں سے ہونا چاہئے، دوسرے ٹرسٹی دوامی طور پر منتخب ہوا کریں کہ اس صورت میں ان کی قوت عمل مضاعف ہو جاتی ہے اور کوئی کام ان سے بن نہیں آتا۔

یہ چونکہ براہ راست شہرگ پر حملہ تھا اس لئے اس کی سزا یہ دی گئی کہ کوشش ہوئی کہ محمد علی رکن ہی منتخب نہ ہو سکیں اور جب کبھی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا تو ایک دوسرے بزرگ کا نام ”مقابلہ“ کے لئے پیش کر دیا جاتا تھا اور جب محمد علی ٹرسٹی منتخب بھی ہو گئے تو انہیں دوامی رکن نہیں بنایا گیا۔

ایام ملازمت کی کوششیں | اپنے بڑودہ اور نو ساری کے زمانہ قیام و ملازمت میں بھی محمد علی علی گڑھ کی خدمت سے باز نہیں آئے اور جو کچھ کر سکتے تھے کرتے رہے، وہاں رہ کر مضمون نگاری کے علاوہ اور ذریعہ خدمت کیا تھا؟ اس کو انھوں نے اختیار کیا۔

مکتوب بنام محفوظ علی | چنانچہ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۷ اپریل ۱۸۷۷ء میں اپنے عزیز دوست محفوظ علی صاحب کو لکھتے ہیں:

”علی گڑھ سخت آفت میں مبتلا ہے، ناور شاہی حکم کی پابندی ہوتی ہے،
 وقار الملک پر ضعیف غالب ہے، عزیز مرزا علی گڑھ آئے تھے مگر نواب صاحب نے
 یہ مناسب نہ سمجھا کہ جو اعزاز انھیں ملتا تھا اس سے انھیں محروم رکھیں اس
 لئے ان کو دیس نکالا ملا اور اب لکھنؤ میں مسلم لیگ کی سرداری کرتے ہیں
 افسوس ہے کہ جس ایک شخص پر اس قدر بغور دیکھا اس چاٹ سے وہ بھی نہ
 بچ سکا، آفتاب کو عزیز مرزا کا آنا سخت شاق گزر رہا تھا اور جب یہ معلوم ہوا
 کہ مسلم لیگ لکھنؤ جائے گا تو اس اعزازی پیل کو اور بھی شاق گذرا، دہلی
 مسلم لیگ میں شریک ہونے کو آیا تو تہیہ طوفاں کے ہوئے لیکن جب یہ
 سنا کہ عزیز مرزا سرکڑی ہو کر لکھنؤ جاتے ہیں تو فوراً خاموش ہو گیا، اگر مسلم
 لیگ ہاتھ سے گیا تو گیا کج اور کانفرنس تو بدستور اسی کے قبضہ قدرت
 میں ہے، میں نے عزیز مرزا کو علی گڑھ سے علیحدہ کرنے کی سخت مخالفت
 کی مگر یہ عزیز مرزا کو بری معلوم ہونے لگی، اب علی گڑھ اور آفتاب اور
 اس ناور شاہی کی مخالفت کے لئے سرکف فقط ایک تمہارا بھائی اور
 ذات الہی ہے، رفیاء رم لیگ نے سوتوں کو ضرور جگایا ہے۔ مگر نہ شخص
 میں خلوص ہے نہ ہمت اور جوش و غلی کام کرنے کا شوق شاذ ہے اس
 لئے آفتاب اور نظام شمس کے ماتحت سیاروں کی چالیں کارگر ہو جاتی
 ہیں، اس وقت تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے، اگر تم نے قدم اٹھایا
 اور چند اراکین اخبارات میں خطوط لکھے تو یہ سید مفید ثابت ہوگا، اپنے گوشہ
 سال کے مضامین کی نقلیں بھیجا ہوں ان سے میری اسکیم اصلاحی کی

تفصیل مل جائے گی۔“

اس خطے علی گڑھ کی سیاسی پیپدگیوں اور محمد علی کی سرگرمیوں پر کافی روشنی
دوسرا مکتوب | پڑتی ہے، اب ایک دوسرے مکتوب کا ایک اہم حصہ بھی ملاحظہ ہو، جو
میر محفوظ علی صاحب کو لکھا گیا تھا۔

”عجب یہ کہ کالج پر اس قدر سخت مصیبت آئی ہوئی ہے اور تم علی گڑھ تک
نہ گئے اور نہ اب تک اس قلم سے کام لیا ہے جس کا چلانا ازل سے تمہیں بہتر آتا
ہے، میں نے اس عرصہ میں ٹائمز میں ایک مضمون علی گڑھ پر لکھا تھا جس کا ایڈیٹر
نے بھی حوالہ دیا اور اسی دن نوٹ لکھا جس میں تحریر کیا کہ ہمارے رائے
دینے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے کارپانڈنٹ نے نہایت منصفانہ طور
پر ہر معاملہ پر بحث کی ہے آج ایک مضمون پیسہ اخبار کو اسی پر لکھا ہے، مگر
حالات سے بحث نہیں کی ہے صرف قانون ٹرستان کی اصلاح پر لکھا ہے
تم کس دن کام آؤ گے اور دو تین مضمون ہر اردو اخبار میں لکھ ڈالو اور اس کی
تائید کرو، روزانہ پیسہ اخبار اگر بدایوں میں نہ آتا ہو تو لکھو کہ جاری کردوں
مگر ذوالقرنین کے آفس میں ضرور مل جائے گا، انہیں بھی کہو کہ وہ بھی تائید
کریں اور عبدالحق داب پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی اور سکریٹری انجمن ترقی اردو
کو لکھنا دو میں تنہا کتبک لڑتا رہوں گا، کیا تم چاہتے ہو کہ ہتھیار ڈال دوں
میں واقعی تھک گیا ہوں اور ممکن ہے اس سال کے بعد اس تمام جھگڑے کو
خیر باد کہوں۔“

ان خطوط سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ محمد علی کو علی گڑھ سے کتنی غیر معمولی محبت تھی اور

اس کے تقاضے پر کس طرح ان کا دل کڑھاکر تھا اور اپنی محبوبیوں اور معذوریوں کے باوجود
مشغولیتوں اور مصروفیتوں کے ہوتے ہوئے وہ وقت بھال کر اس کی خدمت کے مواقع
تکاش کیا کرتے تھے۔

ملازمت کے بعد | جیسا کہ اپنے ایک خط میں انھوں نے اشارہ کیا ہے کہ ”مکن ہو اس
سال کے بعد تمام جھگڑوں کو خیر باد کہہ دوں“ اس پر بھی عمل کیا اور اسی سلسلے کے اواخر
میں مستعفی ہو کر اجار کا مرتبہ کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔

اب نسبتاً ان کے لئے علی گڑھ کی خدمت کے زیادہ مواقع تھے اس لئے کہ
ریاست کی ملازمت چھوڑ کر وہ باقاعدہ ”پبلک مین“ بن گئے تھے، چنانچہ اس زمانہ میں
انھوں نے بہت زیادہ جوش اور محنت سے علی گڑھ کے لئے کام کیا۔

اولڈ بوائز کی تعمیر و استحکام میں غیر معمولی محنت دکھائی، ہر تقریب کے موقع پر محمد علی کا
علی گڑھ پہنچا لازمی تھا، اس کے علاوہ کانسی ٹیوشن اور دوسرے اہم کاموں میں بھی محمد علی
نے بہت نمایاں حصہ لیا۔

کورٹ کی ممبری | اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو اپنی طرف سے چند نمائندے بھیجے گئے تھے
حاصل ہو گیا تھا اور اسے محمد علی سے بڑھ کر مستعد اور پر جوش، معاملہ فہم اور دور اندیش نمائندہ
کون مل سکتا تھا، لہذا اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے اپنی طرف سے کورٹ کی ممبری کیلئے
انھیں کو منتخب کیا، جیسا کہ اس سے پیشتر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ محمد علی کورٹ کی چند بنیادی
خرابیوں مثلاً حق انتخاب اور طریقہ انتخاب وغیرہ میں تبدیلی کرنا چاہتے تھے اس لئے نظام
آئینی کے ماتحت گردش کرنے والے یاروں نے اس کی ”سزا“ یہ دی کہ انھیں باقاعدہ
دوامی ممبر نہیں بنایا، محمد علی کو اس کی کوئی پردا نہیں تھی اور نہ باقاعدہ وہ اس کے

تمنی تھے کہ دوامی طور پر منتخب کر لئے جائیں
دوبارہ امید داری | لیکن اپنی مدت ممبری ختم کرنے کے بعد محمد علی پھر اسی نشست کے
امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے۔

ایک اولڈ بولے کا مراسلہ | خوش قسمتی سے یہیں ایک اولڈ بولے کا مراسلہ مل گیا ہے،
جو زمیندار میں شائع ہوا تھا اور جس میں محمد علی کے دوبارہ انتخاب کی حمایت کی گئی تھی، مراسلہ
نہایت اہم اور معلومات افزا واقعات پر مشتمل ہے، اس لئے ہم اس کے اہم اجزاء یہاں پیش
کرتے ہیں جن سے بہت سی چیزوں پر روشنی پڑے گی۔

”مجھ سے پہلے تین اصحاب اولڈ بوائز کی طرف سے ٹرسٹی مقرر ہو چکے تھے اور
چوتھے سال یعنی سن ۱۸۸۷ء میں نئے قواعد کے مطابق پانچ سال کے لئے مسٹر محمد علی
ٹرسٹی منتخب ہوئے، یہ امر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ جو اصحاب
اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے اب تک ٹرسٹی منتخب ہوئے ان
میں سے اکثر کو قبل اختتام میعاد بعد میں خود ٹرسٹیوں نے اپنے طور پر منتخب
کر کے دوامی ٹرسٹی مقرر کر لیا ہے لیکن مسٹر محمد علی کے متعلق کسی ٹرسٹی کی طرف
سے اس قسم کی تحریک بھی نہیں ہوئی ہے، اس پانچ سال کی مدت میں
کلج کی فلاح و ترقی کے لئے مسٹر محمد علی نے جو کوششیں کیں ہیں وہ چار
مدون میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔

(۱) ٹرسٹیوں کے کانٹری بیوٹن کی اصلاح

(۲) کلج کے مالیات کا احتساب

(۳) کلج کے مختلف اجزاء یعنی گورنمنٹ، ٹرسٹیوں، پروفیسروں اور طالب علموں

کے باہمی تعلقات کو صحیح طور پر ایک دوسرے کو سمجھنا اور اس مقصد کو واضح کرنا جس کے حصول کے لئے سرسید نے اس کالج کی بنیاد ڈالی تھی۔

(۴) کالج کی تکمیل یعنی اسے یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانا۔

ریتز، سائنس کالج کے وہ سب سے پہلے محرک ہیں۔

کالج کی مالی حالت کا تذکرہ خالی از دہی نہ ہوگا، کالج کی مالیات کے جانچ پڑتال کے ہی معنی نہیں ہیں کہ صرف آمد و خرچ کی مدات کی جانچ سالانہ کر لیا جائے بلکہ اصل مقصد یہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ روپیہ کسی ہیجا مصرف پر نہ صرف کیا جائے اسراف کی روک تھام کے لئے سب سے پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ کالج کا بجٹ کافی غور اور پوری چھان بین کے ساتھ تیار کیا جائے، بجٹ کے جلسوں کی یہ کیفیت تھی کہ اگرچہ قواعد کے مطابق ہر سال اپریل سے پہلے بجٹ کا جلسہ منعقد ہونا چاہئے تھا لیکن کبھی بھی یہ جلسہ وقت پر نہیں ہوا، اور بعض تو گویا پراپرل کا ملتوی شدہ جلسہ دوسرے سال کی جنوری میں منعقد ہوا اور عجیب غریب صورت پیش آتی ہے کہ سالانہ جلسوں میں صرف ۲۲ گھنٹہ کا فرق ہوا ہے بجٹ کے جلسوں کے التواء کا ایک ناگوار اثر یہ تھا کہ اخراجات کی کوئی روک تھام ناممکن تھی، مسٹر محمد علی کی بار بار کی نکتہ چینیوں سے بہ تدبیر یہ تاریخیں مقررہ تاریخوں کے قریب آنے لگیں، اور بالآخر گذشتہ بجٹ کے جلسہ میں یہ بات قرار پائی کہ نیا مالی سال شروع ہونے سے قبل بجٹ کی تیاری لازمی ہے جس میں حکومت ہند کے مروجہ دستور کے مطابق نو ماہ کے اصل حسابات اور تین ماہ کے تخمینی حسابات شامل ہوں گے اور حسب معمول آئندہ سال کی آمدنی خرچ

کا تخمینہ دسج ہوگا، کالج کے بعض بے قاعدہ اخراجات کی جس وقت جانچ کی گئی تو یہ معلوم ہوا کہ خرچ کرنے سے پہلے اس بات کی تحقیقات نہیں کی جاتی کہ جس مدرسے صرف کیا جا رہا ہے اس میں بجٹ نے کوئی رقم بھی منظور کی ہے یا نہیں اور اگر منظور کی ہے تو اب اس میں کوئی رقم اتنی باقی بھی ہے کہ نہیں جو مطلوبہ خرچ کے لئے کافی ہو سکے اور نہ کبھی اس طرف توجہ کی جاتی تھی کہ جس مدرسے کے لئے مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ کہاں تک مناسب ہے، اس کمزوری کا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بعض چھوٹے اور غیر ضروری کاموں میں روپیہ صرف ہو جاتا تھا، اور ضروری کام رہ جاتے تھے۔

اساتذہ کی تنخواہیں | جن محترم گنہگار صاحب کے خیالات سے اوپر استفادہ کیا گیا ہے آگے چل کر وہ فرماتے ہیں۔

کالج کے اخراجات میں ایک بہت بڑی رقم استادوں کی تنخواہ میں صرف ہوتی ہے، یورپین پروفیسر اور بعض استادوں کی ترقی تنخواہ کی ایک اسکیم مقرر ہے جس کے مطابق اپنے وقت پر ان کی تنخواہوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، لیکن استادوں کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے جن کی ترقی کے لئے کوئی معیار مقرر نہیں ہے، ان لوگوں کو مجبوراً یا تو عام کالج کی تائید اور رضامندی حاصل کرنے کے لئے غلط طور پر کوششیں صرف کرنی پڑتی ہیں یا انھیں اپنی ترقی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، مسٹر محمد علی نے ہمیشہ اس بات کی مخالفت کی کہ ذاتی اثرات کے ذریعہ سے ترقی کی کوشش کی جائے۔

سطور بالا سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ محمد علی نے اپنی ٹرسٹی شپ کے زمانہ میں کیا کیا خدمتیں

انجام دیں اور اولڈ بوائےز کے حلقہ میں وہ کس قدر ہر دل عزیز اور محبوب تھی، نیز کس طرح اولڈ بوائےز کی طرف سے ٹرسٹی شپ کے لئے محمد علی پر نظریں جا جا کر جم جاتی تھیں۔

یونیورسٹی کی اسکیم | اب ان کو ششوں اور قابل تعریف کارگزاریوں کے بعد محمد علی کی ان مساعی پر نظر ڈالئے، جو انھوں نے علیگڑھ کو کالج سے یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کی مسلسل آتھک اور نہایت گرانقدر خدمتیں کیں۔

جسٹس محمد علی اسکیم | اصل میں جس وقت اس مدرستہ العلوم کی تعمیر ہو رہی تھی، اسی وقت سرسید کے حاشیہ خیال میں اور بعد کو ان کے مقلدین و متبعین کے نقطہ نظر میں یہ بات شامل رہا کہ جلد سے جلد اسے حقیقی معنی میں اگر قریبہ اور غرناطہ زور کلام میں بدل گیا تھا تو کم از کم آکسفورڈ اور کیمبرج کے نمونہ پر ضرور لا کھڑا کیا جائے۔

اور یہی وہ چیز ہے جس کے لئے حالی کی نظمیں، نذیر احمد کے لیکچرز، محسن الملک کی تقریریں و قار الملک کی کوششیں، شبلی کی مثنویوں اور تصانیف کے علیگڑھ کے لئے ”جلد حقوق محفوظ“ رہے۔

چنانچہ جسٹس سید محمد نے اسی زمانہ میں ایک اسکیم تیار کی تھی اور اس میں اس ہونے والی یونیورسٹی کا ایک نہایت مکمل خاکہ تیار کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ پھر ان کی زندگی ایسے حوادث سے دوچار ہوئی کہ وہ اپنے والد کی بنائی ہوئی شاہ راہ کی تکمیل نہ کر سکے، اس کی تکمیل گو وہ مکمل ہی رہی، دوسروں کی قسمت میں لکھی تھی۔

یونیورسٹی کی تحریک | سلسلہ کے آغاز میں جب یونیورسٹی کی تحریک عالم وجود میں آئی کہ ایم لے او کالج کو یونیورسٹی کے درجہ تک جلد از جلد پہنچا دیا جائے تو محمد علی کی زبان اور محمد علی کا قلم اس تحریک کی حمایت کے لئے وقف تھا۔

شوکت صاحب کو آمادہ کرنا | انھوں نے اپنے برادر محترم مولانا شوکت علی سے درخواست کی کہ فرلوے کروہ اس کاراہم کو انجام تک پہنچائیں، چنانچہ موصوف نے دو سال کی فرلوی اور ہڑتس سرآغا خاں کی میت اور سرگردگی میں سائے ہندوستان کا دورہ کیا اور اپنی بے نظیر قوت عمل کا ثبوت یہ دیا کہ تیس لاکھ کی جو رقم فراہم کرنا تھی اس میں بس پچیس لاکھ سے کسی طرح کم نہ فراہم کرایا۔

اختلاف | بٹلر صاحب دسر بار کورٹ بٹلر اس زمانہ میں ممبر تعلیمات تھے، یہ مسئلہ ان کے ہاتھ میں آیا ادھر مسلمانوں نے اپنی پوری قوت عمل اس پر صرف کر دی کہ وہ گورنمنٹ کے مطلوبہ بیس لاکھ پھر تیس لاکھ جمع کر دیں تاکہ ”یونیورسٹی“ پالیں۔ چندہ جمع ہو رہا تھا اور بہت کچھ جمع ہو گیا تھا کہ دفعۃً وائسرائے کی سفارش کے خلاف وزیر ہند صاحب نے جن شرائط کے ساتھ ”یکمل“ یونیورسٹی مسلمان مانگ رہے تھے اس کے فیئے سے انکار کر دیا اور اپنی طرف سے چند سخت شرائط پر وفیسر مل کے تقرر اور کورٹ کے اختیارات، دوسرے کالجوں کے الحاق اور یونیورسٹی کے نام کے متعلق پیش کرئے جنہیں مسلمان کسی طرح بھی منظور نہ کر سکتے تھے۔

ہمارا جہ محمود آباد کی رہنمایاں | اس زمانہ میں ہمارا جہ صاحب محمود آباد پبلک معاملات میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے اس مسئلہ میں بھی انھوں نے بہت دھچپی کا اظہار کیا تھا، اس لئے بالاتفاق وہ ”لیڈر“ تسلیم کر لئے گئے اور کانفی ٹوشن کمیٹی (مجلس ترتیب ضوابط) کے صدر بنادے گئے! انھوں نے ممبر تعلیمات سے وعدہ کر لیا کہ وہ فاؤنڈیشن کمیٹی کے ممبروں کی رائے میں تبدیلی کرا سکیں گے۔

ہمارا جہ صاحب کے ساتھ علیگڑھ کے اکثر بزرگ، اور دسائے قوم اور آخر میں اکثر انصاری صاحب وغیرہ تھے۔

محمد علی کے ساتھ ابوالکلام صاحب آزاد، نواب وقار الملک مرحوم اور دوسرے حضرات تھے، قیصر باغ لکھنؤ میں یونیورسٹی کے لینے یا لینے کا جب مسئلہ پیش ہوا تو بہت زیادہ اختلاف کا اندیشہ تھا اور طرح طرح کے خطرات تھے کہ خدا معلوم یہ ایکم کامیاب بھی ہو سکے گی یا نہیں۔

محمد علی کی "نرمی" | جس صبح کو یہ معاملہ پیش آنے والا تھا، اس کی رات کو پھر باہمی مشاورت ہوئی اور محمد علی اس میں کچھ "نرم" پڑ گئے، یعنی محمد علی نے یہ تجویز پیش کی اور منظور کرانی کہ فاؤنڈیشن کمیٹی کے ہاتھ سے یونیورسٹی لینے یا لینے کا فیصلہ نکال لیا جائے اور ایک ایسے محدود ڈیپوٹیشن کو اس کا اختیار دیدیا جائے جس کے میزوں سے انھیں کامل امید تھی کہ وہ جمہور مسلمانوں کی نیابت اچھی طرح کر سکیں گے اور وہی فیصلہ کثرت رائے سے کریں گے جو ان حالات میں خود فاؤنڈیشن کمیٹی کرتی۔

اسباب | محمد علی کی اس روش پر ان کے بعض رفقاء نے بہت سخت اعتراضات کئے اور انھیں بہت شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

درحقیقت یہ تعجب خیز بات بھی ہے کہ محمد علی جیسا جمہوریت پسند آدمی ایک جمہوری مسئلہ کو ایک محدود جماعت کے سپرد کر دینے کا حق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

لیکن اگر حالات پر تنجیدگی سے غور کیا جائے تو اس سرگزشت شب "احادیث الغاشیہ" کی حقیقت کچھ معلوم ہوتی ہے۔

محمد علی یہ جانتے تھے کہ علیگڑھ کی تحریک پر کن لوگوں نے قبضہ کر لیا ہے، یہ بھی جانتے تھے کہ یہ جماعت تھوڑا بہت ملک و قوم پر اور بہت زیادہ گورنمنٹ کے حلقوں میں اثر و رسوخ رکھتی ہے، اس وقت تک یہ ساری تحریک اسی جماعت کے ہاتھ میں تھی، اس نے انھوں نے محسوس کیا کہ اگر اس جگہ اختلاف کیا گیا تو خدا اور مہٹ سے معاملہ اور خراب ہو جائیگا

لہذا انھوں نے ایک ایسا ”وسطی“ راستہ اختیار کیا جس پر دونوں فریق مطمئن ہو سکتے تھے اور کام نکلنے کی امید ہو سکتی تھی اس لئے اپنے ضمیر کے خلاف جیسا کہ انھوں نے بار بار اپنے مضامین و مقالات میں اور اپنے مکتوب بنام ہمارا جہ محمود آباد میں ظاہر کیا ہے، یہ کیا، گوان کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں اور وہ آخر وقت تک اپنی اس روش پر نادم ہے اور نہایت وسعت قلب اور شرافت کے ساتھ اس کا اعتراف بھی کرتے ہے۔

نتیجہ | بالآخر ۲۶ - ۲۷ جولائی ۱۹۴۷ء کو علیگڑھ میں فاؤنڈیشن کمیٹی کا جو جلسہ ہوا اس میں اگرچہ راجہ باب علیگڑھ کو پورے مواقع حاصل تھے اور انھوں نے اس سے ہر جائز اور ناجائز فائدہ بھی اٹھایا، یعنی علی گڑھ کے اضلاع سے بہت کافی تعداد لوگوں کی ”مگانی گئی“ کہ ان کے خیال کے مطابق فیصلہ ہو سکے، لیکن پھر بھی ”فیصلہ دہی“ ہوا جس کی جہو مسلمانوں سے توقع تھی، اگرچہ حقیقتہً اس فیصلہ کے بعد بھی اس تحریک کو اس اسلوب پر نہیں چلایا گیا جس کی یہ مستحق تھی۔

جنگ عظیم | جنگ عظیم کے آغاز ہی پر محمد علی نظر بند کر دے گئے، ان کی اس نظر بندی سے دوسرے فریق نے قدرۃً پورا فائدہ اٹھایا، ان کی اس وقتی تائید کے بعد ان لوگوں کو پھر محمد علی کی مخالفت سے دوچار ہونا پڑا تھا، اس لئے ان کی نظر بندی کی خبر، دوسرے الفاظ میں یونیورسٹی کے ”چارٹر“ کا ثرودہ جانفرا تھا۔

دوبارہ تحریک | اگرچہ جنگ عظیم کے سلسلہ میں گورنمنٹ بھی پریشان تھی، اور اس وقت اس سلسلہ کا اٹھانا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا، مگر اس مسئلہ کو پھر گورنمنٹ تک پہنچایا گیا۔

گورنمنٹ کی آمادگی | گورنمنٹ اس شرط پر یونیورسٹی دینے پر آمادہ ہو گئی کہ مسلمان اسی قسم کی یونیورسٹی قبول کر لیں جس طرح ہندوؤں نے اپنے مصالح اور ضروریات کا لحاظ رکھ کر قبول کی تھی

جمہور عام نے اس کی مخالفت کی، گردہ احرار نے اس کے خلاف زبردست تقریریں کیں۔ اور مضامین لکھے، مگر جو لوگ اس ادارہ اور اس تحریک پر قابض ہو چکے تھے، ان پر کوئی اثر نہیں ہوا، اور انھوں نے پورے طور سے اس پر آمادگی ظاہر کی کہ ہم اس طرح کی یونیورسٹی قوم کے لئے مفید اور مناسب سمجھتے ہیں اس لئے ضرور لیں گے اور جو لوگ مخالفت کر رہے ہیں انھوں نے تعلیم بھی کسی یونیورسٹی میں پائی ہے؟

محمد علی کی مخالفت | محمد علی اگرچہ اس زمانہ میں نظر بند کر دئے گئے تھے لیکن پھر بھی اس مسئلہ سے ہر امکانی دلچسپی لیتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ یونیورسٹی کا مسئلہ جنگ عظیم کے اختتام تک نہ اٹھایا جائے، اس کے بعد پوری شدت کے ساتھ اٹھایا جائے، اُس صورت میں کامیابی کی زیادہ امید ہے، بہ نسبت اس صورت کے کہ جلد بازی کر کے خواہ مخواہ کام بگاڑ دیا جائے۔ مکتوب بنام محمود آباد | چنانچہ چند واڑہ سے انھوں نے ایک نہایت اہم خط ہمارا جس کا نام محمود آباد کے نام لکھا جس میں اپنی بے بال و پری کے باوجود اپنا نقطہ نظر نہایت تفصیل اور پورے دلائل کے ساتھ پیش کیا، جس کا اہم اقتباس انھیں کے الفاظ میں یہ ہے۔

” میں بے وثوق تمام کہہ سکتا ہوں کہ میری مختصر سبک زندگی میں اس واقعہ سے زیادہ اہم کوئی واقعہ پیش نہیں آیا کہ میں نے بظاہر اپنے کھلے ہوئے اور دیرینہ اصولوں کے سراسر خلاف ایک جمہوری حق کو ایک محدود جماعت کے سپرد کرنے کی تجویز جمہور کے سامنے پیش کی، مگر آخر کار چند واقعات ایسے پیش آئے کہ خود ان حضرات کو جن کی مخالفت کو مٹانے کی غرض سے مجھے ان کے ساتھ متذکرہ بالا سمجھوتہ کرنا پڑا تھا۔ پیرچ سلسلہ میں لکھنؤ میں تسلیم کرنا پڑا کہ جب تک فاؤنڈیشن کمیٹی کو پھر مدعو نہ کیا جائے اور کل معاملات کو

اس کے سامنے پیش نہ کیا جائے، کوئی کارروائی جائز طریقے پر نہیں ہو سکے گی۔
اگست ۱۹۱۵ء میں آئینہ میں آئینہ نے چند اصحاب کو شملہ پر مدعو فرمایا اور اس
ادارے کی کوشش کی کہ مسلمان ایک ایسی یونیورسٹی کو جو ہندو یونیورسٹی کے اصولوں
پر مبنی ہو قبول کر لیں۔

۱۰ اپریل ۱۹۱۵ء کے لئے فاؤنڈیشن کمیٹی کا ایک جلسہ پھر تجویز کیا گیا اور میں
مشکور ہوں کہ آئینہ نے مجھے فراموش نہیں فرمایا، مگر کیا بجا ہو گا اگر میں عرض
کردوں کہ اصل مدعا شوری نہ تھا، بلکہ مجھے اپنی رائے سے متاثر کرنا مقصود تھا،
میرے دیرینہ دوست سید سجاد حیدر صاحب یہاں آئے اور ان سے یونیورسٹی
کے مسئلہ پر دیر تک بحث رہی۔

یہ ظاہر ہے کہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۵ء کو مسلمان اگر طوعاً نہیں تو کرہاً ضرور ان امور
پر راضی ہو گئے جن کے خلاف وہ اور میں اس وقت تک دونوں تھے۔
غالباً آپ کے یہ ملاحظہ نہیں ہے کہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۵ء کے فیصلوں پر میں
ہرگز مطمئن نہیں ہوا۔

آج پھر فاؤنڈیشن کمیٹی کو مدعو کیا جا رہا ہے اور قوم کے دیرینہ خواب کی اس
طرح تعبیر کی جائے گی کہ جس طرح کی یونیورسٹی ایک دوسری قوم نے بظاہر اپنی
قومی خصوصیات و ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھ کر لینا قبول کی ہے، اسی طرح کی
یونیورسٹی ہم بھی علانیہ اپنی قومی خصوصیات و ضروریات کے خلاف قبول
کر لیں، کہاں ۱۱-۱۲ د اگست ۱۹۱۵ء کے مطالبے اور دعوے سمجھیں اور
کہاں آج کی باتیں اور ارادے ہیں۔

اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کونسا عظیم نشانِ تعلیمی فائدہ اسی سال اس کی بنیاد رکھے جانے سے حاصل ہو جائے گا، جو ایک دو سال کے توقف و تاہل سے فوت ہو جائے گا۔

پھر کیا وجہ ہے کہ اس عجلت سے کام لیا جا رہا ہے اور ایک تنازعہ فیہ مسئلہ کو جس کا دورانِ جنگ میں چھیڑنا خود سرکار عالیہ کے پیش کردہ اصول کے خلاف ہے، چھیڑا جا رہا ہے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہو میں : و فوق تمام کہہ سکتا ہوں کہ کوئی وجہ اس عجلت کی موجود نہیں اور متعدد وجوہ اس عجلت کے خلاف موجود ہیں ۔
ایک عرصہ تک میں نے انتظار کیا کہ ان حضرات کا رجحان معلوم ہو جو کم از کم ۱۰ اپریل ۱۹۴۷ء سے پیشتر میرے ہم خیال تھے، لیکن جب وقت تنگ رہ گیا تو میں نے مجبور ہو کر ایک تحریک ۲۵ مارچ کے جلسہ کے لئے سکریٹری صاحب کی خدمت میں مع ایک مفصل عرضیہ کے داخل ایجنڈا کرنے کے لئے ارسال کر دی۔

مگر اب معلوم ہوا کہ جلسہ ۸ اپریل کو ہو گا اور لوگوں کا خیال ہے کہ انجناب نہایت سرگرمی سے مسلمانوں سے نہ صرف ۱۱-۱۲ اگست ۱۹۴۷ء جولائی ۱۹۴۷ء کے فیصلوں کے خلاف فیصلہ کرنا چاہتے ہیں بلکہ ۱۰ اپریل ۱۹۴۷ء کے فیصلہ کے بھی خلاف فیصلہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور مجھے یہاں تک اطلاع ملی ہے کہ آپ علانیہ فرماتے ہیں کہ اگر ضرورت ہوگی تو میں لکھنؤ سے دس ہزار آدمی اپنی رائے کے موافق رائے دینے کے لئے آؤں گا، یہ وہ خیالات ہیں جو آپ کے متعلق میں اپنے دل میں ہرگز جاگزین نہیں ہونے دینا چاہتا!

اگر آئینہ بید سجاد حیدر صاحب یا کسی دوسرے صاحب کو جو آئینہ بید کی رائے سے پوری طرح واقف ہوں یہاں روانہ فرمائیں تو امید ہے کہ وہ مندرجہ تحت سوالوں کا جواب آئینہ بید کی طرف سے دے سکیں:

(۱) یونیورسٹی کے مسئلہ کو تا اختتام جنگ کیوں نہ ملتوی رکھا جائے اور اس عرصہ میں وہ تمام کارروائی کالج کی ترقی و اصلاح کے متعلق کیوں نہ کر لی جائے جو بلا توسط سرکار عالیہ ہم آج بھی کرنے کے مجاز ہیں۔

(۲) وہ کونسا تعلیمی فائدہ ہے جو یونیورسٹی کے متعلق اس وقت آخری فیصلہ کرنے میں متصور ہے مگر ایک دو سال بعد فوت ہو جائے گا؟

(۳) کیا جنگ کے باعث قیام یونیورسٹی میں باوجود ہائے فیصلہ کر لینے کے کہ جیسی بھی طے قبول کر لی جائے رکاوٹیں پیش نہ آئیں گی؟

(۴) کیا ہم عنقریب کافی اور عمدہ اسٹاف جو یونیورسٹی کے شایاں شان ہو گیا کر سکیں گے؟

(۵) کیا علی گڑھ کالج کے ارباب حل و عقد پراپ کو اعتماد ہے کہ وہ یونیورسٹی کو مناسب طریقہ پر چلا سکیں گے۔

(۶) اگر آپ کو ان حضرات پر اعتماد ہے تو آپ اب تک کیوں ان سے اس قدر کشیدہ رہے ہیں اور کیوں علی گڑھ کالج کے معاملات میں آپ نے اس سرگرمی کا جس کی آپ کے ہر جانتے والے کو آپ سے توقع تھی، اب تک اظہار نہیں فرمایا اور کیوں انتخاب صدر کانفرنس کے معاملہ میں آپ کی جانب سے ارباب حل و عقد علی گڑھ کی اس قدر مخالفت یا ان کی جانب سے

آپ کی اور آپ کے ہم خیال اصحاب کی مخالفت ہوئی۔

..... آپ کیا قوم کا جاہل سے جاہل
شخص بھی اب سمجھ گیا ہے کہ یونیورسٹی کا مسئلہ بحالت موجودہ قوم کی موت اور
زیست کا مسئلہ ہی ہمارے نظر بندی نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ بہت سرقومی
معاملات میں کوئی حصہ نہ لیں، مگر چونکہ تعلیمی معاملات میں ہم ایک حد تک آزاد
ہیں اور خط و کتابت کر سکتے ہیں اس لئے کم از کم مکاتبت اور مراسلت میں
معذور نہیں، اپنا تو اس پر عمل ہے۔

فریاد و فغاں ملبس ناشاد کے جاہانِ نفسِ خاطرِ صیاد کے جاہان
فریاد ہو یا نالہ ہو یا آہ جگر سوز جو ہو سکے تجھ سے دلِ ناشاد کے جاہان
نفسِ یہ کہ ہم کو آج انھیں سے شکایت پیدا ہوتی ہے جن کی تعریف میں
ہماری زبانیں کل تک سوکھتی تھیں، استبدادیوں کا جامہ استبداد کی ہر حرار
کو دستیاب ہو گیا ہے اور اسے ہمارے سب سے بڑے حریت پسند زین بدن کے
ہوئے ہیں، بھلا کہہ نہیں سکتے، برا کہنے کو جی نہیں چاہتا۔

دلِ بد و حق آنت کر دلیہ نتوان گفت بیداد توں دید و شکر نہ توں گفت
موجودہ زمانہ ہمیشہ نہ رہے گا مگر جو فیصلہ ہم اور آپ آج کریں گے اس کا اثر
ہمارے بچوں اور آنے والی نسلوں کی تعلیم پر صدیوں تک پڑتا رہے گا، کیا آپ کو
یہ گوارا ہے کہ ان کے لئے ہم اپنی کم مہتی بطور ورثہ کے چھوڑ جائیں؟

اس خط کو آپ نے ملاحظہ فرمایا اس میں جو سوالات ہیں وہ درحقیقت سوالات نہیں ہیں
بلکہ دلائل ہیں اور خود اپنی ہیست کو ظاہر کر رہے ہیں۔

دوسری کوششیں | محمد علی کی کوششیں نہیں ختم نہیں ہوئیں بلکہ اپنی بے باال وپری کے باوجود انھوں نے اس معاملہ کو حسبِ ملحوظہ طے کرنے کی اور کوششیں بھی کیں۔

انھوں نے حالتِ نظر بندی میں ممبر صاحب تعلیمات کو ایک درخواست بھیجی جس میں خواہش ظاہر کی تھی کہ انھیں اس جلسہ میں شریک ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے جس میں یونیورسٹی کے لینے یا نہ لینے کا فیصلہ ہونے والا تھا تاکہ وہ وہاں اپنی رائے پیش کر سکیں اس لئے کہ انھیں علی گڑھ کی تحریک سے جو دلچسپی رہی ہے اس کا اقتضائے ہر کہ وہ اس میں شریک ہوں، مگر ممبر صاحب تعلیمات نے اس درخواست کا جواب دیا کہ وہ ایسی اجازت لینے سے معذور ہیں۔

”صلہ کار گذاری“ | محمد علی نے ہمدردی میں ایک بار ضمناً علی گڑھ پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک عجیب و غریب انکشاف کیا تھا، بے موقع نہ ہوگا اگر اس جگہ اس کا خلاصہ انھیں کے الفاظ میں یہاں پیش کر دیا جائے۔ وہ فرماتے ہیں :-

”سوائے میں علی برادرانِ نظر بند کر دئے گئے اور وہ قانون اساسی جسے میں نے اور میرے رفقاء نے بڑی محنت سے اور راباب بست و کشاکش سخت مخالفت کے باوجود کالج کے قانون کو اصلاح سے کر تیار کیا تھا، ہماری نظر بندی کی ابتدا سے لے کر اتہا تک ایک بار نہیں بلکہ بار بار حکومت کے حکم سے خراب کیا گیا، سر شفیق نے فوراً یونیورسٹی ایکٹ کا نفاذ کر لیا اور ہمارا جہ صاحب محمود آباد نے بحیثیت افسر چانسلر کے نوبت بجا کر یونیورسٹی کا افتتاح کر دیا، یہ وہی سر شفیق تھے جو سوائے میں مارین صاحب کی ذریعہ ہند کی طرف سے پیش کردہ شرائط کو قبول کرنے کے لئے ہرگز آمادہ نہ تھے مگر

جو بحیثیت وزیر تعلیمات ہونے کے ڈاکٹر ضیاء الدین کے ایما سے علی برادران کو قید خانہ مبیل سے چھوڑنے پر بھی علیگڑھ نہ آنے دینے کی کوشش پر آمادہ ہو گئے اور جنہوں نے مسئلہ کی ابتدا ہی میں سر ہارکورت بٹلر سے ہنر ہنس نواب صاحب راپور کو پیغام بھجوایا کہ یا تو علی برادران کو علیگڑھ جانے سے روک دیا جائے، یا انہیں راپور سے جلا وطن کر دیا جائے، چنانچہ ہم نے علیگڑھ کو نہ چھوڑا، البتہ راپور اس دن سے آج تک نہ جاسکے۔“

باب مسلم لیگ

غدر کے بعد سے مسلمانوں نے سیاسیات سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور ان وطن کی ایک سرگرم جماعت نے البتہ کانگریس میں جان پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس زمانہ کے لحاظ سے جو قوت اسے پہنچائی جاسکتی تھی وہ پہنچائی اور گورنمنٹ پر اثرات ڈالے گئے۔ اس وقت تک مسلمان گورنمنٹ کے نفل عاطفت کو سایہ الہی سمجھ رہے تھے اور کسی ایسی باغیانہ تحریک میں شریک ہونے کے لئے نہیں تیار تھے جس سے سرکار دولتدار کی چین پٹیاں ان نیاز مندوں کے جذبہ وفا کو ذرا بھی محل نظر سمجھے اور یہ بھی ”گستاخوں“ کی صف میں نظر آسکیں۔

حالات میں تغیر | لیکن ظاہر ہے یہ حالات ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتے تھے، گورنمنٹ کے گوشہ چشم اتفاقات میں تبدیلی ہوئی ”لڑاؤ اور حکومت کرو“ کی پالیسی علی الاعلان ظاہر ہوئی تو احمد اللہ کہ مسلمانوں میں بھی احساس پیدا ہوا اور سب سے زیادہ مسرت بخش بات یہ ہو کہ یہ احساس اس جماعت کی طرف سے پیدا کرایا گیا جو سید مالی مقام کی جانشین تھی اور سیاسیات کو شجر ممنوعہ سمجھ کر اس سے ہر وقت اپنی بے تعلقی اور بے زاری کا اعلان کرنا اپنی بہترین ملکی و قومی خدمت سمجھتی تھی۔

مسلم لیگ کی تائیس | اسی جماعت نے نواب وقار الملک بہادر اور نواب محسن الملک معفو کی کوششوں سے ۱۹۰۶ء میں جب بنگالہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن کانفرنس منعقد ہوئی، وہیں

ایک گوشہ میں مسلمانوں کی آئندہ سیاسی زندگی کی تشکیل کے لئے ایک سیاسی جماعت کی تعمیر و تاسیس کی تھی جس نے مسلم لیگ نام پایا۔

محمد علی کا حصہ | محمد علی نے اگرچہ اس وقت تک سیاسی دنیا میں قدم نہیں رکھا تھا اور نہ بنیت ایک سیاسی قائد کے اس وقت تک ان سے توقعات وابستہ تھیں، لیکن پھر بھی محمد علی نے اس کی تاسیس اور اس کے استحکام میں نمایاں حصہ لیا اور اس طرح اس کے بانیوں میں اپنے لئے ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی۔

میر محفوظ علی کا بیان | میر محفوظ علی صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

”اس موقع پر باوجودیکہ اسلامی ہند کی دماغی قابلیت کا عطر موجود تھا مگر مسلم لیگ کے نظام کی درستی اور قواعد و ضوابط کی تیاری کا سارا کام محمد علی نے کیا“
سر یعقوب کی رائے | اسی طرح سر محمد یعقوب فرماتے ہیں۔

”علی گڑھ کا پرائیڈ کھلندڑا ولایت سے ایک زبردست مضمون نگار، ایک پرجوش مقرر اور ایک ہونہار مدبر بن کر آیا تھا، مسلم لیگ کی ساخت اور اس کے قواعد کی ترتیب میں محمد علی کا بڑا حصہ تھا، اور اس وقت سے محمد علی کی زندگی سراپا سیاست بن گئی۔“

لیگ کا نصب العین | لیکن گو اس وقت ایک حد تک مسلمانوں میں بیداری پیدا ہو گئی تھی اور مسلمان سیاسیات میں جھجک جھجک کر حصہ لینے پر آمادہ ہوئے تھے، شاید اسی لئے لیگ کا نصب العین بہت پست رکھا گیا۔ اس وقت تک اس کے دائرہ عمل میں صرف یہ بات تھی کہ سال بھر میں کسی ایک مقام پر ایک سالانہ جلسہ منعقد کرائے اس میں کچھ گورنمنٹ کی بھلیاں اور کچھ ہندوؤں کی برائیاں بیان کر کے ان اس پر توڑی جائے کہ مسلمانوں کے ساتھ براہوں

وطن نا انصافی کرتے ہیں، گورنمنٹ بھی کبھی کبھی اپنا ابر کرم دوسری طرف برساتی ہے۔ اعلیٰ ملازمتیں مسلمانوں کو نہیں ملتیں اور ادنیٰ ملازمتوں میں بھی ”نشستیں محفوظ“ نہیں ہیں لہذا امید ہے کہ سرکار ابد قرار کی توجہ گرامی ہم دفاتر اور جو رہستوں پر بھی مبذول ہوگی، گو اس زمانہ میں کانگریس بھی اپنی ”وفا شعاری“ اپنے لئے باعث فخر سمجھ رہی تھی، اور اس کا کام بھی یہی تھا کہ ”تقریر“ اور ”مؤدبانہ گزارش“ کی تجویزیں پاس کرے اور اس کے بعد پھر خاموش ہو جائے۔

محمد علی کی علی شریعت | لیکن جب محمد علی کو علی شریعت کا موقعہ حاصل ہوا تو انھوں نے لیگ کے قالب بے جان میں ایک روح تازہ پیدا کرنا چاہی، ایسی روح جو دوسروں کو ہشیار کر سکے اور بیداری پیدا کر سکے۔

لیگ کے نصب العین کی پستی کا انھیں احساس تھا اور اس کے لئے انھوں نے تنہا سلف گورنمنٹ | کوششیں کیں ”بالآخر خداوندان لیگ نے بھی اس حقیقت کا احساس کیا اور انتہائی شجاعت و مردانگی کے ساتھ اس کا اعلان فرما دیا کہ اب لیگ کا ”نصب العین“ ہندوستان کے مناسب حال (سوٹ اپل) سلف گورنمنٹ ہے۔

لیکن محمد علی کی کوششیں بھی نہیں ختم ہوئیں انھوں نے برابر اس میں ایک نئی زندگی پیدا کرنی چاہی اور وہ اس سے کبھی الگ نہیں ہوئے، نہ تحریک خلافت کے ہنگامہ زازمانہ میں اور نہ تحریک کی افسردگی کے مضمحل کن عہد میں وہ ہمیشہ اس میں شریک ہوئے اور اس کی بلند سے بلند تر سطح نظر تک پہنچائی فرماتے رہے۔

باب ۵

طبی فذ

محمد علی کے کارناموں میں بہت اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان سے ایک
طبی وفد بنگال بھیجے جس میں بڑی سرگرمی ظاہر کی تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی طبی بہبودی
کا ثبوت مل سکے۔

جس وقت محمد علی نے یہ عزم کیا کہ ہندوستان سے ایک طبی وفد بھیجا جائے، اس وقت
حالات نہایت نامساعد تھے، اور کامیابی کی کوئی صورت نہیں نظر آتی تھی، لیکن محمد علی نے
اپنی غیر معمولی اور باطل منفرد قوت فیصلہ اور قوت عمل سے کام لے کر اس کا بیڑا اٹھایا، اور
دنیا نے حیرت کے ساتھ دیکھا کہ اسے اتمام تک پہنچا دیا، واقعات کی ضروری تفصیل یہ ہے۔
جنگ بنگال | ۱۹۱۳ء میں جب جنگ بنگال شروع ہوئی، اس وقت ہندوستان کے
مسلمانوں میں سخت ہیجان، جوش اور حرکت کا ظہور عمل میں آیا۔

ملک کا وہ طبقہ جو گورنمنٹ سے تعاون کرتا تھا اس نے بھی اپنی وفاداری بالائے
طاق رکھ دی اور اپنی بہبودی کا اظہار ترکان آل عثمان کے ساتھ کرنا شروع کیا۔

کم از کم اسلامی ہند میں وہ سب سے پہلا دور تھا جس میں مسلمانوں نے اس طرح اپنے
جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہو اور علی الاعلان اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ اپنی بہبودی
ظاہر کی ہو اور غریب سے غریب آدمی نے بھی ایشیا رو سیر چشمی کا نہایت نادر نمونہ پیش کیا ہو۔
مسٹر ممتاز حسن کا واقعہ | لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر ممتاز حسن نے امین آباد میں ایک



کارکن طبی وفد جنگ بلقان
(سنه ۱۹۱۲ع)

نہایت پر جوش درد انگیز اور فصیح و بلیغ تقریر کی، صاحب ڈپٹی کمشنر بھی اس جلسہ میں موجود تھے وہ مسٹر ممتاز حسن کی اس شعلہ نوائی سے بہت متحیر ہوئے اور اپنی حیرت کا اظہار کئے بغیر مزہ لے لیا لیکن مسٹر موصوف نے نہایت جرأت اور بہمت سے کہہ دیا کہ یہ ایسا مذہبی معاملہ ہے جس میں ہم مسلمانوں سے کسی قسم کی کمزوری کی مطلق امید نہ رکھی جائے، صاحب ڈپٹی کمشنر نے انہیں اطمینان دلایا کہ وہ مسلمانوں کے اس احساس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔

مولنا شبلی کی نظم | مولنا شبلی ساعافیت پسند اور علی سرگرمیوں سے الگ ہونے والا بزرگ بھی اپنے جوش کو قابو میں نہ رکھ سکا اور ایک محرکہ الارا نظم لکھی جو قیصر باغ کی بارہ درمی میں پڑھی گئی اور بہت سے لوگوں کے کان میں آج بھی اس کی گونج باقی ہے۔

بھرجی بٹھی وفد بخیر دعافیت واپس آیا ہے تو پھر ان کے تاثرات اشعار ابدار کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

ان دونوں نظموں میں مولنا شبلی نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی صحیح ترجمانی کی، بلکہ انگریزوں کی پالیسی اور مدبرین برطانیہ کی مسلم آزار روش پر بھی نہایت آزادی سے تکتہ چینی اور تنقید کی۔

ڈاکٹر انصاری کا ارادہ | ان حالات میں ڈاکٹر انصاری کی یہ خواہش ہوئی کہ وہ ہندوستان سے ایک طبی فدیجائیں اور مجروحین و مقتولین کی جو خدمت ان سے بن آئے کریں۔

محمد علی کی حمایت | محمد علی سے جب انھوں نے اپنے اس قابل صد سائنس عزم کا تذکرہ کیا تو محمد علی نے بہت زبردست تائید کی اور انھیں پورے طور سے آمادہ کیا کہ وہ اس کا رخیر کو ضرور انجام دیں۔

مشکلات راہ | لیکن سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ سرمایہ ناپید تھا اور بغیر کافی سرمایہ کے یہ ہم اتمام تک پہنچ نہیں سکتی تھی۔

ہلال احمد دہلی کا وعدہ | اس زمانہ میں ترکان آل عثمان کی امداد و اعانت کے لئے ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں ”ہلال احمد“ کے نام سے انجمنیں قائم ہو گئی تھیں، جن کا مقصد سرمایہ جمع کرنا اور ترکوں کو پہنچانا تھا کیونکہ گورنمنٹ نے بھی مسلمانوں کے جوش و خروش کو دیکھ کر اس کی اجازت دیدی تھی کہ یہاں سے انھیں مالی امداد بھیجی جاسکے اور آسانیاں بھی پیدا کر دی تھیں کہ اس راہ میں مشکلات جو آئیں ان میں کسی نہ کسی حد تک سہولت ہو جائے۔ محمد علی نے یہ معاملہ دہلی کی انجمن ہلال احمد کے سامنے پیش کیا، مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت سمجھائی، وفد کی ضرورت اور اہمیت کی طرف اس کے ممبروں کی توجہ مبذول کرائی، نتیجہ یہ ہوا کہ انجمن نے پندرہ ہزار کی رقم منظور کی اور اس کے انتظامات کرنے کا وعدہ کیا کہ وہ رقم اس وفد پر صرف کی جائے گی اور وہ بھیج دیا جائے گا۔

وعدہ خلافی | لیکن یہ وعدہ ابھی شرمندہ تکمیل نہ ہوا تھا کہ انجمن نے اپنی رائے بدل دی اور وہ رقم جو دینے کا وعدہ کیا تھا اسے براہ راست ترکوں کو بھیجنے کے انتظامات کرنے لگی، محمد علی نے ہر چند سمجھایا کہ کشمیشیوں کی، منت سماجت کی، عواقب و نتائج ان کے سامنے پیش کئے، مگر سب بے سود، انجمن کی اکثریت نے پھر اپنی رائے نہیں بدلی۔“

حیرت انگیز غم | میر محفوظ علی صاحب اپنا مشاہدہ بیان فرماتے ہیں کہ:

”محمد علی نے، جلسہ ہی میں مجھ سے (محفوظ علی سے) پوچھا، ہمارے پاس کتنی رقم ہے؟ میں نے کہا ”اتنے ہزار اتنے سو روپیہ“ کہنے لگے ”الحمد للہ ہمارے پاس کافی رقم ہے، انصاری! میں نے طے کر لیا ہے کہ انشاء اللہ مشن جا ریگا (اور ضرور جائے گا، میرے پاس دس سو روپیہ بھی ہوتے جب بھی ہمت نہ ہارتا تم اللہ کا نام لے کر انتظام کرو، رقم کی فراہمی میرے ذمے۔“

پہل | اسی رات کو اپنے خد خدگار محمد حسین سے کہا، جا کر میرے کمرے میں بیپ تو

جلائے، مکرے میں جا کر کمریہ کے لئے مضمون لکھا جس میں مسلمانوں سے بھی
منہ کے چندہ کے لئے وہ دل ہلائیے والی اپیل کی جس نے کمریہ کے دفتر
میں روپیوں کی بارش شروع کر دی، کمریہ کے فائل گواہ ہیں کہ ایک ایک
دن میں دس دس پندرہ پندرہ ہزار روپے وصول ہوئے ہیں اور میں
گواہ ہوں کہ منی آرڈر اور پارسلوں پر دستخط کرتے کرتے میرا ہاتھ شل ہو ہو
گیا ہے۔“

آخر کار اس طرح محمد علی نے مایوسیوں اور ناامیدیوں کے عالم میں اس مہم کا آغاز
کیا اور اسے اتمام تک پہنچا کر دم لیا۔

باب ۶

ٹرنز مارینس کمپنی

اور

دوسرے واقعات

ترکوں کو قرضہ | سترہ میں جب دول یورپ نے ٹرکی کو مالی دقتوں اور پریشانیوں میں مبتلا کر کے اس کی کوشش کی تھی کہ وہ ایک ذلت آمیز صلح پر مجبور ہو جائے تو محمد علی نے اپنی پورہی کوشش اس امر پر صرف کر دی کہ گورنمنٹ اس کی اجازت دیدے کہ ترکوں کی مالی امداد کی جاسکے، اور جب اس میں کامیابی ہو گئی تو محمد علی نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا، اور لوگوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ترکی تسکات کے حصص خریدیں اور اس مقصد عظیم میں انھیں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی، محمد علی کے ایک سابق عقیدتمند کا بیان ہے کہ:

”یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان کی اسلامی آبادی نے ایک کثیر رقم ترکی سلطنت کو بطور قرض کے دی“

مقدونیہ آؤ | حکومت ہائے بلقان کے انسانیت سوز اور شرمناک مظالم سے متاثر ہو کر ترکوں کی ایک جماعت نے ایک اپیل شائع کی جس کا عنوان تھا ”مقدونیہ آؤ اور ہماری مدد کرو“ وہ اپیل اپنے دردناثر اور واقعیت و حقیقت کے اعتبار سے نہایت زبردست اثر اپنے اندر رکھتی تھی۔

محمد علی نے اسے کمریڈ میں بالاقساط شائع کیا جس پر دہلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہمدرد و کمریڈ کے وہ تمام پرچے ضبط کر لئے جس میں یہ اپیل شائع ہوئی تھی۔
ضمانت کی طلبی | اور دو ہزار کی ضمانت طلب کی جن سابق ”عقیدتمند“ صاحب کا بیان اوپر گزر چکا ہے وہ فرماتے ہیں:

”اس حکم کے خلاف آپ نے سب سے زیادہ آزاد خیال عدالت کلکتہ ہائی کورٹ میں اپیل کی، آپ کی جانچے مشہور مقنن مسٹر مارٹن نے تمام عمر کا قانونی تجربہ اپنی بہترین قانونی قابلیت اس حکم کو ناجائز قرار دینے میں صرف کی، مگر مسٹر مارٹن اور محمد علی اور تمام ہندوستان ششدر رہ گیا، جب فاضل ججوں نے یہ ظاہر کیا کہ پریس ایکٹ ایک ایسا ہمہ گیر قانون ہے جس میں صحائف آسمانی بھی آسکتے ہیں۔“

ٹرنز مارین کمپنی | آگے چل کر وہی صاحب فرماتے ہیں:

”سلسلہ میں ٹرنز مارین کمپنی نے حجاز کی جہاز رانی کے اجارہ کی درخواست مع واپسی ٹکٹ حکومت بمبئی کی خدمت میں پیش کی اس نے مع اپنی سفارش کے حکومت ہند کی منظوری کی اجازت بذریعہ تار مانگی، اس خفیہ کارروائی کی خبر آپ کو بھی بذریعہ ماہ ہو گئی، آپ نے فوراً کمریڈ کا ایک ضمیمہ شائع کیا، جس میں اس درخواست کی منظوری کے خلاف صلے احتجاج بلند کی اور پرائیویٹ طور پر لارڈ ہارڈنگ کو اس مسئلہ کی جانب متوجہ کیا، آپ کی اس جدوجہد کا یہ اثر ہوا کہ وائسرائے نے اس درخواست کو باطل مسترد کر دیا، اب یہی مذموم طریقہ آپ کی نظر بندی کے بعد محسن قرار دیا گیا اور ٹھیکہ بھی اسے دیدیا گیا۔“

باب

ہمدرد

کلکتہ سے دہلی | محمد علی نے کمریڈ کا اجرا کلکتہ سے کیا تھا، اس لئے کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنا اخبار حکومت ہند کے دارالسلطنت اور مرکز سے نکالیں لیکن جب حکومت نے اپنا مرکز تبدیل کر لیا اور کلکتہ سے دہلی آگئی تو محمد علی نے بھی حکومت کا تعاقب کیا، اور دہلی پہنچ گئے، اور یہاں آکر انھوں نے ہمدرد کے اجرا کے انتظامات بھی کمریڈ کے ساتھ شروع کر دیے۔

توقین | اصل میں ان کا یہ خیال پرانا تھا، مگر حالات سازگار نہ ہو سکے اس لئے ان کا ارادہ قوت سے فعل میں نہ آسکا، سب سے بڑی وقت یہ تھی کہ بیروت سے انھوں نے جو ٹاپ ہمدرد کے لئے بھجوا دیا تھا وہ پورا نہیں تھا اور جب تک وہ مکمل نہ ہو جاتا اس وقت تک ہمدرد نکالنا مشکل تھا۔

حکیم اجل خاں کی رائے | میر محفوظ علی صاحب فرماتے ہیں کہ:

”ایک روز حکیم اجل خاں قشرف لائے اور دریافت کیا کہ ہمدرد کے اجرا میں کیا دیر ہو، محمد علی نے کہا ابھی تک پوسٹ اخبار کے لئے ٹاپ نہیں آسکا ہے فرمانے لگے آج کل خبروں کی بہم رسانی کی سخت ضرورت ہے اگر پورا اخبار نہ نکل سکے تو صفحہ دو صفحہ ہی کا کمال دیکھ، آمدنی بھی ہوگی اور پبلک کی خدمت بھی۔“

نقیب ہمدرد | محمد علی نے اس رائے کو پسند کیا اور ہمدرد کا وہ سلسلہ خاص ۲۳ فروری ۱۹۰۲ء سے جاری ہوا جسے عام طور پر نقیب ہمدرد کہتے ہیں یہ پچھ روزانہ

ایک درق پر چھپا رہا اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتا تھا۔

ہمدرد کا اسٹاف | محمد علی کو معلوم ہوتا ہے شخصیت شناسی میں بھی مکملہ تمام حاصل تھا، ہمدرد کے اسٹاف میں جن جن کرانچوں نے ایسے آدمی سکے تھے جو محمد علی کی تربیت کی بدولت مختلف حیثیات سے روشناس خلق ہوئے، بہت سے ذروں کو محمد علی نے اپنی نگاہ کیلئے اثر سے آفتاب بنا دیا، ہندوستان کا کوئی اخبار آج تک اتنا قابل قدر ادارتی علم نہیں فراہم کر سکا، ہمدرد کے علم کا ایک ایک فرد اپنے وقت کا ایک بہت بڑا ادیب و صحافی ثابت ہوا،

میر محفوظ علی صاحب سا ادیب پیشل جو تقریباً مضمون نگاری فرماتے تھے (دور اصل فیجی تھی) سید ہاشمی فرید آبادی، قاضی عبدالغفار، سید جالب، مولوی عبدالکلیم شرر، فاروق صاحب دیوانہ سبھی ہمدرد کے دفتر میں موجود تھے۔

اور پھر دور ثانی میں عارف ہسوی اور ڈاکٹر سعید احمد جیسے افراد کا کھنچ کھنچ کر ایک ہی حلقہ میں جمع ہو جانا محمد علی کی سحر آفریں شخصیت کا نتیجہ تھا، پھر جس اخبار کو آسانے نظیر علم ادارت اور محمد علی سا قابل ایڈیٹر ملے وہ کیوں نہ آسمان صحافت پر ہر دو ماہ بن کر چلے؟ وہ چمکا اور اس نے اپنی ضوفشانی سے دوسرے سیارگان و ثوابت کی روشنی اور چمک دمک میں کمی پیدا کر دی۔
محمد علی کی ادارتی رہنمائی | قاضی عبدالغفار صاحب جو اس زمانہ میں ہمدرد کے رکن ادارت تھے، تحریر فرماتے ہیں:

”میری زندگی میں وہ یادگار صبح تھی، یعنی وہ پہلا دن جب جہنیت استاد گئے میرے اور محمد علی کے مستقل تعلقات شروع ہوئے، میں اس زمانہ کو بھول نہیں سکتا، کیا زمانہ تھا، جب ہمدرد دو کمرے کے دفتر میں صبح اور شام تمام ممبرانِ شاخہ اخبار کے متعلق مشورے میں شریک ہوتے تھے، شوکت علی، محمد علی، سید محفوظ علی

راجہ غلام حسین، میں اور دو چار، ہم سب زیر بحث مسائل پر بحث کرتے تھے اور محمد علی صاحب ایک ایک کو اس کے کام کے متعلق ہدایات دیتے تھے، ان کے دماغ کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ جب ایک چھوٹا سا نوٹ لکھنے کے لئے بحث کے خاص خاص پہلو بتانا شروع کرتے تھے جو اگر سب حیطہ تحریر میں لائی جاتی تو ہمدرد کے آٹھ دس کالم پر مہو جاتے۔

دفتر ہمدرد کی فضا | آگے چل کر قاضی صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں۔
”ہمدرد کے دفتر کی آب و ہوا بھی کچھ عجیب تھی، وہ صحبتیں اور دل کی انگول کی خواہشیں، اقبال کی نظمیں اور شوکت علی بھائی کا ترنم، غلام حسین مرحوم کے دھیمے مذاق، محفوظ علی بھائی کی شیریں گفتاری کہ ہر لفظ جو وہان موزوں سے نکلتا تھا گویا ایک برکت فلک سیر سے کم نہ ہوتا تھا۔“

محمد علی کا نظریہ صحافت | ہمدرد کے ذکر کے سلسلہ میں نامناسب نہ ہوگا، اگر محمد علی کا وہ نظریہ صحافت پیش کر دیا جائے جس پر عمل پیرا ہو کر ہمدرد نے ہندوستانی صحافت میں اپنے غیر فانی نقوش قائم کئے ہیں۔

یہ وہ زمانہ ہو کہ محمد علی ابھی بڑودہ میں برسرِ ملازمت ہیں۔ انشا پر دازی اور مصنفوں کی گری کا جب جوش اٹھا ہو تو ٹائمز آف انڈیا بمبئی میں اپنے قلم کی روانی دکھاتے ہیں اور اس کے ایڈیٹر سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں خود ان کے دل میں بھی اس میدان میں آنے کی تمنا پرورش پا رہی ہے اور اس خیال سے جلد از جلد رہائی چاہتے ہیں مگر بقول محمد علی صاحبؒ
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت اوجھل نہیں آتی
اسی زمانہ میں گجرات سے ان کے ایک شناسا نظام الدین صاحب نے ایک اخبار نکالنا

چاہا اور محمد علی سے مشورہ طلب کیا، محمد علی نے مشورہ کی صورت میں صہافت کے یہ زین اصول ان کی خدمت میں پیش کر دئے۔

”اخبار کی کامیابی کے لئے اتنی باتوں کا ہونا لازمی ہے:-

(۱) ذاتیات سے بالکل مبرا ہونا کسی دشمن کے خلاف کچھ لکھا جائے نہ خواہ مخواہ

دوستوں کی تعریف کے قصیدے گائے جائیں۔

(۲) کسی شخص یا اخبار کی رائے کے خلاف کچھ لکھنا ہو تو وہ مخالفت محض رائے

تک رہی ذات کا حصہ شامل نہ ہو۔

(۳) جو کچھ لکھا جائے عبارت آرائی کے خیال سے نہیں نہ لوگوں کے چنگیاں

لینے کی غرض سے بلکہ متانت سے اور نہایت سنجیدگی سے۔

(۴) جہاں تک ممکن ہو وہی خبر چھپانی جائیں جو انگریزی ڈیلی شپ پتے ہیں

اگر اس سے زیادہ کوئی لوکل باہر کی خبر چھپانی ہو تو اس کے راوی کا ثقت

ہونا سب سے ضروری ہے۔

(۵) اخبار کا مقصد اپنی قوم کو نفع پہنچانا ہونا چاہئے نہ کہ دوسری قوم کو نقصان

پہنچانا اس لئے دوسروں کے رنج پر اپنے کو خوش نہ ہونا چاہئے، خصوصاً ہندو

پر سبھا جملہ نہ کرنا چاہئے، ان کے حملہ کا دفعیہ ضرور ہے۔“

(۶) اخبار خبروں کا مجموعہ ہوتا ہے لہذا زیادہ تر خبروں کا حصہ ہونا چاہئے۔

(۷) مضامین میں ایک ایڈیٹوریل ہو، کسی ایسے مضمون پر جو اس زمانہ میں

زیر بحث ہو اور یہ مضمون اخبار بھرنے کی غرض سے نہ لکھا گیا ہو بلکہ ایسا ہو کہ

جس کا لکھا جانا نہایت ضروری تھا مضمون پوٹیکل ہو خواہ سوشل خواہ تعلیمی خواہ

تجارتی۔

(۸) ایڈیٹوریل نوٹ حال کے واقعات اور خبروں پر اپنی رائے زنی کیلئے
ہیں اس لئے اسی کام میں آنا چاہئے۔

(۹) ایک مضمون کسی اور کا بھی ہونا چاہئے خواہ وہ کسی خبر کے متعلق ہو یا کسی
مستقل مضمون پر۔

(۱۰) مختلف مقامات پر چند مضمون نگار دوستوں یا تنخواہ داروں کا بندوبست
کرنا چاہئے جو ہینہ میں ایک مرتبہ آدھے کالم میں آسکے۔

(۱۱) خطوط وہی چھاپے جائیں جو واقعی کسی ضرورت سے لکھے گئے ہوں، نہ کہ
نامہ نگاروں کی جو دت طبع کے اظہار کے لئے۔

(۱۲) اخبار مذہبی بحث سے بالکل معرا و میرا ہو۔

(۱۳) ایڈیٹر کو خود تمام مسئلوں پر غور کرنا اور دوسرے اخباروں اور کتابوں سے
واقفیت حاصل کرنا لازم ہے، آپ کو یہ نہیں معلوم ہے کہ روزانہ اخبار کا ایڈیٹر
کس قدر سخت محنت کرتا ہے، خود مجھے مصر کے متعلق کچھ لکھنا ہے روزانہ اخبارات
سے بہت سے واقعات معلوم ہوتے رہتے ہیں مگر تین چار کتابیں شروع سے
آخر تک پڑھی ہیں تب جا کر ایک دو کالم کا مضمون لکھ سکوں گا، اگر قلم برداشتہ
لکھنا چاہوں تو بہت آسان ہے مگر پڑھنے والے کو مشکل ہو۔“

نظریہ کیا تھا؟ | یہ تھے محمد علی کے وہ زرین اصول صحافت جن پر ان کا اخبار سہار دھلاؤ
جس نے ہمیشہ غیروں سے خراج تحسین حاصل کیا۔

محمد علی کو اپنی زندگی میں بار بار بڑی بڑی شخصیتوں کے خلاف قلم اٹھانا پڑا اور سخت

سے سخت مخالفت کرنی پڑی، لیکن غور کیجئے، آپ کو معلوم ہو گا کہ انھوں نے اپنے اصول کو
تجاویز بھی نہیں کیا جس مسئلہ میں انھوں نے اختلاف کیا، اس کے بعد کسی دوسرے مسئلہ میں انھوں
نے اس سے زیادہ اتفاق کیا، اور اتفاق و حمایت کا حق ادا کر دیا۔

ڈاکٹر کچلو، ڈاکٹر عالم وغیرہ کے سلسلہ میں آپ اس کی تفصیل پڑھ چکے ہیں۔

یہی وجہ ہے جو ان کا زبردست سے زبردست مخالف ان کی قدر کرتا تھا۔

حکیم برہم کا خط | چنانچہ حبیب ہمدرد کی نشاۃ ثانیہ ہوئی ہے، تو حکیم برہم مالک و ایڈیٹر اخبار
شرق گورکھپور نے انھیں ذیل کا خط اپنی ساری مخالفتوں کے باوجود لکھا۔

”بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمدرد و کمریڈ کے اجرا کا قصد فرمایا، یقین ہے کہ

قوم اور ملک کی متزلزل حالت ٹھیک ہو جائے گی اور رائے عامہ کی پریشانی دور

ہو جائے جس روز پہلے پرچے جاری ہوں، میرے نام ایک سال کے لئے ذیل

پرچے ویلوروانہ کر دیں۔“

اعلیٰ انتظامات | محمد علی نے ہمدرد اس شان اور اس آن بان کے ساتھ چلایا کہ اس کی نظیر
مناشکل ہے۔

ہندوستان کا وہ پہلا اردو روزنامہ تھا جس نے براہ راست ایسوسی ایٹڈ پریس اور

روائٹرز کی خدمات حاصل کی تھیں۔

اشاعت | یہی چند در چند اور گونا گوں خصائص تھے جن کی بنا پر ہمدرد ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا

تھا اور جنگ کے زمانہ میں تو اس کی اشاعت بہت زیادہ بلکہ ہزاروں تک پہنچ گئی تھی، یہی

وہ پہلی معراج تھی جو ہمدرد کو حاصل ہوئی اور اس کے بعد سے آج تک کوئی اخبار ہندوستان کی

اردو صحافت میں اپنی کثرت اشاعت کا ایسا نمونہ نہیں پیش کر سکا۔

گورنمنٹ کا خراج تحسین | اپنے اس قابل رشک کارنامہ کی داد و تحسین کہ ہمدرد نے گورنمنٹ سے بھی حاصل کر لی، چنانچہ ان کی نظربندی کے بعد چیف کمشنر صوبہ نے اردو پریس کے اوپر اس کی غیر ذمہ دارانہ روش پر سرکاری سالانہ رپورٹ میں جو نہایت زبردست اعتراضات کئے گئے تھے ان سے ہمدرد کو مستثنیٰ کر دیا تھا اور اس کے مضامین و مقالات کی تعریف و توصیف کی تھی۔

”افضل ما شہدت بہ الاعداء“ کی کتنی صحیح تصویر ہے؟

سنسرا | ہمدرد پر جب جنگ کے بعد سنسرا ٹھہرا گیا اور بغیر اس کی منظوری کے کوئی مضمون یا خبر شائع نہ کرنا مجرم کر دیا گیا تھا تو ایک دلچسپ لطیفہ پیش کیا، جسے خود محمد علی نے اس طرح بیان کیا:

”ہمدرد کے سنسر نے تو ایک بار چڑیا چڑھنے کی کہانی کو بھی خارج کر دیا تھا اور

اعتراف کیا گیا تو کہا کہ بجائی ہے تو چڑیا چڑھنے ہی کی کہانی اور مطلب بھی صاف

معلوم ہوتا ہے مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی معلوم ہوتا ہے اور روٹی کا معاملہ

ہے نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھردیا ہو۔ اور جواب دہی ہمارے سر کڑے؟

التور | آخر محمد علی کی نظربندی کے بعد ہمدرد کی اشاعت بھی ملتوی کر دینی پڑی اور

گو سید جالب صاحب ”آف ہمدرد“ نے بہت کوششیں کیں مگر افسوس ہے کہ وہ کامیاب نہ ہو سکے اور اخبار کا چلانا ان کے لئے ناممکن ہو گیا۔

درمیانی وقفہ | ہمدرد کی نشاۃ اولیٰ اور نشاۃ ثانیہ کے درمیانی وقفہ میں ہندوستان پر

جوائنٹ آرمی مسلمانوں پر جو مصائب ٹوٹے، عالم اسلامی پر برطانوی ہوس استعمار کے دندانِ

جس جس طرح تیز ہوئے، خود ہندوستانی سیاسیات میں جو عظیم الشان مدجزا آیا، اور محمد علی کی

ذات جن حالات کی آماجگاہ رہی، یہ عنوان اس تفصیل کی نذر نہیں کیا جاسکتا، سر دست ان

تمام انقلابات و حوادث سے قطع نظر کر کے آپ ایک بار ہمدرد کے دفتر میں اپنی نظر جاسے۔
نفاۃ ثانیہ | بیجا پور جیل سے رہائی کے بعد محمد علی نے کمرٹڈ کے ساتھ ہمدرد کی زمام ادارت
 پھرنے ہاتھ میں لی۔

عہد ثانی کو عہد اول سے عمدہ ہونا چاہئے تھا مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا، محمد علی کے جن
 اور دماغ پر جو حملے ہوئے انھوں نے ان کی متاعِ اطمینان و سکون کو درہم برہم کر دیا اور وہ
 فروغِ خاطر کے ساتھ کمرٹڈ کی طرح ہمدرد کو بھی نہ چلا سکے، علاوہ ازیں ان کی غیر معمولی مصروفیت
 جس میں کانگریس کی صدارت کے سبب اور اضافہ ہو گیا تھا، نیز عہد اول کے سے مخلص رفقا
 اب ناپید تھے۔

لیکن پھر بھی ہمدرد نے اپنا میار قائم رکھا اور وہ کبھی بھی ان جرائم و اخبارات کی کھف
 میں نظر نہیں آیا، جن کا مقصد صرف دریوزہ گرمی ہے اور جن کا دھچپ مشغلہ خواہ مخواہ دوسروں
 کو چھیڑ چھیڑ کر ”گر مئی بازار“ کا ہنگامہ پیدا کرنا۔

وہ اپنی سنجیدہ، متین اور جاذبِ توجہ روش پر چلتا رہا اور اب چونکہ پبلک اور آزاد
 بد مذاق بنائی جا چکی تھی اس لئے وہ ”چاشنی“ ڈھونڈتی تھی اور ”چاشنی“ یہاں کہاں؟
 ہمدرد کی دوسری ناکامی کا سبب یہ ہوا کہ اب اس کے نظریہ میں بھی فرق آگیا تھا،
 یعنی پہلے وہ اصول صحافت پر عامل تھا اور پوسے طور پر ایک ”ایٹوڈیٹ“ بلند روزنامہ تھا۔
 لیکن اب محمد علی نے اسے صرف قوم کے مریضِ غم کا نسخہ بنا دیا جس میں پرہیز کی
 غیر دھچپ ہدایتیں تھیں، تلخ و ترش دواؤں کی فہرستیں تھیں اور ایک ہی طور پر مسلسل علاج
 کرنے کی کوشش تھی۔

اس بنیادی تغیر کے باوجود اس نے اپنی آن بان میں کوئی فرق نہیں کیا، نہ بے موقع

طور پر اس نے کسی کی خوشامد کر کے کسب زر کی کوشش کی، اور نہ گالیاں دے کر، ڈرا دھمکا کے بعض اخبارات کی اصطلاح میں کچھ ”ایٹھا۔“

خواجہ حسن نظامی کی رائے | چنانچہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے ۲۴ نومبر ۱۹۳۷ء کے روزنامہ میں ہمدرد کی بلندپاگی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا تھا۔

”مسلمانوں کے اور ہندوستان کے شہرہ آفاق لیڈر مولانا محمد علی صاحب کی ایڈیٹری میں ”ہمدرد“ روزانہ شائع ہوتا ہے، اس اخبار کی طرز عامیانا نہیں ہے بلکہ انگریزی کے اعلیٰ اخباروں کی شان کے موافق نہایت باوقار اور دل رائے زنی اس اخبار میں ہوتی ہے، اسلامی ممالک اور اسلامی حقوق اور ہندوستانی حقوق کی یکساں حمایت کرتا ہے۔“

ہمارا جہ اندور کا واقعہ | ہندوستانی اخبارات بالخصوص اردو اخبارات کا بالعموم شیوہ اقیانوس ہے کہ جہاں کسی بڑے آدمی پر کوئی آفت آئی اور انھوں نے اس کے آستانہ کے دور لگانا شروع کر لیا، اگر اس دور کے کچھ مل گیا تو ”مدد خدات“ حاضر ہیں اور نہ ملا تو پھر ایڈیٹریل کی شمشیر بزمہ موجود ہے۔

ہمارا جہ تاجھ، ہمارا جہ اندور، حضور نظام کی پانچ گاہوں کے واقعات، لکھنؤ میں ایک مشہور تاجر کا مقدمہ، علی گڑھ سے ڈاکٹر منشیہ الدین کی علیحدگی، کہانٹک شمار کر ایسے، ان سب واقعات میں مقامی اور غیر مقامی اخباری ”نمائندوں“ نے اشارۃً بہت کافی مالی حالت مضبوط کر لی۔

ہمارا جہ صاحب اندور کا جب ممتاز بیگم والا مشہور واقعہ عالم وجود میں آیا، اس وقت اگر ہمدرد چاہتا تو اپنا سارا قرضہ اس آمدنی سے ادا کر سکتا تھا اس لئے کہ اسے کسی سفارش کی ضرورت نہیں تھی، اس کی رائے کا گورنمنٹ کے حلقہ اور قوم کے طبقہ میں جو اثر تھا وہ ظاہر تھا،

چنانچہ ہمدرد کے بعض ”ہمدردوں“ نے ہمارا جہ صاحب تک اس قسم کی تحریک کرنا چاہی کہ ان پر جو آفت آرہی تھی اس کا مقابلہ بھی ہو سکے گا اور ہمدرد کو بھی فائدہ پہنچ جائیگا۔ محمد علی کو اس کی خبر ہوئی تو کہتے ہیں:

”جوں ہی میں نے اس کا ذکر سنا، میں نے ان آدمیوں کو ڈھونڈ نکالا اور ان سے حلف لیا کہ وہ اس قسم کا کوئی ذکر نہ اوروں کی طرف سے نہ اپنی طرف سے کریں گے“

الور کی جو بیلی | دوسرا نہایت اہم واقعہ ہمدرد کی اصابت استقامت کا یہ ہے:

ہمارا جہ صاحب الور نے اپنی طرف سے ایک معقول رقم لے کر محمد علی کو انگلستان بھیجا تھا کہ وہ اپنی صحت کی طرف اسی بہانہ سے متوجہ ہوں، کچھ آرام لے اور کچھ علاج کریں تو کسی نہ کسی حد تک تو صحت درست ہو ہی جائے گی، محمد علی روانہ ہو گئے۔

ہمدرد کی مالی حالت اس وقت بہت خراب ہو رہی تھی اس لئے وہ اسے بند کر دینا چاہتے تھے، لیکن ان کے دودو فاشعار اور مخلص دوست آگے بڑھے اور انھوں نے ہمدرد کو بند نہیں ہونے دیا۔

مولانا عبد الماجد صاحب دریا باوی مدظلہ نے ہمدرد کی ادارتی رہنمائیاں اپنے متعلق کر لیں۔ اور مولانا ظفر الملک صاحب علوی مدیرانہ نظر نے انتظامی تقاضوں کو دیکھنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

محمد جعفری صاحب دیر ملت جو اس سے پہلے سب ایڈیٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے ایڈیٹر کر دے گئے۔

ولایت سہ واپسی پر بھی کچھ دنوں یہی انتظام رہا، محمد علی رنگون کی پیہم طلبیوں سے

مجبور ہو کر رنگون گئے ہوتے تھے۔

عین اسی زمانہ میں مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہ کی روایت کے مطابق محمد علی کی عدم موجودگی میں اس کی تحریک کی گئی کہ الور کی جو ملی رہبر دہرا اپنا ایک ”اپیشل نمبر“ نکالے اور جملہ مصارف مع شے زائد، ریاست کے ذمہ۔

جعفری صاحب نے اتنے اہم معاملہ میں تنہا اپنی ذمہ داری پر کوئی کارروائی مناسب سمجھی محمد علی تو رنگون میں تھے لہذا انھوں نے دریا باد کا رخ کیا اور مولانا عبدالمجید صاحب کے استفسار و استصواب کیا، مولانا نے بھی ذاتی طور پر کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا، انھوں نے اسی وقت رنگون ایک تار دیا جو خاصہ مفصل تھا، اس لئے کہ وقت کم رہ گیا تھا، محمد علی نے ہمارا جہ صاحب الور کی تمام عنایتوں اور زر پاشیوں کے باوجود صاف انکار کر دیا اور لکھ دیا کہ ”کہہ دیا جائے کہ بہرہ رکاش طرح کا اپیشل نمبر آج تک نہیں نکلا، اس لئے معذوری ہے، ہاں بہرہ دہریس میں اگر ضرورت ہو تو ایک بفلٹ چھپ سکتا ہے۔“

اشتہارات | ان ذرائع کے علاوہ اگر صرف کسب و زرعہ ہوتا تو بہرہ دہریس ایسے اشتہارات شائع ہو سکتے تھے، جن کی اشاعت سے پڑھنے والوں کا نہیں تو چھاپنے والوں کا ”بھلا“ ہو سکتا تھا، لیکن بہرہ دہریس نے اس مذاق عام کی بھی کبھی پیردی نہیں کی، وہ اصول پر مر گیا لیکن اپنی خاطر اس نے اصول کا ”قتل“ گوارا نہیں کیا۔

باب

ہنگامہ کانپور

کانپور کی مسجد اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ کم از کم اس کے نام سے ہر شخص واقف ہو خواہ اصل واقعہ کا صحیح طور پر کسی کو علم ہو یا نہ ہو، یہی وہ واقعہ ہے جب مسلمانوں نے ظلم و جبر کے مقابلہ میں نہایت استقامت، استقلال اور بہادری کا ثبوت دیا تھا اور مہر سی خوشی اپنی جانیں محض اللہ اور اس کے گھر کی حرمت کی خاطر نثار کر دی تھیں۔

اصل واقعہ | اصل واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں کانپور کی میونسپلٹی کی طرف سے ایک سڑک تعمیر ہو رہی تھی ایک مسجد ”سنگ راہ“ بنی ہوئی تھی، اور اس کی وجہ سے اس مجوزہ ”مصلحتاً“ میں کبھی پیدا ہو رہی تھی۔

مسجد کے متولیوں نے غایت درجہ دریا دلی اور رواداری کے ساتھ میونسپلٹی کو اس کی اجازت دیدی کہ راستہ میں مسجد کے غسٹخانہ اور پاخانہ کے جو سنگ گراں عامل ہیں انہیں ہٹا دیا جائے۔

میونسپلٹی کو موقع مل گیا اور اس نے اسے منہدم کرانیکے انتظامات شروع کر دیے۔
عامۃ المسلمین، جمہور علماء، اور ہندوستان کے تقریباً تمام بزرگوں نے اس کے خلاف اظہار رائے کیا اور متولیوں کی اس غلط فہمی کو رفع کرنا چاہا کہ وہ اپنی کسی جائداد کے متعلق تو اتنا فیاضانہ اعلان کر سکتے تھے لیکن مسجد کے معاملہ میں نہیں۔

یہ تمام ہنگامہ اور شور و غل بیکار ثابت ہوا اور مسجد کا وہ حصہ آخر کار منہدم کر دیا گیا، اس

کے انہدام نے مسلمانوں کے قلوب پاش پاش کر دیے، کانپور میں بالخصوص اور سائے ہندوستان میں بالعموم ایک آگ لگ گئی، ہندوستان بھر میں جلسہ ہوئے، تجویزیں پاس ہوئیں، گورنمنٹ کے اس فعل پر اظہار نفرت کیا گیا لیکن کانپور جہاں یہ ہنگامہ ہوا تھا وہاں کے مسلمانوں نے سر سے کفن لپیٹ کر مسجد کا رخ کیا اور منہدم شدہ حصہ مسجد کو پھر درست کرنے لگے، پولیس آئی اس نے ان لوگوں کو واپس کرنا چاہا مگر ناکام ہوئی، فوج آئی اس نے ان مجاہدین راہ حق و صداقت کو مرعوب کرنا چاہا مگر بے سود، ہوائی فیر ہوئے مگر لا حاصل اور اس کے بعد پھر فوج کی گولیاں چلیں، کارتوس ختم ہوئے اور لوگ دھڑا دھڑا کرنا شروع ہوئے، گولیاں سینوں پر پڑ رہی تھیں اور لوگ شہید ہو ہو کر زخمی ہو ہو کر، نیم جان ہو ہو کر گر رہے تھے اور یہ سب کچھ ان کی روشنی میں، عدل پرور، و نصفت شعار حکومت کے ایما سے ہو رہا تھا، بلکہ حکم سے ہو رہا تھا۔ اس واقعہ فاجعہ نے مسلمانوں کے غم و غصہ میں اور اضافہ کر دیا اور احتجاج نے بہت نازک صورت اختیار کر لی، مگر حکومت صوبجات متحدہ ٹس سے مس نہ ہوئی، سرجمینسٹن نے اسے اپنے وقار کے خلاف سمجھا کہ وہ اس ”ایچی ٹیشن“ سے متاثر ہو جائیں۔

محمد علی کی کوششیں | اس سلسلہ میں مولانا آزاد جانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مرحوم مولانا مظہر الحق، ہمارا جہ محمود آباد نے بھی جو گرانقدر خدمتیں انجام دیں وہ فراموش نہیں ہو سکتیں۔

ان مقامی اور محدود کوششوں کے علاوہ محمد علی نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پہلے تو انھوں نے سرجمینسٹن صاحب گورنر صوبہ متحدہ سے نجی طور پر خط و کتابت کی، اس نے کہ انھیں امید تھی کہ ان کے ذاتی تعلقات جو سرجمینسٹن سے چلے آ رہے تھے وہ کام آئیں گے اور مسئلہ کی نزاکت اور اہمیت کو سمجھ سکیں گے مگر ان کے سر میں وہ نشہ نہیں تھا جو اس ”ترشی“ سے اتر سکتا۔

مسٹر میکڈانلڈ کو تار | نتیجہ یہ ہوا کہ حبیب محمد علی یلوس ہو گئے تو انھوں نے غالباً ستمبر ۱۹۴۷ء میں مسٹر میکڈانلڈ کو ایک تار دیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس معاملہ کو سمجھیں اور پارلیمنٹ میں اس کے متعلق سوال کریں مگر مسٹر میکڈانلڈ نے بھی اس تار کا کوئی جواب نہیں دیا اور جب ملاقات ہوئی تو غدر گناہ بدتر از گناہ، کیا، جب یہ صورت بھی بے اثر رہی تو محمد علی نے ایک اور انگلستان بہ ہمراہی وزیر جن | تجویز پر عمل کیا یعنی مسٹر (اب سر) اد چیف جسٹس، وزیر جن سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ کو اکتوبر ۱۹۴۷ء میں اپنے ہمراہ لیا اور انگلستان پہنچ گئے یہ روانگی بہت دلچسپ رہی، جب تک جہاز میں سوار نہ ہوئے کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ بباد اسٹن صاحب کی حکومت اس منصوبہ کو درہم برہم کرنے، بہر حال ہاں اس مسئلہ کے متعلق انھوں نے بہت کافی پروپیگنڈا کیا، مضامین لکھے، تقریریں کیں، اور باب حکومت، ممبران پارلیمنٹ اور ارکان کاہنہ سے ملاقات کی اور ہر طرح سے انھیں اس مسئلہ کی نزاکت جنائی اور عواقب و نتائج سے باخبر کیا۔

کامیابی | آخر ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور سر جیمز لاٹوش سابق گورنر صوبہ متحدہ درکن مجلس زیر ہند، محمد علی کے دلائل سے کافی متاثر ہوئے اور اس طرح لندن سے لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند کو ہدایت بھجوائی گئی اور انھوں نے بطور خود اس معاملہ کا تصفیہ اس طرح کیا کہ کانپور پہنچے، ہسپتال میں زخمیوں کا معائنہ کیا، جیل میں قیدیوں کو محبت اور پیار کی نظر سے دیکھا، انھیں اپنا "بیٹا" سمجھا اور سب کو رہا کر دیا اور مسجد کی تعمیر کی اجازت مرحمت فرمائی۔

محمد علی کی واپسی | اس نمایاں کامیابی کے بعد آخر دسمبر ۱۹۴۷ء میں محمد علی ہندوستان واپس آئے اور ان کا نہایت پر خلوص اور شاندار استقبال کیا گیا اور ان کی جاں نشانی اور کارکردگی کا نہایت خلوص قلب سے اعتراف کیا گیا، ان کی رہنمائی کا ایک اہم ذریعہ یہ بھی تھا۔

باب ۹

”چوائس آف دی ٹرس“

سلسلہ میں جب جنگ عظیم شروع ہوئی ہے، اس وقت لندن ٹائمز نے ایک اشتعال انگیز مضمون اپنے اخبار میں شائع کیا تھا اور ترکوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ صرف دوسرے تاشا کیس اس جنگ میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہونا چاہئے، یہاں تک کہ یونان پر بھی ان کی پیش قدمی نہ ہو۔ مضمون حد درجہ اشتعال انگیز اور دل شکن پیرایہ میں لکھا گیا تھا جس سے ترکوں کی سخت توہین اور حقارت مقصود تھی۔

اگرچہ اس زمانہ میں سلیم محمد علی سخت علیل تھیں اور اسی فکر و پریشانی میں محمد علی کورات رات بھر جاگتے گزرتی تھی مگر وہ اپنے اس جوش کو قابو میں نہ رکھ سکے جو اس مضمون کے دیکھنے سے ان میں پیدا ہوا تھا۔

محمد علی کا بیان | چنانچہ اس مضمون کے متعلق خود محمد علی کا بیان ہے کہ:

”میں نے یہ مضمون چالیس گھنٹہ کی لگاتار محنت شاقہ برداشت کر کے لکھا اور اس تمام عرصہ میں ایک منٹ بھی نہ سویا اور جب خود لکھتے لکھتے تھک جاتا تھا تو آجائے کے اسٹنٹ ایڈیٹر کو خود بولتا جاتا تھا اور ان سے لکھواتا تھا اور اس چالیس گھنٹہ میں نہ صرف سونے سے محروم رہا بلکہ خوراک بھی قبوہ کی چند پیالیوں سے شکل ہی آگے بڑھی“

ضمانت کی ضبطی | یہ مضمون گورنمنٹ کے حلقوں میں اس قدر ناپسندیدگی سے دیکھا گیا کہ

چند ہی روز میں اس کا نتیجہ بھی نکل آیا یعنی ہمدرد و کرپڈ کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔
پیروی | لیکن محمد علی خاموش بیٹھنے والے نہیں تھے، انھوں نے اس حکم کی آسانی کے ساتھ
تعمیل نہیں کی، بلکہ اس فیصلہ کے خلاف اپیل کی اور لطف یہ کہ اس مقدمہ کی خود پیروی کی
خود جرح کی اور خود اس حکم کے پرشے بارگاہ عدالت میں اڑائے۔

تفصیل | میر محفوظ علی صاحب کے الفاظ میں اس اجال کی تفصیل یہ ہے:
”کرپڈ کی ضبطی ضمانت کے سلسلہ میں محمد علی نے عدالت میں خود بحث کی اور
دوران بحث میں وکیلوں اور بیرسٹروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے
اور ہر شخص دم بخود تقریریں رہا تھا، باہر نکلے تو برہند و مسلمان دیل بیرسٹر کے منہ
سے بیک زیاں بھی جملہ نکلا ”مستر محمد علی کاش آپ بیرسٹر ہوتے“
محمد علی نے جواب دیا ”آب بھی جو کچھ ہوں اس کی کوئی قدر ہو رہی ہے جو بیرسٹری
میں ہوتی“

اس طرح بالآخر ضمانت ضبط کر لی گئی اور کرپڈ موت کے آغوش میں چلا گیا۔

باب

نظر بندی

جنگ عظیم اپنے ساتھ عالم اسلامی اور اسلامی ہند بلکہ سارے ہندوستان کے لئے بڑی بڑی کشتیوں لائی تھی۔

ڈاکٹر انصاری اور جنرل خاں کا مشورہ | ضبطی ضمانت کے بعد محمد علی نے پھر ذرا بیٹیس کی شکایت محسوس کی اور ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری اور حکیم اجمل خاں نے آپ کو یہ مشورہ دیا کہ آپ نے فوراً سارے دماغی کام نہ چھوڑے تو آپ کی زندگی کو خطرہ ہے، اس مشورہ کے بعد محمد علی رامپور گئے کہ وہاں تباہ آہ و ہوا کا خیال بھی تھا اور وطن کی کشش بھی۔

دہلی کے ایک رفیق کا بیان ہے کہ

”رامپور پہنچے ہی تھے کہ ڈاکٹر جنرل پولیس صوبہ متحدہ نواب صاحب رامپور کے پاس آئے اور نواب صاحب کی معرفت آپ طلب کئے گئے وہاں آپ سے کانپور کے قضیہ کے متعلق سوالات کئے گئے اور اس دوران میں سخت گفتگو ہو گئی۔

رامپور میں نظر بندی | ڈاکٹر جنرل کے جانے کے بعد آپ کو یہ بتایا گیا کہ آپ نواب صاحب کی بغیر اجازت رامپور سے نہیں جاسکتے، گویا دوسرے منوں میں آپ نظر بند کئے گئے غالباً ۴ گھنٹہ کی پر لطف نظر بندی کے بعد آپ رہا ہوئے اس کے بعد آپ نینی تال کی گھاٹیوں میں شکار کھیلنے گئے تو وہاں یہی

پر سخت بنجار میں مبتلا ہوئے، اس عرصہ میں ڈاکٹر انصاری نے نینی تال میں موسم گرما بسر کرنے کے لئے مکان وغیرہ کا بندوبست کیا، آپ کی غلات کی خبر سن کر مولانا شوکت علی دہلی سے راپور گئے اور دونوں بھائیوں کا ارادہ حسب دستور حضرت معین الدین چشتی کے سالانہ عرس پر اجیر شریف جانے اور وہاں سے نینی تال جا کر موسم گرما گزارنے کا تھا، اجیر شریف جاتے ہوئے ایک ہفتہ کے لئے دہلی ٹھہرے، دہلی تشریف لائے ہوئے آپ کو دو ہی روز حکم | گرنے سے تھے کہ دہلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا ایک جابرانہ حکم، ارمی کو قانون تحفظ ہند کی رو سے آپ کو دیا گیا کہ آپ سے اپنے برادر محترم کے اپنے تئیں نظر بند نہیں، اس حکم کی رو سے آپ پر وہ تمام پابندیاں عائد کی گئیں جو جرائم پیشہ پر بھی عائد نہیں کی جاتیں، آپ نے اس حکم کو پڑھتے ہی خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ یہ ایک پیغمبرانہ سنت ہے جس کی ادائیگی کے لئے خدا نے حکیم نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے منتخب کیا۔“

قاضی عبدالغفار کا بیان | اس حکم کو سن کر محمد علی پر کیا تاثرات غالب ہوئے اور ان کے چہرہ بشرہ سے کیا ظاہر ہوتا تھا، اسے قاضی عبدالغفار صاحب کی سطور ذیل سے معلوم کیجئے۔ وہ لکھتے ہیں :

”خوش وقتی کا یہ عالم تھا کہ جن وقت نظربندی کا حکم آیا ہو، میں دفتر میں نہ تھا، لیکن بلایا گیا اور جب محمد علی صاحب کے کمرہ کے پاس پہنچا تو میں نے ایک شور مبارکباد سنا اور یہ خیال ہوا کہ شاید کوئی بہت اچھی خبر کہیں سے آئی ہو لیکن دیکھا ہوں تو کمرہ کے وسط میں میز پر احکام نظربندی کھلے رکھے ہیں

اور ایک غفلت بہت بڑا ہے جس میں دونوں بھائیوں کی آواز جو ایک دوسرے کو نہیں کر سکا رہا دھڑکتا ہے، سب سے زیادہ بلند ہے۔“

مہرولی کو روانگی | بہر حال ان احکام نادرہ کے بعد محمد علی نے حسب الحکم مہرولی جانیکا ارادہ کیا کہ رسی کو جمعہ کے روز علی برادران جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے گئے تھے، اہالیان دہلی کو اس خبر کی اطلاع مل گئی تھی اس لئے ایک خلقت کی خلقت ان دونوں بھائیوں کی زیارت کو عبدالغفار صاحب کا شاہدہ | آئی تھی، قاضی عبدالغفار صاحب اس روز کا اپنا شاہدہ یوں بیان فرماتے ہیں :

”وہ آخری جمعہ مجھے یاد ہے جب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر یہ دونوں اہل دہلی سے رخصت ہوئے تھے اور دل کی کیفیات سے بے قابو ہو کر رونے والوں کو متعین صبر و استقامت کر رہے تھے، مسجد شاہجہانی کی سیڑھیوں پر یہ دونوں پتھر کے دو نیار تھے جن پر زمانہ کی طوفان انگیریاں بے اثر تھیں۔“

مہرولی کی پابندیاں | مہرولی کے ایام نظر بندی میں محمد علی کو کچھ آسانیاں بھی حاصل تھیں یعنی وہ مشغلہ تحریر جاری رکھ سکتے تھے، اور اس صورت میں انھیں بہت زیادہ وقت بھی نہیں تھی، راجہ غلام حسین کرپڑ کے لئے اور قاضی عبدالغفار و سید جالب ہمدرد کے لئے کافی تھے، یہاں پہنچ کر محمد علی نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے اپنا ”گناہ“ دریافت کیا، جس کا یہ مختصر ”سرکاری“ جواب دیا گیا کہ ”صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایسے سوالات کا جواب دینا پسند نہیں کرتے۔“

نارین کا حجوم | محمد علی مہرولی میں نظر بند تھے لیکن شکر ہے کہ اہالیان دہلی کو دہلی میں نظر بند نہیں کر دیا گیا تھا اس لئے دہلی والوں کو یہ آسانی حاصل تھی کہ وہ مہرولی آکر محمد علی سے مل سکیں، اگرچہ وہ خود مہرولی سے باہر نہیں جاسکتے تھے !

گورنمنٹ کو شاید ان کی یہ حرکت بری معلوم ہوئی اس لئے اس نے ان خطرناک لوگوں کو مہرولی سے ہٹا دیا، اور لینڈون بھیج دیا۔

مہرولی سے لینڈون | لینڈون پہنچ کر مہرولی کی سی نیم آزادی ”بھی سلب کر لی گئی اور ان کے قلم پر سنسر شپ قائم کر دی گئی، پہلے اگر ہمدردیں مضامین لکھ سکے تو اب اس سے بھی محروم ہو گئے، ہمدرد بھلا اس نعمت غلطی سے کیوں محروم رہتا، اسے بھی سنسر کے فیض گراں پایہ سے مستحضر ہونے کا موقعہ عطا فرمایا گیا۔

اس سلسلہ میں چڑیا چڑوٹنے کی کہانی کے حالات ہمدرد کے سلسلہ میں بیان ہو چکے ہیں لینڈون پہنچ کر محمد علی نے اپنے پرانے دوست اور جدید دشمن سر جسٹس مٹن گورنر صاحب متحدہ سے اپنی نظربندی کے اسباب دریافت کئے، مگر یہاں سے بھی وہی جواب ملا کہ گورنر صاحب رشائے اپنی کثیر مصروفیتوں کے سبب، اپنے احکام پر فریاد گفت و شنید نہیں کر سکتے۔

جرم کیا تھا؟ | علی برادران کی نظربندی کے بعد ایک نہایت اہم سوال پیدا ہوا کہ آخر ان لوگوں کا جرم کیا ہے جس کی بنا پر قید بے میعاد بھگتے پر انھیں مجبور کیا جا رہا تھا۔

عجیب سو اتفاق کہ یہ سوال ہمیشہ ایسے وقت گورنمنٹ سے کیا گیا، جب وہ بالکل خالی الذہن ہوتی تھی، اور جواب دینے پر اپنے نہیں کسی طرح آمادہ نہیں پاتی تھی، اور اگر کونسل کے ”آئریبل ممبر“ اس پر بھی اپنے سوال کے جواب پر مصر ہوتے تھے تو کبھی کچھ کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا اور کبھی کوئی دوسری بات بتائی جاتی تھی۔

آئریبل رضا علی کا سوال | آئریبل رضا علی نے جب سوال کیا تو جواب یہ دیا گیا کہ نظربندی کا حکم دفعہ ۲ قانون تحفظ ہند کے ماتحت دیا گیا ہے اور پھر سلسلہ میں جب دہلی کی انتظامی رپورٹ شائع ہوئی تو علی برادران کے متعلق یہ لکھا گیا :

”اس ماہ میں محمد علی شوکت علی کو نظر بند کرنا ضروری معلوم ہوا اس لئے گورنمنٹ کے خلاف ان کی سخت و تلخ کارروائیاں مسلمانوں کی ایک جماعت پر برا اثر ڈال رہی تھیں۔“

مسٹر منظر الحق اور مسٹر خباج کے سولات | پھر اسپرل کونسل میں جب مسٹر منظر الحق اور مسٹر خباج نے ضمناً علی برادران کے متعلق سوال کیا تو بتلایا گیا کہ چونکہ کھلم کھلا انھوں نے گورنمنٹ کے خلاف حصہ لیا اس لئے وہ نظر بند کر دئے گئے اور اگر وہ آئندہ محتاط نہ ہوں گے تو گورنمنٹ ان کی رہائی کے مسئلہ پر غور کر سکتی ہے اور بعد کو جب مسئلہ کے ایجنٹیشن میں منرلنٹ غیر رہا کی گئیں تو پھر علی برادران کی رہائی کا مسئلہ پیدا ہوا، مگر اب ان کے جرم کی نوعیت بدل چکی تھی بخیر اس کا ذکر آگے آئے گا۔

لینڈون سے چھنڈ واڑہ | ان حضرات کو جب ہرولی سے لینڈون بھیجا گیا تھا تو خیال تھا کہ اب یہاں کچھ روز نظر بندی ہی کی حالت میں ہی گمراہیں موقع ملے گا کہ نسبتاً آرام و سکون کی زندگی بسر کر سکیں گے، مگر گورنمنٹ تو ان سے کھیل کر رہی تھی، یہ زندگی بھی اسے نہیں پڑائی اور اس نے انھیں چھنڈ واڑہ جیسے دور دراز مقام پر منتقل کر دیا، چھنڈ واڑہ پہنچنے کے حالات ہم محمد علی مکتوب بنام عبدالغفار | کے اس مکتوب سے لیتے ہیں جو انھوں نے اپنے اسسٹنٹ قاضی عبدالغفار صاحب کو لکھا تھا۔

”راستے کی مختصر سی سرگزشت سنا تاہوں شرائط یہاں بھی بختہ ہی ہیں جو لینڈون جاتے وقت موصول ہوئے تھے، راستے کی کیفیت سنو، پہلے اطلاع شروع نومبر میں ملی تھی کہ تیار رہو لیکن یکایک ۱۳ نومبر کو اطلاع ملی کہ ۲۰ نومبر کو چھنڈ واڑہ جانا ہوگا، اس اطلاع کے سننے پر ہم نے چند کارڈ دوستوں کو ڈال دئے کہ فلاں

راہ سے فلاں دقت گزریں گے، ہنسنے بلا استنساب کو بھیج دیا، اس لئے کہ اس میں نطاس کوئی مضائقہ نہیں تھا، والد آباد میں گاڑی سات گھنٹے بعد ملتی تھی اس لئے بھائی ظہور احمد (مستر ٹیو احمد بیرسٹر) کو لکھ دیا کہ کھانا تمہارے ساتھ کھائیں گے، والدہ، بیوی اور بچوں کے لئے ایک گاڑی کا انتظام کر دینا کہ والد آباد دیکھ لیں، چٹا منی کو لکھ دیا کہ تم سے، پیر سے اور پنڈت (موتی لال)، جی سے بھی ملاقات ہو جائے گی، چٹنے سے ایک دن پہلے اطلاع ملی کہ جو سب انپکٹر ہمراہ جائے گا اسے ہدایت ملی ہے کہ ہماری پارٹی کا کوئی شخص کسی اسٹیشن کے باہر نہ جائے گا، گو ہمارے نام جو حکم آیا تھا اس میں یہ شرط نہ تھی ہم نے صاف کہہ دیا کہ گورنمنٹ نے ہم کو نظر بند کیا ہے مگر ہمارے متعلقین آزاد ہیں، ہم نے ارادہ کر لیا کہ خود والد آباد اسٹیشن پر رہیں گے، باہر نہ جائیں گے۔ ہم ۲۰ کو ۱ بجے صبح کو روانہ ہو کر سپر کو کوٹ دوار پہنچے، بجے شام کو ملی چلی، ۲ بجے نجیب آباد پہنچے، ۲ بجے صبح مراد آباد ۱ بجے روانہ ہوئے ہم کے قریب پہنچے، وہاں آنریبل سید رضا علی یعقوب (سر یعقوب) سعود و عبدالسلام وغیرہ تمام احباب ملے آئے، رامپور سے میری اہلیہ مع حمیدہ اور گلزار و زاہد کے آگئے تھے وہ شریک سفر ہوئے، ان کے علاوہ رامپور سے بہت احباب سے ملاقات | عزیز اور دوست آگئے تھے، من و سلوئی کوٹ دوار ہی پر آنا شروع ہو گیا تھا، مراد آباد پر اوز نازل ہوا بریلی پر علی گڑھ کے احباب سحر نصرت ہوئے، انصاری (ڈاکٹر انصاری)، رامپور سے مراد آباد آگئے تھے، ڈاکٹر عبدالرحمن دہلی، آگئے تھے، بریلی میں بھائی داؤد وغیرہ چائے

لکھنؤ | لے کر آئے تھے، لکھنؤ پہنچے تو گاڑی خلاف معمول پل کے اس طرف پیسٹ فام پر رکی، مگر اس کے رک جانے کے بعد بہت سے اجاباب مع تقدس آب مولانا عبدالباری صاحب قلعہ مولانا محمد ابراہیم صاحب، سیالکوٹی تشریف لائے قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا، کانپور سے علی گڑھ سے، بارہ بنکی سے اجاباب آئے تھے، راستے کے لئے کھانا، میوہ اور مٹھائیاں اس کثرت سے آئیں کہ دونوں درجے لبالب بھر گئے اور بیٹھے کو جگہ نہ رہی بلکہ مبالغہ تین چار سو آدمیوں کے لئے کھانے کا سامان کافی تھا مولانا عبدالباری صاحب قبلت متعدد اجاباب کے رائے بریلی تک تشریف لائے، ان بزرگوں کی تحسین ہر لمحہ ہم کو شرمسار کرتی تھی ناظر (اب ناظر یا جنگ)، وسیم (مسٹر وسیم بریٹر)، ولایت (ولایت علی بیوق)، کوہم (الہ آباد تک لے گئے، کہ، گھنٹے وہاں بھی خوب گزریں گے۔

سرپرست ملاقات | اتفاقاً راستہ میں ڈاکٹر سپرو سے ملاقات ہو گئی کیونکہ وہ ہم سفر تھے، اس طرح الہ آباد کی ”قدم بندی“ کا بھی صدمہ نہ ہوا، ٹھہرا اور لکھنؤ کے سید ٹھہرا احمد صاحب بھی ملے۔

الہ آباد کے اسٹیشن پر قدغن | آگے چل کر معلوم ہوا کہ الہ آباد سے اسٹیشن پر جاتے ہوئے پرندوں کے پر جلتے ہیں، پیسٹ فارم کٹ بند اور اسٹیشن خالی ہے اور غالباً ہم کو، گھنٹے قبل ہی وہاں سے کہیں اور لے جائیں، یہ بھی سنا کہ پولیس کے سوسو آدمی پیرہ مے سے ہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ الہ آباد کے لوگوں نے اسٹیشن پر نہیں گاڑوں پارٹی لینے کی اجازت چاہی تھی مگر اجازت نہ ملی مجبور ہو کر ٹھہرا کچھ میوہ اور کھانا اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کو دے آئے کہ اسے دیکھ بھال

اگر کوئی چیز خلاف قانون دستیاب نہ ہو تو ان نظر بندوں کو دینا، الہ آباد کے اسٹیشن کو سوائی پولیس کنکالی پایا، دو افسر طبقہ یورپین سے موجود تھے، دونوں شوکت کے شناسائی اور ایک تو دوست نکلے۔

پولیس افسر کی ناروا حرکت | تھوڑی دیر کے بعد ایک ذات شریف نہایت کردار کے ساتھ تشریف لائے اور پہلے اسٹیشن ماسٹر سے کہا کہ ان لوگوں کو اسٹیشن سے نکال دو یہ لوگ ڈاکٹر ناظر الدین جن، مسٹر محمد وسیم، مسٹر ظہور احمد بیرسٹران، سید ظہور احمد صاحب بی لے ویل تھے، میں ان کی سلامت ردی اور متانت کی تعریف کروں گا کہ باوجود سخت غصے اور مایوسی کے وہ خاموشی کے ساتھ چلے گئے، چلنے سے پیشتر والدہ نے انھیں گلے لگایا اور کہا کہ بیٹا ان باتوں سے آزرہ خاطر نہ ہونا، اس کے بعد وہ ذات شریف ہماری طرف تشریف لائے اور کہا کہ آپ اپنی گاڑی میں بیٹھ جائیں شوکت نے کہا کہ اس کی آخر کوئی وجہ؟ کہا میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ ایسا ہی کریں، ہم نے جواب دیا کہ ہم دیں تک پابند ہیں جہاں تک گورنمنٹ کے احکام موصول ہو چکے ہیں، ورنہ ہم بالکل آزاد ہیں، ہمیں یہاں سات گھنٹے قیام کرنا ہے، اس پر صاحب موصوف بولے کہ نہیں آپ کو ساڑھے پانچ بجے کی ایک گاڑی سے سٹنہ جانا پڑے گا اور وہاں چند گھنٹے ٹھہرنا کی گاڑی کا انتظار کرنا پڑے گا جو یہاں سے جلیپور تہرہ جاتی ہے، ہم نے کشمکش | کہا کہ ہمارے احکام میں یہ داخل نہیں ہے، ہمیں احکام ملے ہیں کہ تین بجے کی گاڑی میں الہ آباد پہنچیں اور شب کو دس کے تہرہ میں جلیپور جائیں، اس پر وہ بولے کہ نہیں گورنمنٹ نے احکام بدل دئے ہیں آپ کو ابھی جانا ہوگا۔

ہم نے کہا کہ ہمارے پاس کوئی احکام اس قسم کے موصول نہیں ہوئے ہیں جو حکم ہم کو ملا ہے اگر ہم اس کی خلاف ورزی کریں گے تو ہم تین برس کی قید با مشقت اور ایک ایک ہزار روپیہ کے جرمانہ کے مرتکب ہوں گے، اس پر فرمایا کہ میں آپ سے کہتا ہوں کہ یہی احکام گورنمنٹ کے ہیں میں نے عرض کیا کہ حضور والا کی شناسائی کا بھی ہم کو شرف حاصل نہیں ہے، پھر ہم تحریری اور ہر حکومت سے مزین احکام کی عوض محض آنجناب کی زبانی ہدایت کو کیوں قبول کر لیں، فرمایا اس سٹیشن کا چارج میرے پاس ہے، میں نے جواب دیا کہ میں آپ سے مل کر محفوظ ہوا مگر اس شرف نیاز مندی کے حصول کے بعد بھی ہم سرکاری احکام پر آپ کے ارشادات کو ترجیح نہیں دے سکتے۔

جھڑپ | اس پر تکیے بن سے فرمایا کہ کیوں بد مزگی پیدا کرتے ہو میں نے تم سے نہایت نرمی سے کہدیا کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ، میں نے جواب دیا کہ اس میں بد مزگی کا سوال کچھ بھی نہیں ہے اور میں نے اس قدر نرمی سے کہدیا کہ ہم گورنمنٹ کے احکام کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے، اس پر نہایت تند و ترش ہو کر فرمایا کہ کیوں اسی راگ کو الاپے جاتے ہو؟ اس پر شوکت نے آنکھیں دکھا کر کہدیا کہ بس اس لیے میں گفتگو نہ کیجئے، اس پر ذرا ہوش میں آئے اور پھر کہا کہ بد مزگی کیوں پیدا کرتے ہو میں تو نہایت نرمی سے کہتا ہوں کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ شوکت نے کہا کہ آپ کی درخواست معقول نہیں ہے میں بھی آپ سے نرمی سے کہتا ہوں کہ ہم سے تعرض نہ کیجئے اور یہاں سے چلے جائے، اس پر حکامانہ انداز سے فرمایا کہ تم مجھے مجبور کرتے ہو کہ میں اپنے احکام کی تعمیل بجا کر اپنا

شوکت نے کہا شوق سے آپ ضرور کوشش کریں مگر ساڑھے تین من کی لاش اور سوا چھ فٹ کے قد اور ڈیڑھ گز کے سینہ والے سے جبریہ تعیل احکام کرانا آسان نہیں، بولے کہ میں سمجھتا تھا کہ آپ جٹیلین ہیں، اس پر میں نے عرض کی کہ ہم سمجھتے تھے کہ آپ بھی جٹیلین ہیں مگر اس ”مگر“ کے اضافہ نے ان بزرگوار کو چکر ادیا، پھر کہنے لگے کہ اب میں جبریہ تعیل کراؤں گا شوکت نے کہا کہ ہم تو کہہ ہی رہے ہیں کہ شوق سے کوشش فرمائے، اس قدر گفتگو کے بعد دوسرا پولیس انسپکٹر آیا۔

دوسرے افسر پولیس کا دخل | اور اس نے کہا کہ اس مسئلہ کو آپ ہمیں پرچھوڑ دیجئے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر (وہ حضرت) جدھر سے تشریف لائے تھے واپس تشریف لے گئے، ہم سے پولیس انسپکٹر نے کہا کہ کچھ مضائقہ ہے اگر آپ انھیں کاہنا مانیں، یہ بھی شوکت کا شناسائی تھا، شوکت نے جو جواب پہلے دیا تھا، وہی اس کو بھی دیا کہ یہ معاملہ نج کے تعلقات کا نہیں، سرکاری احکام کا ہے اس کے بعد ہم ویٹنگ روم گئے اور وضو کر کے ظہر اور بعد ازاں عصر پڑھی، نماز سے فارغ ہوئے تو اطلاع ملی کہ شوکت کے پرانے دست اور میرے بھی گہرے شناسا مشرفینٹل کلکٹر الہ آباد ملنا چاہتے ہیں، ہم گئے تو ہم سے کہا یہ کیا جھگڑا ہے، شوکت نے تمام کیفیت سنائی اس پر کہا کہ مجھے دو تین دن سے معلوم تھا کہ تمہارے سفر کا پروگرام بدلا جائے گا میں چلتے وقت برن چیف سکرٹری سے پوچھ آیا ہوں وہ کہتے ہیں کہ آپ لوگوں کو ساڑھے پانچ ہی بجے چلنا ہوگا، شوکت نے کہا قاعدہ کی رو سے چیف

سکرٹری کا حکم ملنا چاہئے لیکن چونکہ میں تم سے واقف ہوں تاہم اسے تحریر
کر دو تاکہ ”سند ہو اور وقت ضرورت کام آئے“ حکم پانے پر ہم نے والدہ
اور بچوں کو اطلاع کرا دی کہ گاڑی ابھی جائے گی۔

روانگی | دروازہ ہو کر رات کو بارہ بجے ہم سنہ پنچے گاڑی وہیں تک جاتی تھی
دس بجے والی گاڑی الہ آباد سے آئی تو ہم پھر دروازہ ہوئے اور صبح کو جلیپور
پہنچے اور شب کو یہاں (چھنڈواڑہ) پہنچے۔

باب

چھند واڑہ کے ایام اسیری

چھند واڑہ کی نظربندی کے بعد علی برادران صبر و شکر کے ساتھ چھند واڑہ ہی میں رہتے تھے اور وہاں رہ کر ملک و قوم کی خدمت کر سکتے تھے، اس میں منہمک رہے۔

تعمیر مسجد | اپنی اسیری ہی کے ایام میں علی برادران نے اپنا ایک اور کا زمانہ ظاہر کیا، یعنی تعمیر مسجد وہاں اگرچہ مسلمانوں کی تعداد بھی خاصی تھی، لیکن مذہبی عبادت گاہوں کی طرف عام لوگوں کو زیادہ خیال نہیں تھا، ان بھائیوں نے ان میں مذہبی روح پیدا کی اور ایک مسجد کی بنا ڈلوائی کہ وہاں مسلمان سر بسجود ہو کر آستانہ الہی پر اپنی عبودیت فنادگی کا اظہار کریں، اس زمانہ میں اس مسجد میں ایک خاصی چل پھل تھی۔

رہائی کی کوششیں | مسلمانان ہند اپنے ان محبوب رہنماؤں کی اسیری پر حد درجہ مضطرب تھے اور جو امکان کی کوششیں وہ کر سکتے تھے انھوں نے کیں ستر منظر ہمتی اور ستر جناب نے امیر مل کوئل میں جو سوالات کئے اور ان کے جو جوابات دے گئے وہ آپ کی نظر سے گزر چکے ہیں۔

ہمارا جہ محمود آباد کی کوششیں | اس سلسلہ میں راجہ (پھر ہمارا جہ) صاحب محمود آباد کی کوششیں بھی فراموش نہیں کیا سکتیں انھوں نے اپنے رسوخ و اثر سے فائدہ اٹھا کر ان مجاہدین راہ حق کی رہائی کی بہت کوششیں کیں اور نفس نفیس چھند واڑہ گئے اور ان مسائل کا حل کرنا چاہا، مگر بعد کو معلوم ہوا کہ خلاف توقع ان کی کوششیں بھی بے سود ہیں۔

مسلم لیگ کی صدارت | ستمبر ۱۹۴۷ء میں نظربندی کے تقریباً ڈھائی سال کے بعد، محمد علی

کو مسلمان ہند نے اپنی غیر معمولی محبت اور قدر دانی کے ثبوت میں آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کا اعزاز بخشا جو اس زمانہ میں مسلمانوں کی واحد سیاسی انجمن تھی لیکن نہ آپ کو شریک جلسہ ہونے کی اجازت ملی، اور نہ اس کی کارروائی میں اشارۃً و کنایۃً کسی طرح حصہ لینے کی، اسی مسلم لیگ کی صدارت کے متعلق فرمایا تھا۔

یہ صدر نشینی ہو مبارک تھیں جو سترہ لیکن صلہ روز جزا اور ہی کچھ ہے جب گورنمنٹ کے استبداد نے آپ کو اس کا موقعہ نہیں دیا کہ آپ اس میں شریک ہو سکیں تو آپ کے بجائے بی اماں مرحومہ اجلاس میں شریک ہوئیں اور کرسی صدارت پر محمد علی کی تصویر آویزاں کر دی گئی، کیا رنج پرور منظر ہو گا!

بی اماں نے لیگ کے اجلاس میں اپنا ”پیغام عمل“ پڑھا، دہلی کے ایک صاحب کے بیان کے مطابق :

”جس کا ایک ایک لفظ تیر و فتر کا کام ہے رہا تھا اور جس نے اجلاس لیگ کو جلسہ ماتم بنا دیا“

مشرک کا رزلویشن | اس سال کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کے مشہور قائد سیاسی مشرک نے ایک رزلویشن کانگریس میں پیش کیا جس میں علی برادران کی فوری رہائی پر گورنمنٹ ہند کی غمان توجہ بند دل کرانے کی سعی ناکام کی گئی اور بے اثر رہی۔

مشرک ٹیگور ہندوستان میں | اسی زمانہ میں وزیر ہند مشرک ٹیگور تشریف لائے، ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے ان سے ملاقاتیں کیں، گاندھی جی، مسز سنبٹ، مشرک خلیج، پنڈت لالو، مشرک چٹامنی، امام صاحب جامع مسجد، بیگم صاحبہ بھوبال، راجہ صاحب محمود آباد، سبھی ان سے ملے، اصلاحات ہند پر مشرک ٹیگور نے سب سے نہایت تفصیل سے تبادلہ خیالات کیا، ہر شخص کے خیالات

معلوم کئے اور ہر شخص کو اپنا نقطہ نظر سمجھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسٹر مانٹیکو فطرۃ معقول آدمی تھے، وہ ہر شخص کا دکھ و رونا چاہتے تھے، آزاد خیال اتنے تھے کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ کانگریس کے اجلاس میں بھی شریک ہوتے، مگر حکومت ہند کی مصلحت پروریوں نے اس کی اجازت ”نہ دی۔“

محمد علی نے بھی خواہش کی کہ وہ مسٹر مانٹیکو سے ملنا چاہتے ہیں اور ہندوستان و مسلمانان ہند کے جذبات و احساسات کی ترجائی کرنا چاہتے ہیں، حکومت ہند نے اس درخواست کا کوئی معقول جواب نہیں دیا اور ملاقات کی اجازت بھی نہیں دی۔

مسلمانوں کا وفد | ہندوستان میں کچھ رسم سی پڑ گئی ہے کہ حکومت کا جب کوئی ذمہ دار افسر آتا ہے تو اسے ایک پارٹی ضرور دی جاتی ہے، اس کی خدمت میں ایک پاس نامہ ضرور پیش کیا جاتا ہے اور ایک وفد بھی کسی نہ کسی طرح حاضر یا رگاہ ہمایونی ہونے کا شرف ضرور حاصل کرتا ہے۔

چنانچہ مسلمانوں کا ایک متفقہ وفد قرار پایا کہ نواب محمد اسحاق خاں کی سرکردگی میں مسٹر مانٹیکو سے ملاقات کرے۔

وفد نے اپنے ایڈریس میں مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجائی کرتے ہوئے علی برادران کی رہائی کا مسئلہ بھی پیش کیا، وفد جب مسٹر مانٹیکو سے ملنے دہلی آیا تو اسے اطلاع دی گئی کہ مناسب اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ علی برادران کا ذکر وفد کے ایڈریس سے خارج کر دیا جائے۔

وفد کی طرف سے جواب دیا گیا کہ چونکہ یہ وفد ذاتی طور پر شرف باریابی نہیں حاصل کر رہا ہے بلکہ مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے اس اعزاز کے حاصل کرنے کا متمنی ہے، اس

لے اپنی طرف سے نوہ کچھ اضافہ کر سکتا ہے، اور نہ کچھ کم کر سکتا ہے۔
یہ جواب حکومت کے لئے تشفی بخش نہیں ثابت ہوا اس لئے وفد کو پیش گاہ علیؒ میں تشریف
حاضری سے محروم رکھا گیا۔

عہد نامہ کی کوشش | ستمبر ۱۹۷۱ء کو مسٹر عبدالحمید شہو زئیہ کے پرنسڈنٹ کو ملک کے
ایک ٹیشن سے متاثر ہو کر چھند واڑہ بھیجا گیا اور وہ سرچارلس کلونینڈ کی طرف سے ایک عہد نامہ لائے
کہ جس پر دستخط کرنے سے ان زندانیوں کو رہائی مل سکتی تھی۔

عہد نامہ کا مفاد یہ تھا کہ دوران جنگ میں علی برادران کو فی ایسی حرکت نہیں کریں گے
جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ گورنمنٹ کے دشمنوں کو کسی قسم کی اخلاقی یا عملی مدد پہنچ سکے، اور
ہر طرح پر امن رہیں گے، نہ کوئی ایسی بات کریں گے جس سے ملک معظم کے دشمنوں کی حوصلہ افزائی
ہو، ان کی طرف سے جواب دیا گیا کہ ہم یہ سب کچھ اس وقت کرنے کے لئے تیار ہیں جب کہ ہمارے
مذہبی مفاد سے آپ کا مفاد تصادم نہ ہو رہا ہو، اور اگر ایسی صورت ہوئی تو پھر ہم نہ کوئی وعدہ
کر سکتے ہیں اور نہ کسی قسم کی پابندی قبول کر سکتے ہیں۔

سرچارلس سے محمد علی کے تعلقات | اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رہائی کا مسئلہ پھر تعویق میں آگیا اور
ملک میں جو ایک خوشی کی ہر دوڑ رہی تھی وہ پھر افسردگی میں تبدیل ہو گئی۔

اس تعویق کی سب سے بڑی وجہ سرچارلس کا وجود باوجود تھا، سرچارلس محمد علی سے کیوں
خار کھائے بیٹھے تھے، اس پر مسٹر گھاٹے دلی برادران کے مشیر قانونی کے اس خط کے اس
جلد سے روشنی پڑتی ہے جو انھوں نے مسزینٹ کو لکھا تھا۔

مسٹر گھاٹے کا خط مسزینٹ کے نام | ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب مسٹر محمد علی مع سید وزین
کے انگلستان میں تھے تو وہاں ان سے کہا گیا تھا کہ وہ اس جماعت میں شریک ہوں

جس کا نام اب ”انڈو برٹش ایسوسی ایشن“ ہے اور حکومت ہند کے اینگلو
اتھین عمال کے ساتھ لارڈ ہارڈنگ اور سر علی امام کے مقابلہ میں کارروائی
کریں تاکہ سلسلہ کے دربار میں جو انتظامی تبدیلیاں کی گئی تھیں وہ پھر لوٹ
دی جائیں، یہ افسر علی سرچارلس کلونینڈ ڈائرکٹر جنرل سی آئی ڈی تھے
اور یہ واقعہ قابل غور ہے کہ اس سازش میں شریک ہونے سے انکار کر دینے
کے بعد سٹر محمد علی نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ سرچارلس کا طرز عمل بالکل
بدل گیا۔“

سرکاری کمیشن | پھر ستمبر سلسلہ میں ایک سرکاری ٹریبونل مقرر کیا گیا جس کے حلقہ
تحقیقات میں یہ بات داخل تھی کہ وہ علی برادران کی نظر بندی کے صواب و عدم صواب
پر غور کر کے ایک رپورٹ پیش کرے۔

کمیشن کے ایک رکن سر عبدالرؤف پنجاب ہائی کورٹ کے جج بھی تھے، ان بزرگ
سے علی گڑھ کے سلسلہ میں ایک مدت سے شک چلی آرہی تھی، ہار دسمبر کو یہ تحقیقاتی کمیٹی
چھنڈو وارہ پہنچی اور اس نے علی برادران کی فردا فردا شہادت لی۔

علی برادران کے بیانات | علی برادران نے اپنے بیانات میں گورنمنٹ کے ظلم و جبر کو
دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کیا، اپنے مذہبی فرائض تباہی اور کمیشن کو یہ بات سمجھانے
کی کوشش کی کہ مذہبی معاملات میں گورنمنٹ سے ان کی وفاداری بالکل مشروط ہے اگر
اس نے مذہبی معاملات و مقامات پر دست اندازی کی پالیسی ترک کر دی تو ہم اس کے
وفادار ہیں اور اگر وہ اپنی روش پر ثابت قدم رہی تو ہم سے بڑھ کر اس کا دشمن کوئی نہیں
اور اپنی اس مشروط وفاداری کو مکمل و کٹوریہ کے تاریخی اعلان سے مل لیا اور اپنے

تین پوسے طور سے حق بجانب ثابت کیا اور گورنمنٹ کے ناروا فعل پُر لائل کی روشنی میں اظہار تعجب کیا۔

اور چونکہ اپنے نقطہ نظر سے وہ اپنی بے گناہی اور گورنمنٹ کی دراز دستی کو ثابت کر چکے تھے اس لئے انھوں نے گورنمنٹ سے اپنے اس نقصان کی تلافی بھی طلب کی جو اس نا واجب اور ناجائز نظربندی کے سلسلہ میں ان کی تجارت اور ان کے اخبار پر پڑا تھا۔ کمیشن کی سفارشات | کمیشن نے اپنی ”تحقیق انیق“ کی بنا پر نظربندی تو باطل جائز ٹھہرائی اور نقصانات کا جو معاوضہ طلب کیا گیا تھا اسے بھی باطل ٹھہرایا لیکن ازراہ معدلت گسٹری و مرہم خسروانہ ان بلبان اسیر کی رہائی کی بیکسٹیشن قلم سفارش“ کر دی۔

گورنمنٹ بھلا اتنی ”مدلل سفارش“ کو کیونکر منظور کر سکتی تھی، کہ اس کا فعل حق بجانب قرار دیا گیا ہو، ملزمین مجرمین کی صورت میں تسلیم کر لئے گئے ہوں اور ان کا مطالبہ وادان باطل ٹھہرایا گیا ہو پھر اسے کیا پڑی تھی کہ اس سفارش کو وہ قبول کرتی۔ چنانچہ یہ سفارشاتیں شرف قبولیت نہ حاصل کر سکیں اور علی برادران بدستور چھند واڑہ میں نظر بند و قدم بند رہے۔

منربنت کی رہائی | نومبر سنہ ۱۹۱۷ء میں منربنت ہندوستان کے سخت احتجاج کے بعد رہا کی گئیں، ان کی رہائی سے امید بندھی تھی کہ شاید علی برادران بھی رہا کئے جائیں، مگر یہ امید غلط ثابت ہوئی اور علی برادران رہا نہیں کئے گئے۔

منربنت کی کوششیں | منربنت کی کوششوں کی وادہ دینا سخت بے انصافی ہوگی، انھوں نے رہا ہوتے ہی علی برادران کی رہائی کی سخت کوششیں کیں اور ہر طریقہ سے گورنمنٹ کو متاثر کرنا چاہا اور اسے سمجھانا چاہا کہ علی برادران کی نظربندی نہیں بلکہ رہائی عین مصلحت ہے مگر گورنمنٹ کے کان پر جوں بھی نہیں رہی۔

منزہ بنت کی دلائل سے ملاقات | چنانچہ انہی کو شششوں کو تمام تک پہنچانے کیلئے منزہ بنت نے دلائل سے ملاقات کی اور دلائل سے مل کر اس مسئلہ پر مفصل تبادلہ خیالات کیا اور علی برادران کی نظربندی کے مقاصد اور رہائی کے سیاسی فوائد گورنمنٹ کے گوش گزار کر دیے مگر نتیجہ اس کا بھی ناکامی تھا، چنانچہ دلائل سے ہاؤس سے واپس آ کر انھوں نے جو بیان دیا اس کا ایک حصہ یہ ہے:

منزہ بنت کا بیان | ”میں ٹی بی میں ہر کیلنسی دلائل سے ملاقات کر کے ابھی آئی ہوں۔ ہر کیلنسی دلائل نے میرے تمام پیش کردہ دلائل کو بغور سنا اور بہت صاف باتیں کرتے ہوئے، دلائل اور ان کی کونسل شوکت علی محمد علی صاحبان کی نظربندی کے معاملہ پر غور اور مزید غور کر چکے ہیں اور مجھے ایک ایسے شخص نے جو گورنمنٹ کا مقصد ہے باطلاع دی ہے کہ گورنمنٹ نے بالاتفاق یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ مذکورہ بالا نظربندی کو رہا نہ کیا جائے۔“

اسباب | لیکن وہ کون اسباب تھے کہ منزہ بنت تو صرف یمن زمینہ کی دلچسپ نظربندی کے بعد رہا ہو گئیں، اور علی برادران تین ساڑھے تین سال کی نظربندی کے بعد بھی رہا نہ کئے گئے، آخر اس کے اسباب کیا ہیں، یہ سوال جتنا دلچسپ ہے اس کا جواب اس سے کہیں زیادہ عجیب و غریب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ گورنمنٹ علی برادران سے خائف تھی اس لئے انھیں نظربند کرنا تو یمن مقتضائے وقت و مصلحت سمجھا گیا، لیکن اسباب نظربندی خود اس کے ذہن میں بھی پوری طور سے نہیں تھے اس لئے جب کبھی بھی اس سے ان کی نظربندی کے متعلق استفسار کیا گیا تو وہ ہمیشہ بے سرو پا جوابات دیتی رہی، کبھی انھیں ایک سازش کا مجرم سمجھا گیا جس میں امیر فغان

کو حملہ کی دعوت دی گئی تھی۔

اور کبھی یہ کہا گیا کہ ایک فوجی افسر کو باغیانہ خط لکھا تھا اس لئے معتبہ سرکار ہیں اور کبھی یہ الزام تراشا گیا کہ وہ ملک معظم کے دشمنوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں اس لئے ان کی نظربندی مصلحت وقت ہے، اور کبھی گھبراہٹ کے یہ کہہ دیا کہ انھوں نے پیش کردہ عہد نامہ پر دستخط کیوں نہیں کئے غرض جس وقت جو بات زبان پر آگئی وہ کہہ دی گئی، کسی غور و فکر کی نہ ضرورت تھی نہ پرواہ۔

پروفیسر الیاس برنی کا خط ۱ ایام نظربندی میں محمد علی کے اجاب کیا گزرتی تھی، اس کا اندازہ ذیل کے دو خطوں سے ہوگا، پروفیسر الیاس برنی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”پیائے بھائی۔“

اس وقت صبح کے چار بجے ہیں کہ میانگلی کے عالم میں یہ خط لکھ رہا ہوں، کل جیتا سے آپ کی تازہ ترین غزل ملی اور نہیں کہہ سکتا کہ اس کو پڑھ کر دل کی کیا حالت ہوئی جاتی ہے، رات اسی کو گنگنائے گنگنائے سویا اور اتنے سویرے جو آنکھ کھلی تو دل نے پھر وہی رنگ جایا، جوں جوں پڑھتا ہوں، خوشی سے، یا بے نیج سے، نہ معلوم کیا کہوں گرم گرم آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔

تمہے بعد تھا کہ بھلا دو اگر چہ ہم اک عمر ہو گئی کہ ہوئے انجنین سودور یہ شعر دل پر نشتر کا کام کر گئی؟ اور بیتاب ہو کر یہ خط لکھنا شروع کیا یہ کیسے ممکن ہے کہ قوم تم دونوں بھائیوں کو بھلا دے، دل دل میں تمہاری یاد ہو، لب لب پر تمہارے واسطے دعا ہو، مگر گھر تمہارا چرچا ہے جس نے تمہارا نام بھی سنا ہے تم پر زلفیہ ہے، خاموشی ہے تو اس کے اسباب کچھ اور ہیں، خاموشی نہیں۔

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے بکلتے کیلئے تو ذرا چھیر توڑے تشنہ سحراب ہر ساز

خدا تم دونوں فدائیان ملت اور شیران وطن کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔
متوب عبدالحق | دوسرا خط مولوی عبدالحق صاحب پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی و سکریٹری انجمن
 ترقی اردو کا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں۔

”میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں اور خدا کا شکر کرتا ہوں کہ تم اپنی بات اور روش
 پر ثابت قدم رہے، تم بلاشبہ اس مدرسہ ہند میں بہت ہونہار طالب علم ہو۔
 اہل نیش کو ہر طوفان حوادث مکتبِ نقطہ موج کم از سبلی استاد نہیں
 ان خطوط سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی اور علی برادران کے شناساؤں
 کی کیا حالت ہو رہی تھی مگر یہ دونوں کوہ وقار و اعیان حیثیت و آزادی بدستور، اسی شہادت،
 اسی استقامت اور اسی قابل رشک صبر و سکون کے ساتھ جو انھیں کا حصہ تھی ان تمام مصائب
 کو نہی خوشی، چہرہ پر شکن لائے بغیر برداشت کرتے رہے۔
 نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت ہے
 (ذوق)

چند واڑہ سے ”راہائی“ | کئی سال تک چند واڑہ کی آب و ہوا میں زندگی بسر کرنے کے
 بعد چند واڑہ بھی چھٹا اور ایک دوسرا قفس ان کے لئے تیار کیا گیا۔
 واقعہ یوں ہے کہ چند واڑہ کی مسجد انھیں دونوں بھائیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھی وہاں
 تراویح اور نمازیہ لوگ پڑھا کرتے تھے۔

تفسیر | ایک روز جمعہ کو جمعہ کی نماز کے بعد محمد علی نے ایک نہایت زبردست تقریر کی اور
 مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، تقریر حسب معمول درد و اثر اور روح مذہب سے
 بھری تھی، حاضرین پر اس کا خاصہ اثر ہوا۔ گورنمنٹ جیلا اس قسم کی جرات کی بہت افزائی کی

کر سکتی تھی، لہذا اس نے چند وارہ سے منتقل کر کے انہیں بنیول جیل پہنچا دیا، یہاں سے نظر بندی کے بجائے جیل کی زندگی شروع ہوتی ہے اور جو تھوڑی بہت آزادی برائے نام باقی تھی وہ بھی ”مذکر خاطر صیاد“ ہو گئی۔

باب ۱۲

چھند واڑہ سے بیتول

تقریر کے بعد علی برادران کی نظر بندی بھی خطرناک سمجھی گئی اور مناسب یہ سمجھا گیا کہ ان دونوں کو اب جیل خانہ بھیج دیا جائے، چنانچہ گرفتاری علی میں آئی اور قوم و ملت کے یہ دونوں سردار اسیر زندان کر دے گئے۔

شوکت کی ڈائری | بڑھتی سے ہیں بیتول جیل کی زندگی اور چھند واڑہ سے روانگی کے متعلق کچھ بھی معلومات حاصل نہیں ہیں، اس وقت تک علی برادران پر جو کچھ تحریری مواد موجود ہے اس میں بھی کچھ نہیں ملتا، صرف اتنا ملتا ہے کہ وہ چھند واڑہ سے بیتول میں قید کر دے گئے! لیکن یہ کارروائی کیونکر وقوع پذیر ہوئی، اس کے متعلق سب خاموش ہیں، اتفاقاً محمد علی کے کاغذات کے انبار میں ہیں مولانا شوکت علی کی ڈائری مل گئی جس سے یہ مسئلہ بہت خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہو گیا۔

شوکت صاحب کی یہ ڈائری بہت نامکمل ہے، یعنی صرف چند ہی روز انھوں نے ڈائری لکھی اور اس کے بعد یہ مفید کارآمد اور آئندہ نسلوں کا سامان اشتیاق انھوں نے خود بند کر دیا۔ لیکن بہر حال یہیں اپنے عنوان کے متعلق اس سے بہت کافی معلومات حاصل ہوئیں اب ہم اس کے ضروری اقتباسات پیش کرتے ہیں جن کا نفس عنوان سے تعلق ہے۔
مولانا فرماتے ہیں:

گرفتاری | (چھند واڑہ میں) حسب معمول ہم قریب گیارہ بجے سو گئے تھے اور

۲ یا ۳ بجے سحری کو اٹھی اس دن اتفاق سے اندر والدہ اور محمد علی کے بچوں کے ساتھ سحری کھانے بھی نہیں گیا بلکہ پلنگ پر بیٹھ کر ایک ڈسٹ میں دو دھکنوخم کر سگیا، تقریباً ۴ بجے اپنے بنگلہ کے احاطہ کے چھوٹے دروازہ کی طرف سے بہت پانوں کی آہٹ سنی، چونکہ میں بہت چونکا سونے والا ہوں، فوراً اکھل گئی اور میں نے بہت سے آدمیوں کو آتے ہوئے دیکھ کر انگریزی میں دریافت کیا کون ہیں؟ اس پر انگریز نے جوڑ پٹی کسٹر ملوڈن تھا جواب دیا ”کیا آپ ہیں مسٹر شکوت علی؟“ میں نے فوراً جواب دیا کیونکہ میں اول ہی جان گیا تھا کہ یہ جم غفیر ہماری عزت افزائی کے لئے آیا ہے ”جی ہاں! آئے!“ اس پر ایک دوسرے انگریز نے جو مسٹر رائٹ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس تھا کہا کہ ”ہم آپ کو لینے آئے ہیں“ میں نے جواب دیا آئے میں چلنے کو تیار ہوں، اس عرصہ میں پانچ یا چھ انگریزوں نے اور بہت سے سپاہیوں نے میرے پلنگ کو گھیر لیا، میں صرف بنیان اور باجاسہ پہنے تھا، رائٹ میرے قریب آیا اور مجھ سے کہا کہ ہم آپ کے ساتھ بہت اخلاق سے پیش آئیں گے اگر آپ ہیں، کسی قسم کی تکلیف نہ دیجئے گا، میں نے کہا ”تکلیف؟ ہی کیسی، چلئے، میں تیار ہوں، میں اس وقت پلنگ کے پاس کھڑا ہو گیا تھا چاروں طرف آدمی! اس قدر اہتمام مذاق انگیز تھا۔

تلاشی | رائٹ نے ذرا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے میرے جسم پر ہاتھ پھیرا کہ کوئی توپ یا شین گن بنیان میں نہ ہو، اس کے بعد ہوڈن نے دریافت کیا مسٹر محمد علی کہاں ہیں، میں نے کہا اندر سوتے ہیں میں بلاتا ہوں، میں نے

زادہ کو آواز دی، جس پر وہ اور بندن خاں اور اختر علی آگئے، زادہ نے محمد علی کو باہر سے آواز دی، کئی آوازوں کے بعد وہ بچکے تو ویسے ہی بنیان اور پاجامہ پہنے کرہ کا دروازہ کھول کر باہر آنے لگے تو ان کے ہاتھ میں کسی انگریز نے ہاتھ ڈال دیا، ان کو یہ اطلاع نہ تھی کہ باہر حضرات ہم کو لینے آئے ہیں غالباً وہ شخص چھنڈاڑ کا اسٹنٹ پیرٹنڈنٹ پولیس بیک تھا، محمد علی کو یہ حرکت بری معلوم ہوئی اور انھوں نے چاہا کہ اندر جا کر کرپہن آئیں مگر اس کی اجازت نہ ملی، غالباً یہ خطرہ تھا کہ محمد علی کوئی نوا بجا کردہ آلہ نہ لے آئیں ان سے پلوڈن نے کہا کہ ہم آپ کو لینے آئے ہیں انھوں نے کہا کہ میں تیار ہوں، مگر میں غسل کرنا چاہتا ہوں جس کی اجازت نہ ملی، اس عرصہ میں ہمارے نوکر وغیرہ بھی آگئے، مسٹرانٹ نے جو اس جگہ کرنے والی فوج کے کمانیر تھے اور بہت غرغش کر رہے تھے، کہنے لگے کہ ہم آپ کو پانچ منٹ دیتے ہیں کہ آپ تیار ہو جائیں ہیں نے سوٹ اور قمیص تنگو کر پہنا، میرے کپڑوں کو بھی میاں رائٹ نے ٹٹولا مگر ذرا شرماتے ہوئے محمد کوٹ بھی نہ پہننے پائے تھے کہ ان کے ہاتھ میں ہاتھ فٹے کرے چلے۔

ہرباوری | اس عرصہ میں برقع پہنکر والدہ صاحبہ تشریف لائیں، انھوں نے فرمایا میں بھی ضرور چلوں گی، اس پر پلوڈن نے جواب دیا ہم کو نقطہ ان دو صاحبوں کے لیجاے کا حکم ہے۔ محمد علی نے وارنٹ دیکھنے کی درخواست کی، اس عرصہ میں چار پانچ موٹریں ہمارے بنگلہ کے سامنے آئیں ہم لوگ ان کی طرف چلے والدہ صاحبہ ہمراہ تھیں اور چلنے پر مصر۔

پولیس افسر کی گفتگو | رائٹ نے کسی سے کہا ”ذرا ان بڑی بی بی کو کوئی روکے، ہم نے

پسند نہیں کیا کہ ان کے ساتھ کسی قسم کی گستاخی یا بدینیزی کی جائے، وہ برابر ہمراہ چلنے پر اڑی ہوئی تھیں اور باوجود اندھیرے اور کبرسنی کے تیز تیز قدم رکھ کر سب کے ساتھ موٹر تک آئیں مگر ہم نے ان کو خدا اور رسول کا واسطہ دیا کہ آپ نہ آئیں، بعد ازاں تمام وہ خاموش ہوئیں۔

استقامت کا ثبوت | محمد حسین غریب مجھ سے گئے طے وقت رٹنے لگا، اس غریب کے رٹنے کو دیکھ کر مجھ سے ضبط نہیں ہوا، میں نے ایک زور کا چانٹا سید کیا۔ اور چلا کر کہا، خبردار! کافر کے سامنے ایک آنسو نہ نکلے وہ بڑا بہادر اور وفادار ملازم ہو، فوراً سنبل گیا، اقبال ہمارے ہی لئے حکم دے چکا ہے۔

یہ رسم بزم فنا ہے دل گناہ جو جنبش نظر بھی رہے گی کیا ابرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا
روانگی کے وقت تاثرات | خدا کا شکر ہے ہمارے اور لغزہ اور متعلقین میں ہر کسی نے کمزوری کا اظہار نہیں کیا، سب کے چہروں پر غصہ اور حقارت کے آثار تھے، ہم کو خوشی ہو اور غم ہے کہ ہم نے نہ تو والدہ صاحبہ اور نہ زاہد اور صادق یا کسی اور عزیز سے اس وقت اظہار محبت کیا۔

روانگی | ہم سب روانہ ہوئے، اس وقت کا سرور اور لطف یا تو خدا جانتا ہے یا ہمارا دل، ہم نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دنیوی لطف اٹھائے، مگر خدا جانتا ہے کہ اس ”روحانی عیاشی“ میں جو لطف ملا، اس کا عشر عشر بھی پہلے نصیب نہ ہوا تھا۔

اس ہنگامہ کے بعد یہ دونوں بیتول جیل میں نظر بند نہیں بلکہ بند کر دئے گئے۔

باب ۱۳

بیتول سے امرتسر

رہائی | بالآخر ۳۰ مئی ۱۹۱۵ء کی گرفتاری اور نظربندی کے بعد دسمبر ۱۹۱۵ء میں کم دیش پانچ سال کے بعد دفعتاً حیرت انگیز طریقہ پر ان بلبان اسیر کو قید خانے سے آزاد کیا گیا اور پانچ سال کے طویل اور صبر آزما عہدِ ناسعود کو بعد پھر وہ مبارک زمانہ آیا کہ عندلیب خوش لجن پھر شاخِ چمن پر زمرہ آرا ہو۔

حوریاں قص کنساں ساغرستانہ زدند

رہائی کیوں ہوئی؟ | اپریل ۱۹۱۵ء میں جب گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف اپنی ستیگرہ کا آغاز کیا ہے تو تمام ملک برطانیہ کے دستِ تظاول کا شکار ہوا کوئی بڑا شہر ایسا شاید ہی ہو جس میں گولیاں نہ چلی ہوں، اور نہایت بے دردی کے ساتھ غریب ہندوستانیوں کو ظلم و جور کا نمونہ پیش نہ بنایا گیا ہو۔

حادثہ جلیان والہ باغ | اسی زمانہ میں جلیان والہ باغ کا افسوسناک اور ناقابلِ فراموش واقعہ فاجعہ پیش آیا تھا جس نے سارے ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف غم و غصہ کے جذبات برپا کر دیے تھے، ہندوستان میں کیفیت بڑھ رہی تھی کہ گورنمنٹ نے غالباً اس صورتِ حال کا عضوِ عمومی | مقابلہ مناسب نہ سمجھ کر دسمبر ۱۹۱۵ء میں ایک مدبرانہ اعلان کیا اور تقریباً تمام سیاسی قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ ان رہائی یافتگان میں ہندوستان کے محبوب اور قابلِ فخر رہنما علی برادران بھی تھے جن کا وطن ثانی جیل خانہ ہو چکا تھا۔

امرتسر | امرتسر میں جہاں جلیان والہ باغ کا حادثہ پیش آیا تھا، کانگریس کا سالانہ جلسہ اسی زمانہ میں ہو رہا تھا، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے اجلاس بھی وہیں ہوئے تھے۔
کانگریس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو اور مسلم لیگ کے صدر حکیم جہاں محوم تھے۔
لہذا علی برادران رہا ہونے ہی سیدھے امرتسر پہنچے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس میں شریک ہوں۔

عظیم نظیر استقبال | ایک صاحب نے ”حالات علی برادران“ نامی ایک مختصر سارے علی برادران کی نظربندی کے بعد لکھا تھا، وہ امرتسر کے استقبال کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔
”آپ ۲۴ دسمبر کو امرتسر پہنچے، راستہ میں جس اسٹیشن پر دونوں بھائیوں کا گزر ہوا ہندو مسلمانوں نے پرجوش خیر مقدم کیا امرتسر کے اسٹیشن پر جس وقت دونوں بھائیوں کی گاڑی پہنچی تو قومی نعروں سے ہزار ہا ہندو مسلمانوں نے استقبال کیا، اسٹیشن سے جلوس مرتب ہو کر سیدھا آل انڈیائی کانگریس کے پنڈال کی جانب روانہ ہوا جس خلوص اور شوق سے اہل امرتسر نے ان دونوں بھائیوں کا خیر مقدم کیا وہ امرتسر کی حیات قومی میں آپ سے لکھنے کے قابل ہے۔“

کانگریس میں استقبال | کانگریس کے پنڈال کے دروازہ پر مہاتما گاندھی، پنڈت مدن موہن مالوی اور دیگر رہنمایان ہند نے استقبال کیا۔

اس وقت کا منظر | کانگریس کے پنڈال میں قدم رکھتے ہی تمام ہندو مسلمان تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے اور اس زور شور سے سلسل چیر ز بلند ہوئے تھے کہ پنڈت منٹ مک کا ردائی ملتوی رہی۔

پنڈت موتی لال کا حاضرین کی تعارف | پنڈت موتی لال نہرو پریسیڈنٹ کانگریس نے

حاضرین سے ان دونوں بھائیوں کا تعارف کراتے ہوئے ان کی قومی خدمات کا تذکرہ کیا۔

مالومی جی کا ڈیلی گیٹ بنانا | پنڈت مدن موہن مالوی نے ان دونوں بھائیوں کو کانگریس کا، ڈیلی گیٹ بنایا۔“

یہاں شرکت کے بعد علی برادران مسلم لیگ کے اجلاس میں گئے، وہاں بھی اسی جوثر و خروش اور اشتیاق و بھینپی کے ساتھ ان کا استقبال ہوا۔

کانگریس میں تقریر | کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے محمد علی نے کہا:

”میں کہتا ہوں اس آزادی کے لئے مسٹر ملک کو بھڑیل چلا جانا چاہئے، مجھے دوبارہ اپنی عمر بھر کے لئے نظر بند ہونا چاہئے، مسز بینٹ کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہئے، مگر اس قسم کے مظالم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جانا چاہئے، جیسے کہ پنجاب میں ہوئے۔“

باب

دہلی

دہلی کا استقبال | پنجاب کے سیاسی اجتماعات میں شریک ہونے کے بعد علی برادران نے دہلی کا قصد کیا، یہی ان لوگوں کا ”دار السلطنت“ تھا، اس لیے یہاں ان کا شاہانہ استقبال ہوا جس کی تفصیل ”حالات علی برادران“ کے حوالے سے یہ ہے:

”دہلی سوبرس کے بعد دہن بنی ہوئی تھی، قریب قریب تمام چھوٹے بڑے بازاروں میں جھنڈیوں کا جال پھیلا ہوا تھا، استقبالیہ کمیٹی کے عالی شان دروازوں کے علاوہ تمام چھوٹے بڑے بازاروں اور تمام گلی کوچوں کے سروں پر صد ہا خوشنما دروازے نصب تھے۔

آزادی کا جہاز | چاندنی چوک کے بازار میں گھنٹہ گھر کے نیچے، جہاں داکٹرے اور شہزادوں اور خود ہنر امیر مل میٹھی کو ایڈریس دیا گیا تھا، ایک خوشنما آہنی چادروں سے منڈھا ہوا جہاز بنایا گیا تھا اور حلی حرفوں میں ”آزادی کا جہاز“ لکھا ہوا تھا جس پر قومی جھنڈا لہا رہا تھا، اس جہاز کی تعمیر صرف چوبیس گھنٹہ میں ہوئی تھی اور پانچ سو پیسے کو زائد اس پر خرچ ہوئے تھے، اس پر ایک درجن آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی، اس کے نیچے کرسیاں بچی ہوئی تھیں جن کے لئے دو روپیہ اور چار روپیہ ٹکٹ تھا اٹھیک گیارہ بجے دونوں بھائی تشریف لائے، مجمع نے اللہ اکبر اور بندے ماترم کے نعروں سے خیر مقدم کیا اور بھولوں کی بارش شروع کر دی۔

اہل خاں کی تحریر | ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے حکیم اہل خاں کی ایک تحریر سنائی جس میں
علی برادران کی ملکی و قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی رہائی پر
اظہار مسرت کیا تھا اور اس موقع پر اپنی عدم موجودگی پر افسوس ۱۷
ایڈریس | بعدہ رائے بہادر لالہ شیو پرشاد صاحب سی آئی ای، او جی، ای
رئیس دہلی نے ایڈریس پیش کیا جس کو خواجہ حسن نظامی صاحب نے باوازمند پڑھ کر سنایا
ایڈریس میں علی برادران کی قومی و ملکی خدمات پر نہایت عقیدت مندانہ الفاظ میں تبصرہ
کیا گیا تھا، اور ان کے بے پناہ جذبہ ایثار و سرفروشی کی تعریف و توصیف کی گئی تھی، اس کے
بعد علی برادران نے باری باری اہل دہلی کی نوازش کا شکریہ ادا کیا اور اپنی نظربندی پر
روشنی ڈالی۔

باب

وائسرائے کے ہاں وفد

تجویز | خلافت کانفرنس نے بمقام دہلی و امرتسر تجویز پاس کی تھی کہ مسلمان نمائندوں کا ایک وفد ممالک غیر مشل انگلستان، امریکہ، عراق وغیرہ جائے اور وہاں مسلمانوں کے مذہبی فرائض و واجبات نہایت معقولیت کے ساتھ گوش گزار کرائے۔

گورنمنٹ نے ممالک غیر میں وفد کو جانے کی اجازت نہیں دی، ہاں انگلستان جانے کی اجازت دیدی، اس وفد سے پیشتر ایک وفد اور ہندو مسلمانوں کا مشترکہ نمائندہ بن کر لارڈ چیمفورد وائسرائے ہند کی خدمت میں محمد علی کی سرکردگی میں حاضر ہوا تھا اور گورنمنٹ کو اس کے مواعید یاد دلانے تھے جو اس نے اپنی ”نہایت وفادار مسلم رعایا“ کے کر کے توڑے تھے۔ وفد ارکان وفد | میں ہندو مسلمانوں کے نہایت باخراور ممتاز اصحاب شامل تھے، نیز ہر طبقہ اور ہر جماعت کی نمائندگی کا کافی لحاظ رکھا گیا تھا۔

خاص خاص ممبروں کے نام یہ ہیں:

گاندھی جی۔ سیٹھ جھوٹانی۔ مولنا شمس الدین امترسری۔ مولنا ابوالکلام آزاد، مولنا محمد علی ایم اے، میر جماعت احمدیہ لاہور۔ ممتاز حسین صاحب پیر سٹر لکھنؤ۔ مولنا کفایت اللہ، مولنا حسرت موہانی، مسٹر سید حسین (ایڈیٹر انڈی پڈنٹ)، مولنا شوکت علی، مولنا عبدالباری فرنگی محلی، حکیم ابن خالص، ڈاکٹر کچلو۔ ڈاکٹر انصاری، مولنا محمد علی، مولنا عبد الماجد بدایونی۔ سید ظہور احمد صاحب سکری آل انڈیا مسلم لیگ۔ مولنا فاخر۔ مولنا سید سلیمان ندوی۔ آغا محمد صفدر قزلباش۔ راجہ صاحب

محمود آباد۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ راجہ صاحب جہانگیر آباد۔ مسٹر جناح، ان میں دو حضرات (مسٹر جناح و پنڈت نہرو) وقت پر دہلی نہیں پہنچ سکے تھے لیکن انھوں نے تار بھیج کر اپنے کامل اتفاقی کا اظہار کیا تھا۔

ایڈریس | یہ ایڈریس محمد علی نے تیار کیا تھا جس کا ترجمان کے برادر بزرگ مسٹر ذوالفقار علی نے کیا ہے، وفد نے وائسرائے کے سامنے کہا:

”ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ چاہے کتنا ہی بڑا اور زر خیز حصہ زمین ہو یا کیسا ہی بڑا سیاسی نفع ہو، مگر وہ معاوضہ نہیں ہو سکتا اس اخلاقی عزت کے نقصان کا جو برطانیہ کو ہوگا، اگر وعدے حرف بہ حرف پورے نہ کئے گئے۔“

اخلاقی رعب کا خاتمہ اس لئے اور گراں معلوم ہوگا کہ اس اعلان شاہی کی قلعی کھل جائے گی جو حضور والا کے پیشرو وائسرائے نے ترکی کی لڑائی ہونے پر شائع کئے تھے۔“

باب ۱۶

وفد خلافت یورپ

قرارداد | یہی وہ وفد تھا جس کی دہلی اور اتر سر کی خلافت کانفرنسوں میں قرارداد پاس ہوئی تھی یہ وفد یورپ اس لئے بھیجا گیا تھا کہ وہاں کے ارباب حل و عقد سے مل کر وزیر اور امرا سے مل کر اور اگر ہو سکے تو ملک منظم اور وزیر اعظم سے مل کر مسلمانان ہند کے جذبات و احساسات معقولیت اور صحت کے ساتھ پیش کرے اور یہ واقعہ ہو کہ وفد نے نہایت گر اندر خدمات انجام دیں۔

ارکان | وفد کے صدر محمد علی تھے، مٹرحن محمد حیات (موجودہ پٹی افسر و سکریٹری بحلیہ کوئٹہ بھوپال) سکریٹری تھے، مٹرحین، مولانا سید سلیمان ندوی اور ابوالقاسم صاحب وفد کے ارکان تھے، مٹرحیب قریشی اور مٹرحید الرحمن صدیقی اس زمانہ میں آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے ان دونوں حضرات نے اپنا تعلیمی سلسلہ عارضی طور سے منقطع کر دیا اور اس وفد کے ساتھ مصروف کار رہے۔

وفد کی کوششیں | سب سے پہلے جب وفد انگلستان پہنچا تو اس نے وہاں کے تمام ذمہ دار لوگوں سے ملاقات کی اور انھیں اصل مذہبی مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی، پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ محمد علی نے مختلف مقامات پر دورے کئے اور جہاں کہیں ایک ذرا سا بھی موقع مل سکا وہاں وہاں انھوں نے تقریر کی اور اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔

محمد علی کا بیان | محمد علی لکھتے ہیں :-

”سنہ ۱۹۰۵ء میں جب میں وفد خلافت لے کر یورپ گیا تو اس وقت رینز میں سکاٹلینڈ صاحب پارلیمنٹ کے ممبر تک نہ تھے، لاند جارج نے گزشتہ انتخابات میں سب

کو شکست فاش دی تھی اور آپ کی نشست تک چین چکی تھی۔

خبر و حشت اثر | جس دن ہمارا جہاز وین میں سرب کے وقت لنگر انداز ہوا اسی دن
ہیں لندن کے اخبارات پڑھنے کو ملے تھے اور ان سے معلوم ہوا تھا کہ صلح کا سفر
ترکی کا چند ہی دن میں فیصلہ کئے دیتی ہے، اسی شب کو تار گھر جا کر ہم نے نہایت
اہم اور پر زور تار اتحادیوں کی ساری حکومتوں کو اور ان کے اخبارات کو اور
لانڈ جارج کو تار | بالخصوص لانڈ جارج اور مسٹر ٹائیگو کو صبح کے ساڑھے تین بجے تک
تہمید دے تھے اور باوجود فرانس میں ریل والوں کی اسٹراٹک کے ہم اسی شب
کو لندن پہنچے جب کہ قسطنطنیہ کی واپسی کے متعلق دارالعوام میں سیاست ہوتا تھا۔
مسٹر میکڈائڈ سے دائمی اختلاف | وقت کی تنگی اور کام کی اہمیت کے باعث ہمیں
اتنی فرصت کہاں تھی کہ رینے میکڈائڈ صاحب کو ڈھونڈ نکالتے۔

حزب العمال کے سالانہ جلسہ کا وقت آیا ہم وہاں پہنچے جہاں حزب العمال کا جلسہ
تھا، جاتے ہی کرنل ویجوڈ مسٹر سنوٹن اور دیگر عمائد حزب العمال سے ملے اس سے
پیشتر مسٹر نیسبری سے ملاقات ہو چکی تھی۔

کننگھم کے ہال میں جلسہ | انھوں نے ہمارے لئے کننگھم کے ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ
کرایا تھا جس کے وہ خود صدر تھے، ان سے خاصی سب تکلفی بھی ہو گئی تھی ان سے
ہم ملے اور درخواست کی کہ ہمیں حزب العمال کے سالانہ کانفرنس میں ترکی کے
ساتھ صلح کی شرائط کے متعلق اظہار خیال کا موقعہ دیا جائے، چونکہ اس عرصہ میں
ہم زیادہ تر پیرس ہی میں رہے تھے اس لئے ہمیں اس سالانہ جلسہ کی اطلاع بہت
دیر میں ملی تھی، ان لوگوں نے کہا اب تو پروگرام ملے ہو چکا تاہم مسٹر رینے میکڈائڈ

سکڑی ہیں، ان کو اختیار ہے اگرچہ ہیں وقت نکال لیں وہ تو تھامے پرانے دوست
ہیں تھوڑا سا وقت تو نکال ہی دیں گے، میں خوش خوش آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔
مسٹر میکڈانلڈ کی خفگی | میں نہیں کہہ سکتا کہ اس شخص نے کس تلخی کے ساتھ مجھے جواب دیا
”ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، ہمارا پروگرام پوچھیں پڑ ہے، اسی کے لئے وقت نکالنا
مشکل ہے۔“

مجھے اس انکار سے سخت رنج ہوا مگر رنج کے علاوہ میرے قہج کی انتہا نہ رہی
جب مجھے اس انکار کا اصل سبب معلوم ہوا۔

خفگی کا اصل سبب | اس لئے کہ آپ نے فرمایا اور آپ نے مجھ سے اسی وقت فرمایا کہ تم
نے تو مجھے بائبل ہی بھلا دیا، تم مجھ سے آج ملے ہو، اتنے دن سے کہاں تھے؟
میں نے کہا کہ میں لندن سے باہر تھا فرمایا ”تم ان بنا کار (بعض ممبران پارلیمنٹ
و دیگر عامل لندن) کے پاس گئے اور مجھے بائبل ہی بھلائے رکھا، آج مجھے یاد
فرمایا، میں تمھارے لئے بائبل وقت نہیں نکال سکتا، جو شخص ایک دن برطانیہ کا
وزیر اعظم ہونے والا تھا وہ اور اس قدر کم ظرف و تنگدل؟ مجھے سخت حیرت ہوئی
کہ حزب عمال کے لیڈروں سے ان کی اس قسم کی مخالفت تھی کہ میرا ان سے
ملنا ان کو اتنا ناگوار ہوا، جو شخص رشک و حسد میں اس قدر ڈوبا ہوا ہو کہ ہندوستان
اور ترکی اور خود برطانیہ کے مفاد کا خیال نہ رکھے اور خیال رکھے تو صرف اس
کا کہ قلائد شخص حزب عمال کے اور لیڈروں سے کیوں ملا مجھ سے کیوں نہ ملا اس
سے بھلا کسی بھلائی کی امید ہو سکتی ہے؟

بینبری کی کوشش | ان بزرگ کے افکار کے بعد مسٹر کلائس اور بینبری نے صدر

کافر نس سے کہہ کر مجھے پانچ منٹ تو تقریر کے لئے دلا ہی دے اور جس انداز سے
تقریر میں نے تقریر کی اس نے سامعین کو اتنا محفوظ کیا کہ صدر کی گھنٹی تین بار بجی مگر
 ہر بار سامعین چلا چلا کر کہتے رہے کہ ”ابھی اور تقریر کرنے دیجئے، ابھی انھیں نہ روکئے۔“
 ”آپ بولے جائیں، آپ ابھی تقریر ختم نہ کریں“ اور جب چوتھی بار صدر جلسہ نے
 گھنٹی بجائی تو یہ کہہ کر بجائی کہ ”اب تقریریں سنٹ لے چکی ہے اور ابھی کام بہت
 باقی ہے، میں خود مغر ز مقرر کو ابھی اور سننا چاہتا ہوں مگر کیا کروں مجبور ہوں۔“
 اس دن سے مسٹر میکڈائڈ تا دم مرگ محمد علی سے خفا رہے، بہر حال اس کے علاوہ محمد علی
 کے وفادار یورپ کی کوششوں کے متعلق اور بھی خاصے معلومات حاصل ہوتے ہیں اور اندازہ ہوتا
 ہے کہ کس طرح ان لوگوں نے یورپ میں گھوم گھوم کر اپنے مقاصد کی تبلیغ کی ہو۔
فرانس میں تقریریں | فرانس میں بھی محمد علی اور مسٹر حسین نے نہایت معرکہ الّا تقریریں کیں
 اور فرانس کی کم از کم اخلاقی ہمدردی حاصل کرنے کی پوری کوشش کی اور اس میں بڑی حد
 تک کامیاب ہوئے۔

پاپائے روم سے ملاقات | پھر محمد علی نے پاپائے روم سے ملاقات کی اور ان کے سامنے
 بھی اپنے مقاصد و داعیات کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا، مسلمانوں کے وہ تاثرات بیان کئے جو انھیں
 ترکی حکومت کے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہیں خلیفۃ المسلمین کی جو حیثیت مسلمانوں میں ہو اسے بیان کیا۔
مسٹر لائیڈ جارج سے ملاقات | پھر محمد علی مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم کے حضور میں باریاب ہوئے
 لائیڈ جارج کا اس وقت طوطی بول رہا تھا، بڑے کردار سے اس نے وزارت اور بڑے ٹھانڈا باٹھ
 سے اس نے اپنے وقار و کمالت کی نمائش کی، اس زمانہ کا لائیڈ جارج وہ تھا جب سائے یورپ
 پر اس کے تدبیر، اس کی قابلیت اور اس کی گراں مایہ خدمت ملی کی دھاک مٹھی ہوئی تھی۔

محمد علی مشرلائی جاسج سے ملے اور آزادی و مباحی اور معقولیت و مسانت سے مسلمانوں کے مطالبات پیش کئے، گورنمنٹ کے وعدے یا دلائے، وہ نتائج و عواقب پیش کئے جن سے برطانیہ کو دوچار ہونا پڑتا، خلیفہ اور خلافت کی حیثیت اسلامی نقطہ نظر سے پیش کی پھر مسلمانانہ کی وفاداریوں کا تذکرہ کیا یہ یا وہ دلائل مسلمانوں نے کس طرح گورنمنٹ کے وعدوں پر اعتبار و اعتماد کر لیا اور پھر اب کس طرح خود گورنمنٹ اپنے تئیں وعدہ خلاف ثابت کر رہی ہے۔

نہامی | لیکن محمد علی کی تمام کوششیں، ساری تقریریں اور کل پروپیگنڈا یکساں ثابت ہوا، برطانوی قوم وفا پرست اور افکار عہد کرنے والی قوم نہیں ہے وہ ہمیشہ قوت کے دیوتا کو سجدہ کرتی ہے اور کمزوری کے مجسمہ کو حقارت سے ٹھکراتی ہے، وہ دور میں اور مصلحت شناس نہیں ہے، ہاں ”وقت شناس“ ہے۔ ”وقت“ پر وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔

تشنگی معلومات | وفد خلافت یورپ کے متعلق اس وقت تک کوئی مفصل بیان نہیں دیا جاسکتا جب تک شرکار وفد میں سے کوئی بزرگ اپنے قلم کو جنبش نہ دیں اس لئے کہ اس زمانہ کے اخبارات میں جو حالات شائع ہوئے اول تو وہ مفصل کارروائیوں کے اجمال کی صورت میں شائع ہوئے تھے، دوسرے وہ بھی اب ”کبریت احمر“ کا حکم رکھتے ہیں، باوجود تلاش بسیار وفد کے متعلق مستند ترین مفصل معلومات پیش کرنے سے معذوری ہے، ہاں اگر شعیب صاحب احسن محمدیات صاحب عبدالرحمن صدیقی صاحب یا مولانا سید سلیمان صاحب مدوی اپنے قلم کو جنبش دیں تو یہ ممکن ہے، لیکن لوگوں کا بیان ہے کہ ایسا ہونا جوئے شیر کے ”خود بخود“ پیدا ہونے سے کم نہیں!

ہمیں جبہ حستہ حالات خود بخود محمد علی کے مختلف مضامین میں ضمناً حاصل ہوئے وہ اوپر گزر چکے ہیں جن اتفاق سے جمعہ مرکزیہ خلافت کے شائع کردہ ”حسابات وفد خلافت یورپ“ کا ایک نسخہ بھی ہاتھ لگایا ہے۔

لوح سلیمان | اس میں مولنا سید سلیمان ندوی کا ایک مقدمہ بھی ہے۔ مقدمہ میں موصوف نے حسابات کی تفصیل وغیرہ بتائی ہے اور ضمناً وفد کی کارروائی پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی ہے اس وقت وہ سرسری نظر بھی بہت غنیمت ہے، اس مقدمہ کے اہم اجزاء بدیہ ناظرین ہیں۔

اعتراف جواب | ”یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں سے زیادہ ہمارے ایگلو انڈین و تیل کو وفد کے حسابات کا انتظار ہے۔ وفد خلافت نے کا غذات اور حسابات کو درست کر لیا تھا اور اسی لئے اس نے حسن محمدیات صاحب بی لے علیگ کے خدمات وفد خلافت کے سکرٹری کی حیثیت سے حاصل کر لئے تھے انہوں نے اس ضمن کو جس تندہی جانفشانی اور محنت کے ساتھ انجام دیا اس کی شہادت تو وہ دیکھیں گے جنہوں نے ان کو ولایت کے دفتر میں دو دو بجے رات تک کام کرتے دیکھا ہے یا اس کا اندازہ کچھ وہ لوگ کر سکیں گے جن کو وفد کے اُن کا غذات دو چار اور سیدات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور پرزوں کے دیکھنے کا جو دفتر خلافت کے کئی صند و قچوں میں بابتک محفوظ ہیں دیکھنے کا موقع ملا ہے متعدد راتیں ان کی نہیں ہیں ایسی گزرتی تھیں کہ وہ کا غذات کی ترتیب تلاش میں درشب نہ دہرا رہتے تھے اور شاید ہی تمام مدت قیام یورپ دو بجے شب پہلے ان کو دن بھر کے کا غذات سیٹنے کے بعد بستر پر جانے کا اتفاق ہوتا۔ ایسی میں ہرگز نہ سوتی تھیں لیکن خود ان کے قول کے مطابق ان کو یہ بھی شبہل احساس رہتا تھا کہ وہ سمندر میں چل رہے ہیں یا خشکی پر، یہ پورا زمانہ اس کشش میں صرف ہوا کہ ادھر سہارا جہاز بلبلی ہیں لنگر انداز ہو اور ادھر اس دفتر بے پایان کی ترتیب و درنگی سے نجات مل جائے۔

وفد خلافت کے دفتر کا کام رفتہ رفتہ اس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ تنہا ایک سکرٹری

کے بس سے باہر ہو گیا، اس موقع پر ہم اپنے دوست عبدالرحمن صاحب صدیقی کا نام لئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکے جنہوں نے محض خلوص خاطر اور جوش دینی کی بنا پر اپنی تعلیم کو خیر باد کہا اور دفتر کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور آکسفورڈ چھوڑ کر پوسے چھ سات مہینے یعنی جب تک خلافتِ ولایت میں رہا وہ ہر روز صبح سے شام تک میز سے سر نہیں اٹھاتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ایک تو طبعاً ان کو اس بد مزہ کام سے دلچسپی ہو اور دوسرے جنگِ بلقان کے زمانے میں طبی و فطر کی نیچر کی حیثیت سے چونکہ وہ اس سے پہلے کامیاب فرائض انجام دیکچکے تھے اس لئے ان کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہاتھ آیا، اس سلسلہ میں مسٹر شعیب قریشی کا نام لینا بھی ضروری ہے جنہوں نے دفتر خلافت کی علمی و تحریری امداد میں پورے چھ مہینے صرف کئے اور اس کام کے لئے حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے بڑی قربانی گوارا کی اور اپنے فرائض کو نہایت خیریت سے انجام دیا۔

ہمارے رئیسِ فدا کو حسابات کی ترتیب اور درستگی میں اس قدر اہتمام بلکہ نکتہ نگاہی کبھی ان کے ساتھ کے (ملا) کو غصہ نہ جاتا تھا، ان کے ہاتھ سے جو اخراجات ہوتے تھے وہ روزانہ ان کو اپنے نوٹ بک میں عموماً درج کر لیتے تھے، اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی فرض تھا کہ اپنے بے پروا رفقاء سفر کے اخراجات کو یاد رکھیں اور رات کو سوتے وقت جب بنیوں کی طرح وہ دن کا حساب بند کرنے بیٹھتے تھے تو حقیقت یہ ہے کہ ان کی یادداشت پر تعجب ہوتا تھا۔

ترتیب حساب کے نکلات | محمد علی صاحب کی کوشش تھی کہ روز کا روز حساب ہو جایا کرے، لیکن جب تک لندن میں قیام رہا یہ کام آسان تھا، لیکن شغل یہ آں

پڑتی تھی کہ ہر دوسرے تیسرے ہفتہ میں مختلف دوسے اور سفر درپیش آجاتے تھے اس روز ادوی میں حسابات کا مرتب رکھنا اور ریل اور جہاز میں بیٹھ کر روز کی میزان لگانا علامت کس قدر مشکل تھا، ایک معمولی سفر میں تو انسان بوجھ ہو جاتا ہے، پھر ایسے دور دراز سفر میں جہاں ۲۴ گھنٹے کے اندر متعدد ملک، متعدد قوموں اور متعدد زبانوں سے واسطہ پڑتا تھا، ریل کے ہچکولے، جہاز کی طوفان خیز موجیں تو اسے داغی و جہانی کو درہم کر دیتی تھیں، دفتر حساب کھول کر بیٹھنا اور ان کو صاف کر لینا کس قدر مشکل بلکہ عملاً محال تھا، اس دوڑ بھاگ اور چل پھر میں چھوٹے چھوٹے کاغذات، ہوٹل کے بلوں، ڈاک تار اور ادائے کی رسیدوں اور ووچروں کو سنبھال کر رکھنا اور گناڑی، ٹیکسی، قلی، ریل جہاز ریفرنٹسٹوم، خرید و اخراجات وغیرہ کی اداکاریوں کو ہوٹل پہنچ کر اطمینان کے ساتھ میٹھے تک یاد رکھنا اور ان کو نوٹ بک پر لکھنے جانا معمولی کام نہ تھا۔

اس سے زیادہ وقت یہ تھی کہ یورپ کے مختلف ملکوں میں سفر کرنا پڑتا تھا، آج اٹلی میں، کل فرانس، پرسوں سویٹزرلینڈ، چوتھے دن اٹلی، یورپ کے مسافروں کے معلوم ہر کہ یورپ کے سفروں میں سکوں کے مبادلہ کی کس قدر غیر معمولی قیمتیں پیش آتی ہیں، ہر جگہ نئے سکے کی ضرورت پیش آتی ہے اور دوسرے ملک کا سکہ وہاں بیکار ہو جاتا ہے، اس کے کسی ایک سکہ میں حساب کی یکسانی کو قائم رکھنا محال تھا جب ایک ملک سے دوسرے ملک کو جانا ہوتا تھا تو اس ملک کے تمام سکوں کو دوسرے ملک کے سکوں میں تبدیل کرنا پڑتا تھا، اسی طرح مختلف سفروں سے لوٹ کر جب ہم اپنے مستقر پہنچتے تھے تو سکہ ریوں کو کئی کئی دن ان سکوں کو انگریزی سکوں میں تبدیل کر کے حساب درست

کرنے میں لگ جاتے تھے اور پھر بھی شکوک ہجالتے تھے۔

مشکلات کا اب بھی خاتمہ نہیں ہوا ہے، یورپ میں ہر روز ہر شخص کا پہلا کام یہ ہے کہ اخبارات کے کالموں میں سکوں کی قیمت پڑھ لے جس نے ماہ میں ہمارا وہاں قیام تھا، چال تھا کہ ہندو فرانسیسی، سویس اور ڈالین سکوں کی قیمت ہر روز بلکہ کبھی کبھی دن میں کئی کئی دفعہ ترتی پڑتی رہتی تھی، ہمسائے پاس ہندوستان سے روپیوں کی صورت میں رقم بھی جاتی تھی وہاں ہم کو انگریزی پونڈ کی شکل میں ملتی تھی۔

روپیوں کا بھاؤ کسی ایک نظام پر نہ تھا، اب اس پونڈ کو لے کر جو ہم فرانس پہنچے تو اس کو ذرا بنانا پڑا، ہر روز فرانک کا نرخ گھٹتا بڑھتا رہتا تھا، وہاں سے اٹلی جانا ہوا تو فرانک کو یورو کی شکل میں بدلوانا پڑا۔ ایک پونڈ کے مقابلہ میں ۶۰ فرانک ہلکے ہر روز اسٹ پھر ہو کر آتا تھا، اٹلی کا سکہ ایک پونڈ کے مقابلہ میں ۵۰ سے لے کر ۲۰ تک رہتا رہتا تھا، ایسی حالت میں ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ وفد خلافت کے حسابات کی ترتیب اُس قدر آسان نہ تھی جس قدر بنیاد پر نظر آتی ہے، اس وقت وفد خلافت کے کاغذات یورو کے سفر کردہ ملکوں کے اقتصادیات اور اکائیکل عجائبات کا مجموعہ ہے اب ہندوستان پہنچ کر ان تمام مختلف سکوں کو جن کا ہر روز نیاز خج تھا روپیوں کی شکل میں لاکر حسابات کو درست کرنا ایک دواہ کا کام نہ تھا۔

اس پر بھی ہمسائے رئیس وفد کا غم یہ تھا کہ واپسی میں ۱۵-۲۰ دن جہاز میں بیٹھ کر ان تمام وقتوں کے بحر بیکار کو بھی طے کر لیا جائے گا، مگر جہاز میں بیٹھ کر ان کاغذات کے صندوق کو کھول کر ترتیب دیا جانے لگا تو معلوم ہوا کہ اس بانی سمندر کا طے کرنا تو آسان ہے مگر یہ ”حسابی سمندر“ صرف ایک دواہ میوں کی محنت سے قطع نہ ہو سکے گا

تاہم یہ پورا سفر و فذ کے سکرٹری نے ان کاغذات کی ترتیب اور حسابات کی دیکھی ہیں صرف کیا خیال تھا کہ سال بعد ہی پہنچ کر چند ہفتوں میں یہ کام ختم کر دیا جائے گا۔ مگر کس کو نہیں معلوم کہ اس دن سے جس دن کی صبح کو وہ خلافتِ نبوی کے سال پر لنگر انداز ہوا، رئیسِ فذ کو تحریک کی اشاعت، تقریر، تحریر، دورہ اور سفر میں ایک دن کی مہلت اپنے ذاتی کاموں تک کی بھی نہ مل سکی، یہاں تک کہ لوگوں کو یقین کر تعجب ہو گا کہ اسی زمانہ میں جبکہ ان کی دور لڑکیوں کی شادیاں ہوئیں تو ان کو اس تعجب میں بھی ایک دن سے زیادہ شرکت کا موقع نہ ملا اور سدھی کو رنگانوں کی طرح فقط اس فرض کا ماتھا دیکھنا پڑا، اور ان سب پر مزید یہ کہ جامعہ ملیہ ذیلِ مسلم یونیورسٹی کے معلموں اور پروفیسروں کی تلاشِ نصاب کی تیاری، جامعہ کی تنظیم کا عظیم الشان کام ان کے سر آ پڑا اور ان کو پوسے تین ہینے تک پہنچی کے فرائض انجام دینے پڑے جس کے درمیان میں ان کو کسی اور کام کے لئے چند لمحے بھی نہیں مل سکتے تھے، اور وہ بھی علی گڑھ کالج اور علی گڑھ ضلع کے حکام کے ساتھ ناگوار قصوں کی تحریری و تقریری جواب دہی میں صرف ہوئے۔

الغرض ۴ اکتوبر ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۴ ستمبر ۱۹۲۳ء تک بعضی ولایت کی واپسی سے یوم گرفتاری تک ان کو چند دن بھی ایسے نہ ملے جو اطمینان سے بیٹھ کر باقی کاغذات کو دیکھ سکتے، اس ایک سال کا ایک ایک دن مختلف شہروں کے دورے مختلف صوبوں کے سفر، ہزار ہا مجلسوں، کانفرنسوں اور انجمنوں کی شرکت و تقریر اور لوگوں کے ہجوم ملاقات کے نذر ہوا۔

لیکن ترتیبِ حسابات کا جو بوجھ ان پر تھا وہ ان تمام مشغول و مصروف اور اہم و

نازک حالات میں بھی ان کو فراموش نہ ہوتا تھا، بہار آسام، بھنبی، مالک متوسط اور مدراس کے تمام سفروں میں حسابات کے صندوق اور سکرٹری اُن کے ساتھ ساتھ ہر اور ریلوں، اسٹیمروں میں یا جاسے قیام پر جہاں بھی کچھ ٹھہرا سا و فقدان کو مل سکا سکون و آرام کو چھوڑ کر وہ اُن کاغذوں کو لے کر بیٹھ جاتے تھے، ہر شخص جانتا ہے کہ دوروں اور سفروں میں ان کے ارد گرد خلقت کا کس قدر ہجوم ہوتا تھا، ملاقاتوں کی کس قدر کثرت ہوتی تھی، دن بھر میں ان کو کتنی تقریریں کرنی پڑتی تھیں، کتنے مضامین اور بیانات لکھوانے پڑتے تھے کہ اٹھنا بیٹھنا، کھانا، پینا شکل تھا مگر قوم کو اپنے ریس فڈ کے دل و دماغ پر ناز کرنا چاہیے کہ ان مشکلات و عوائق و موانع انبار کے باوجود انھیں پراگندہ اور منتشر ایام میں حسابات کی ترتیب کا آدمے سے زیادہ کام وہ انجام دے چکے تھے کہ دفعہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ان کی گرفتاری پر ان کی اس سخت مصروفیت و مشغولیت کا عجیب و غریب خاتمہ ہو گیا، ناچار ان کے لائق سکرٹری جن محمد حیات صاحب نے اس اچھے کام کو پورا کرنا شروع کیا اور بالآخر آج یاس قابل ہوا کہ آپ کے سامنے پیش کیا جاسکے۔

وفاقت کی عظمت اہمیت | وفاقت کا انگریزی نام ”انڈین خلافت و مملکتیشن“ تھا وہ ہندوستان سے نہ صرف، کروڑوں مسلمانوں کی زبان بن کر گیا تھا بلکہ جیسا کہ لوگوں نے تک آنجہانی نے وفاقت کو رخصت کرتے ہوئے کہا تھا وہ متحدہ ہندوستان کی طرف سے پیام لے کر فرنگستان گیا تھا اور حقیقت میں وہ یورپ کی سرزمین میں تھیں خاموش، ساکن لیکن مضطرب القلوب نیاں اسلام کے جذبات و احساسات کا ترجمان تھا اس طرح یہ وفاقت نیاں تاریخ کا ایک انقلابی واقعہ، مشرق کی طرف سے مغرب کے مظالم کے خلاف پہلی تنبیہی صدا و توحید کی جانب سے تئیس کو نوائے رجز بلکہ

جیسا کہ پوپ آنجنہانی نے وفد خلافت کے جواب میں کہا کہ وہ مذہب کی طرف سے اتحاد کو اور روحانیت کی طرف سے مادہ پرستی کو اعلان جنگ تھا۔

ایک ایسے اہم، شاندار اور عظیم مطالبہ مذکور جس عظمت و وقار، متانت، بلندی نظر اور رکھ رکھاؤ کی ضرورت تھی وہ محتاج بیان نہیں اور پھر ایسے ملکوں میں جہاں ظاہر بینی اور ظاہر پرستی ہی زندگی کا مذہب جہاں حیثیت اور بد حال کو سوسائٹی میں داخل ہونے کا حق نہیں، جہاں انسان کی ظاہری حالت اس کی اندرونی عظمت کا معیار بھی جاتی ہے، جہاں اس کے قول و گفتار کی اہمیت کا اس کے ظاہری پوزیشن سے اندازہ لگایا جاتا ہے، جہاں غریب کو امراء کے طبقہ سے ملنے اور عرض حال کرنے کی اجازت نہیں جہاں چھوٹے درجہ اور کم حیثیت طریق سے بہنے والوں سے ملنا جلنا ان کے پتہ سے مراسلت کرنا ان کو اپنے ہاں مدعو کرنا یا ان کے ہاں مدعو ہونا معیار شرافت کے خلاف ہے۔

ان حالات کو پیش نظر رکھ کر وفد خلافت کو یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ ۳۲ کروڑ مسلمانوں اور ۱۶ کروڑ مسلمانوں کا نمائندہ ہے وہ مشرق کا پیام امن لیکر مغرب کے پاس آیا ہے، وہ توحید کے شرائط کو تثلیث کے کانوں تک پہنچانا چاہتا ہے وہ دنیا کے اسلام کا پیغامِ فیصلہ عالمِ عیسوی کے گوش گزار کرنے آیا ہے، وہ مذہب و حق پرستی کی جانب سے اتحاد و مادہ پرستی کے سامنے پہلی صدائے تنبیہ ہے، وہ ممالک اتحادیہ کے چھوٹے طبقہ سے لے کر بڑے طبقہ تک سب کے کچھ کہنا اور ان سے کچھ سننا چاہتا ہے، چاہے تو یہ تھا کہ کم از کم اس سے کمتر حیثیت میں نہ رہتا جس حیثیت میں اس اہمیت کے وفد مسرزمین یورپ میں رہتے ہیں یا اس وقت رہ رہے تھے۔

جس وقت ہم یورپ پہنچے ہیں حسب ذیل مشرقی و فودو ہاں موجود تھے :-

مصری قومی وفد، حجازی وفد، البانی وفد، جارجین وفد، آذربائی وفد، اسلامی قازانی وفد، یہ و فودو جس حیثیت اور پوزیشن سے ہوتے تھے ان میں سے اکثر و فودو سے ہائے سہنے کی پوزیشن کم درجہ تھی، ہم متوسط ہٹلوں میں قیام کرتے تھے، انگلستان میں پہلے کرن ہوٹل میں جا کر ٹہرے جہاں پر بشکل جگہ تھی، اس کے بعد رائل کورٹ ہوٹل میں جا کر ٹہرے جو لندن کا نہایت معمولی ہوٹل ہے، پھر ہٹلوں کا قیام گراں دیکھ کر ایک پرائیویٹ مکان میں منتقل ہو گئے وہ بھی گراں نظر آیا تو البرٹ ہل نیشن میں ایک مستقل مکان (فلٹ) کرایہ پر لے کر رہے، فرانس میں دیگر آم ہوٹل، ریجنبا ہوٹل اور اٹلی میں گرینڈ ہوٹل اور ہوٹل کوئریل میں قیام رہا، ہر سیلح یورپ جانتا ہے کہ ان ملکوں کے متوسط ہوٹل ہیں حالانکہ اسی زمانہ میں دوسرے اسلامی و فودو اپنے مقاصد کی اہمیت کے لئے بڑے بڑے ہوٹلوں میں مقیم تھے، مصری قومی وفد جو سعد پاشا زاعلول کے زیر سیادت تھا ان ہوٹلوں میں قیام کرتا تھا جو کوڑیتی مہاجنوں اور شہزادوں کا قیام گاہ تھا، انگلستان میں کارلٹن، سیدواسے، اورٹرنین اور پیرس میں کلیرج اور رٹنمین ٹہرتا تھا، غریب حجازی عربوں کا ڈیلیکیشن انگلستان میں کارلٹن میں اور پیرس میں کلیرج میں مستقل فلٹ لے کر رہتا تھا۔

یونانی ڈیلیکیشن جن کے مقابلے کے لئے ہم بھیجے گئے تھے وہ رٹنمین میں مقیم تھا جو یورپ بھر میں سب سے بڑا اور گراں ہوٹل ہے، یہ تمام ہوٹل دو تین صدیوں شہزادوں، مہاجنوں اور بڑے بڑے سلطنتوں کے ناسدوں کی جائے قیام ہے، آپ اس سوا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم نے افراط و تفریط کے بیچ میں اعتدال کا راستہ اختیار کیا اور اتنا بھی صرف

اس لئے ہوا کہ ڈیلیکیشن کے اعتبار میں فرق نہ آئے اسلام اور ہندوستان کی بقیہ
نہ ہوا اور اعلیٰ پوزیشن کے لوگوں کو ان ہٹلوں کے پتے سے مرسلت کرنے اور وہاں
آنے جانے اور دعوت قبول کرنے میں جھجک نہ ہو۔

وفد کے ارکان کا رکن اور علم | ہندوستان سے ہم چار آدمی جہاز پر روانہ ہوئے مولانا محمد علی
مشرقیہ حیات صاحب اور خاں کسار کچھڑوں کے بعد مولوی ابوالقاسم صاحب کا سفر
ہوا اور اس کے بعد شیخ مشرقیہ حیات صاحب قدوائی آئے خلافتِ خدا اور مسلم اڈا ملک
کے وفود کی نگرانی ترتیبِ اہتمام کے لئے عبدالرحمن صاحب صدیقی (آکسفورڈ)
ہاے ساتھ قیام کرنے پر رضامند ہوئے، مسلم اڈا ملک کی ترتیب اور ایڈیٹری اور
محمد علی صاحب کی تحریری اعانت کے لئے شعیب قریشی صاحب (حال ایڈیٹری ٹیبل)
واٹس ایپ ٹیبل کو محمد علی صاحب نے مجبور کر کے اپنے ساتھ رکھا، حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں
صاحبوں کی ذات سوشل میڈیا کے کاموں میں ایسی اعلیٰ انداز میں جن کا شکریہ ادا
کرنا ہمارا فرض ہے، حالانکہ ان کو اس کے سبب اپنا ایک پورا ٹرم (دورہ تعلیم و ترقی)
کرنا پڑا اور مزید قیام کے لئے ان کو زائد روپے کی فکر کرنی پڑی اور وطن کا مایہ
لوٹ کر آنے کی آرزو میں چھ سات مہینہ کا وقفہ ان کو گوارا کرنا پڑا۔

معزز کارکنوں میں کبھی کبھی مشرقیہ حیات (حال ایڈیٹری ٹیبل) کرائیکل، اور مسز سر جینی
نامتو اور اکثر مشرقیہ حیات (سابق ایڈیٹری ٹیبل) کرائیکل اور عبدالقیوم ملک صاحب ایڈیٹر
مسلم اڈا ملک اور محمد حبیب صاحب بی بی سی (آکسفورڈ) کی معیت کا شرف بھی
ڈیلیکیشن کو حاصل رہا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی اجاب اور طلبہ بھی اپنی ہڈی
اور محبت سے کبھی کبھی ہم کو سرفراز کیا کرتے تھے، ان سے وقفے کے اور دور دورے

کے مختلف کام لئے جاتے تھے، فرانس میں موسیڈو کو کونیویر۔ موسیڈو والدام۔ میڈنوزل پورود۔ اور ڈاکٹر رشاد ہاسے دست بازو تھے۔ اٹلی میں غالب کمال بے (غیر ترکی)، ڈاکٹر عبد الحمید سعید (مصر)، نوری عزیز (ترک باجر) شیخ خالد (طرابسی)، وغیرہ ہاسے اعلان و مددگار تھے۔

تنخواہ دار کام کرنے والوں اور نوکروں میں ایک ٹائپسٹ اور جیب زیادہ کام ہو تو دو ٹائپسٹ اور ایک دفتر ڈاک کا ملازم ایک باورچین ایک مددگار باورچین اور جھاڑو اور صفائی کے لئے ایک ملازمہ اتنے آدمی شامل تھے، اکثر نامہ نگاروں، مختلف اخبار کے نامزدوں سیاسی پارٹیوں کے ارکان، پارلیمنٹ کے ممبروں اسم اور با اثر شخصوں کو بھی مدعو کرنا ضروری ہوتا تھا اور جیب پیرس اور روما میں جانے کا اتفاق ہوتا تو اکثر اپنے ترک، عرب اور دیگر مسلمان بھائیوں کی میزبانی کی غرت بھی حاصل ہوتی تھی۔

یورپ کی گرانی | یورپ کی گرانی جنگ سے پہلے ہی کیا کم تھی اور جنگ کے بعد تو قیاس و شمار سے باہر ہو گئی تھی جس کا اندازہ لگانا ان لوگوں کے لئے بہت مشکل ہے جن کو ممالک یورپ کے سفر کا اتفاق نہیں ہوا ہے، ہندوستانیوں میں سے جنہوں نے ممبئی دیکھی ہے اور وہاں کے مصارف کا ان کو تجربہ ہے وہ ایک ہلکا سا خاکہ یورپ کے مصارف اور گرانی کا کر سکتے ہیں، وہاں مکانات کا کرایہ ہوٹلوں کا بل نوکروں کی تنخواہ ماہوار نہیں بلکہ ہفتہ وار کے حساب سے ادا کرنا پڑتی ہے۔ متوسط ہوٹلوں (مثلاً گرزن ہوٹل) کے چار کمروں اور ایک دفتر اور ملاقات کے کمرہ کے لئے ایک ہفتہ میں ۵۰ پونڈ صرف قیام کے ادا کرنے پڑے اور ۲۰ پونڈ کھانے کے، یہ خرچ اس قدر گراں نظر آیا کہ جلد از جلد کسی پرائیوٹ مکان میں رہنے کا انتظام مناسب معلوم ہوا چنانچہ ایک پرائیویٹ مکان کے خاندان

میں مل کر یو یا ہاؤس میں اٹھ گئے وہاں ۵۳ پونڈ فی ہفتہ صرف رہنے کے دینے پر
اس کو بھی چھوڑ کر ایک مستقل اپنا مکان (فلٹ، البرٹ ہال میٹن میں لیا جس کا کرایہ
قیام ۱۰ پونڈ فی ہفتہ تھا، چنانچہ کم پریل ۱۹۴۰ء سے یکم ستمبر ۱۹۴۰ء تک اسی مکان
میں ہمارا قیام رہا اور کھانے کا انتظام بھی گھر ہی پر کیا گیا، روزانہ ۸ آدمی سے لیکر
۱۲ آدمی تک کی اوسط ہمارے مطبخ کے مستقل شرفکار کی رہتی تھی اور جب کبھی ہمارے
کی کثرت ہوتی تھی تو یہ تعداد ۱۵-۱۶ تک بڑھ جاتی تھی تاہم اس انتظام سے ہوٹل
کی بنسبت کھانے کے مصارف بھی کم ہو گئے۔

ایک ٹائیسٹ کی تنخواہ ہندوستان میں چالیس پچاس روپے ماہوار ہے، لیکن انگلستان
میں ۴ پونڈ یعنی ۶۰ روپیہ فی ہفتہ یعنی ۲۴۰ روپے ماہوار تھا ہندوستان میں ۱۰-۱۲ روپے
میں اچھے ملازم ملتے ہیں وہاں کم و بیش ایک پونڈ فی ہفتہ یا ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ
ہوتی ہے، کھانے کی مد میں صرف ایک حساب سن لیجئے کہ ایک انڈے کی قیمت ۵/-
ہے، پیرس میں تو اور غضب ہے بانی جو ہر جگہ مفت ہے مگر وہاں عموماً کھانے کے ساتھ
ہوٹلوں میں شراب پیتے ہیں اور متقی لوگ سوڈا لینڈ وغیرہ اس سے بھی زیادہ ہم
جیسے دیناروں کو اپنی دینداری کی قیمت میں سادہ معدنی پانی پینے کی قیمت
۳/- روٹل ادا کرتا پڑتی تھی کیونکہ اہل پیرس نے مشہور کر رکھا ہے کہ وہاں معمولی سادہ پانی
مضر صحت ہے اور اس کا پینا قابل احتراز ہے۔

آپ کسی ہوٹل میں کھانا کھانے گئے دربان نے جھک کر شیشہ کے بند دروازے کو کھولا
اور جھک کر تعظیم دی آگے بڑھ کر کلوک روم جہاں آپ اپنا بالادہ اتاریں گے اور چھری
چھتری رکھیں گے، وہاں کے ملازموں نے آپ کو اس کام میں مدد دی، یہاں

سنے نکل کر آپ منیر چاکے بیٹھے خانہ ماؤں نے آپ کو کھانا کھلایا، فراغت کے بعد جیب آپ کے کھانے کا حساب چکایا تو جس قدر ہوٹل کا چارج ہوگا اس کا دسواں حصہ آپ پر فرض ہو کر خانہ ماؤں کو ”جبری انعام“ ٹپ عطا کریں اور اس کے جواب میں شکریہ جناب کی سند خوشنودی حاصل کریں، یہاں سے کل کر محاسب کے پاس گئے ان کے پاس کچھ دام اخلاقاً چھوڑے، کلک روٹ میں اپنے کوٹ اور چھڑی چھتری کی واپسی کے لئے گئے اس قلیل مدت میں اپنی چیزوں کو غیر مل کے دست برد سے حفاظت اور ”پروٹیکشن کا خرچ ادا کرنا لازم ہوا، پھر دربان کی خوش اخلاقی کا معاوضہ ضروری ہو، غرض اس طرح کھانے کے علاوہ بالائی مصارف بھی کچھ کم نہیں ہیں، آپ جب کسی گاڑی، موٹر ٹیکسی پر بیٹھیں گے تو کرایہ کے علاوہ ڈرائیور کو ۶ پنس دینا بھی کرایہ کا ایک جز ہے۔

مغربی سیاحوں کو جس قدر مشرقی ممالک کے ملازموں کی ”پیشکش“ پر غصہ و تعجب آتا ہو، مشرقی سیاحوں کو مغربی ممالک کے ملازموں کی ”ٹپ“ پر اس سے کم غصہ و تعجب نہیں آتا۔ سفر کا حال یہ کہ براعظم یورپ کی تیز ریل گاڑیوں کو کینٹنل اکیسٹریٹریوں میں فرسٹ اور سکند ڈوہی درجے ہوتے ہیں لیکن سکند کلاس میں سونے کی جگہ نہیں ہوتی، اس لئے بڑے سفروں میں سونے کے فرسٹ کلاس میں جانے سے چارہ نہ تھا، قلیوں کو آپ دو چار آنے دیتے ہیں وہاں دو چار روپیوں سے کم نہیں لیتے، ہم لوگوں کے سامان کے اتارنے چڑھانے کی مزدوری ہر کے قریب لیتے تھے، ٹیکسی کا کرایہ پہلے کچھ تھا لیکن ہمارے جانے کے بعد وہ فیصدی کا اضافہ ہو گیا، ادھر آپ نے ٹیکسی پر قدم رکھا اور وہاں ۱۰ پنس پر میٹر کی سوئی

آگئی، غرض وہاں کھانا پینا چلنا پھرتا اترا چڑھتا تو ناچنا ہر چیز ”قیمت طلب“ ہو۔
دوسرے تبلیغی مصارف | ڈاک کا خرچ آپ بڑے اور اب ایک آنہ لقا فرمیتے ہیں۔
 وہاں ۲۲ ہزار کا خرچ یہاں ایک آنہ لفظ ہو وہاں سے ہندوستان ضروری تار کے
 لئے شاید ڈیڑھ ٹھٹھانگ یعنی لفظ دینا ہوتا تھا جب کبھی جلسہ کرنا ہوتا تھا تو کوئی ہال
 چند گھنٹوں کے لئے کرایہ پر لینا پڑتا تھا جس کے لئے ۲۵-۳۲ پونڈ ادا کرنے ہوتے
 تھے جو لوگ اس کا انتظام کرتے تھے ان کو استہارات کی چھپائی، تقسیم اخبارات میں
 اطلاع، روشنی اور کرسیوں کا کرایہ لوگوں کو بلائے کا خرچ دینا پڑتا تھا، چنانچہ گنگوٹے
 ہال کے جلسوں میں ۳۳ پونڈ ہال کا کرایہ تھا اور ڈھائی سو تین سو پونڈ ان مصارف
 بالا کے لئے ادا کرنے پڑتے تھے، چنانچہ گنگوٹے اور کیکسٹن ہال کے ایک ایک جلسہ
 کا خرچ تین سو سو تین سو پونڈ ہوتا تھا، انچسٹر میں ایک جلسہ ہوا اور دو سو پونڈ خرچ
 ہوئے۔

سلم اوٹ لک جو پہلے سے جاری تھا، جب ہم وہاں پہنچے ہیں تو کمی آمدنی کے
 باعث نزع کی حالت میں تھا، ہم کو اپنی تبلیغ اور ضروری مضامین اور اطلاعات اور
 جلسوں کی کارروائیوں اور خبروں کی اشاعت کے لئے اخبارات کی ضرورت
 تھی، انگلستان کے مشہور و ممتاز اخبارات نے اور خصوصاً ٹائمز نے جو مخالفت کا
 رویہ اختیار کیا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مضامین تو مضامین ہمارے استہارات وہ قیمتی
 معاوضہ پر بھی شائع نہیں کرتے تھے، ہلے دس کے مزدور طبقہ کے اخبارات
 ڈیلی ہیرلڈ فارن اور فرس وغیرہ سے معاملہ کرنا پڑا، گنگوٹے کے اخبارانڈیا کو مدد
 دے کر اپنے ساتھ لیا، سلم اوٹ لک کے مصارف طبع و اشاعت کا سارا بار اٹھایا

مسلم اوبٹ لک پر کم و بیش ۲۰ پونڈ فی ہفتہ کا خرچ تھا اور کبھی حجم بڑھ جاتا تو ۲۵-۳۰ سے ۴۰-۵۰ پونڈ تک خرچ ہو جاتے تھے اور تقریباً چھ سات چھپے اس خرچ کے ساتھ ہم لوگوں نے اس کو نکالا۔

ڈیلی ہیرلڈ یا فارن ایفیرس میں ہمارے مضامین اور اعتراضات کے جوابات چھپتے تھے، اشتہارات نکلتے تھے، ڈیلی ہیرلڈ کے نصف کالم سے بھی کم کے اشتہار کئے ۵۰ پونڈ نیپڈتے تھے، فارن ایفیرس کا ایک خاص خلافت نمبر نکلا یا تھا اس کو ۱۰۰ پونڈ دے، شاید ہندوستان میں ہمارے اجاب اس کو بہت زیادہ رقم خیال کریں گے لیکن اسی کے مقابل میں جب ارمنی اور یونانی اشاعت (پبلیکیشن) اشتہار اور پروپیگنڈے کے مصارف کو آپ دیکھتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ ان کے لاکھوں کا ہم ہزاروں سے اور ان کے ہزاروں کا ہم سیکڑوں سے مقابلہ کر رہے تھے۔

یورپ میں پروپیگنڈے کی ایک عام صورت مضمون نگاروں نامہ نگاروں اور خبر نویسوں کی خاطر مدارات اور میزبانی ہے، کسی بڑی اہم آمد پر اسٹیشن پر اترنے کے ساتھ نامہ نگاروں، انٹرویو کرنے والے اور فوٹو گرافروں کا اثروہام ہو جاتا ہے پھر آپ اپنی خواہش اور انتخاب کے مطابق مختلف بڑے بڑے اخبارات کے ایڈیٹروں نامہ نگاروں، خبر نویسوں کو دعوت دیں گے اور اپنے معاملہ کے متعلق گفتگو کریں گے یا ان کو انٹرویو میں اپنا بیان لکھائیں گے اور اس خالص علمی و سیاسی خدمت کے لئے کچھ نہ کچھ اعزازی خرچ، آپ پر واجب ہوگا، دو چار اخبارات کے وقائع نویسوں کو اپنے ساتھ لگائے رکھنا پڑے گا جو وقت بوقت آپ کے کاموں کے متعلق اخبارات میں خبریں چھپوا دیا کریں، ایک دو اخبارات کے شیر خرید کر کے ان کا حصہ دار

بنائے گا کہ یہ اعزازی معاوضہ کی صورت ہو۔

غرض یورپ کی اقتصادی تجارت کے علاوہ یہ سیاسی تجارت بھی کچھ کم آمدنی کا ذریعہ نہیں اور غریب مشرقی و فندول کو ان کی اعانت طلبی سے چارہ نہیں۔

ہمارے جانے سے پہلے سر آغا خاں، مشرک ایچ ایم، اصفہانی اور شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی نے لندن اور پیرس میں اسلامک انفارمیشن بیورو قائم کر لے تھے اور ان کے لئے کچھ رقم بھی جمع کی تھی مگر جب ہمارا وفد پہنچا تو یہ دونوں بیورو تقریباً دیوالیہ ہو چکے تھے، فرانس کے مسلم بیورو کے صدر شریف پاشا تھے جو مالدار آدمی تھے مگر وہ کنارہ کش ہو گئے تھے، چونکہ ان دونوں بیوروں نے حقیقت میں بہت کام انجام دے تھے، اور بے سہ تھے اور بے سکتے تھے، اس لئے ان کی امداد لازم تھی، لندن بیورو کے ہفتہ وار اخبار، سلم اوٹ لک کی چھپائی اور اشاعت کا تمام بار ہمارے سر رہا۔ پیرس اسلامک بیورو اور اس کے پانزدہ روزہ اخبار ”ایکودی اسلام“ (صدائے اسلام) کے بیشتر مصارف و فدا خلافت کے سرمایے سے ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ چلتے ہوئے بھی ڈاکٹر رشاد (ڈائریکٹر ایکودی اسلام) کو اس کے لئے کچھ کئے آنا ضروری تھا۔

اس کے علاوہ انگریزی اور فرنچ زبانوں میں رسائل اور مضامین کے طبع و اشاعت کا سلسلہ تھا اہم مضامین خلافت، اسلامی ممالک کی کیفیت، سرنامہ اور تھریس کے مظالم کی رودادیں اور مردم شماری، جلسوں کی تقریریں اور ہندوستانی جلسوں کی رودادیں، پمفلٹ اور رسالوں کی صورت میں چھپوا کر اخبارات میں درباب سیاست کے پاس پارلیمنٹ کے ممبروں کی خدمت میں بھیجے جاتے تھے اور لوگوں

میں تقسیم کئے جاتے تھے۔

ڈنر | یورپ کے کاروبار زندگی میں فرصت کے اوقات بہت کم ہیں، رات کے کھانے کے بعد جو وقت ہو وہ کھیل تماشوں کے لئے مخصوص ہے، وہاں اہم معاملات پر گفتگو اور مطمئن ملاقات کا وقت صرف رات کے کھانے (ڈنر) کا وقت ہے۔ اس وقت کا کھانا وہ لوگ بہت دیر میں وقفہ کے ساتھ اور بہت ٹھہر کر کھاتے ہیں۔ یہ کھانا عموماً اجباب اور اعزہ کے لطف صحبت اور پرنداق گفتگوؤں کے درمیان میں ڈیڑھ دو گھنٹے میں ختم ہوتا ہے، تمام یورپ میں ابھی گفتگو ملاقات اور مبادلہ خیالات کا یہی بہترین وقت ہے، جو لوگ کسی سے مطمئن ملاقات کرنا چاہتے ہیں وہ عموماً اس کو اسی موقع پر آنے کی تکلیف دیتے ہیں۔

اسی بنا پر تبلیغ و اشاعت کی عام صورت یہ ہے کہ اہم اشخاص اور جماعتوں کو شام کے کھانے (ڈنر) پر بلایا جائے اور میز پر بیٹھ کر اپنے معاملہ پر ان سے مشورہ گفتگو اور مبادلہ خیال کیا جائے، ہم لوگوں کو بھی اس سے کام لینا پڑا، بہت کم ہفتے ایسے گزرتے تھے کہ جس میں ایک یا چند اشخاص کو ڈنر دینا نہ پڑتا تھا، کہ اس کے سوا ان سے گفتگو اور مبادلہ خیال کی کوئی صورت نہ تھی اور اس پر بھی ان کا احسان ہوتا تھا کہ وہ اس کو قبول کرتے تھے، کبھی پارلیمنٹ کے میزوں کو کبھی لیبر پارٹی کے میزوں کو کبھی اخبار کے نامہ نگار کو کبھی یونیورسٹی کے پروفیسروں کو، کبھی ارباب سیاست کو ڈنر پر مدعو کرنا ہوتا تھا اور باتوں باتوں میں ان کو اپنا مقدمہ سمجھایا جاتا تھا، ان کے شکوک کو دور کیا جاتا تھا اور اپنی حمایت و اعانت کے لئے ان کو آمادہ کیا جاتا تھا۔

اس قسم کے اخراجات پیرس میں زیادہ پیش آئے۔ وہاں ایک دفعہ ۲۰ یا ۲۵ آدمیوں

کو یعنی پیرس میں جس قدر ترکوں کے حامی یا مشرقی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے تھے، سب کو مدعو کیا اور کھانے کے بعد حمایت اسلام کی ایک نئی مجلس کی بنیاد ڈالی گئی اس کے بعد روزانہ ایک ایک شعبہ کے اکابر کو بلا کر دعوت دی گئی اور ان کو کھانے کی میز پر بٹھا کر اپنا مقدمہ سمجھایا گیا اور ان کو اپنا ہمدرد بنایا گیا۔

ان لوگوں کے علاوہ پیرس اور اٹلی میں ترکوں، عربوں، مصریوں، ایرانیوں، روسی مسلمانوں، یونانیوں، البانیوں وغیرہ کی بڑی جماعت تھی ان کے تعارف حاصل کرنے کے لئے اور ان کو ہم آہنگ بنانے کے لئے اور ان ممالک کے مسلمانوں سے ہندوستان کا رشتہ اتحاد جوڑنے کے لئے ان کو وقتاً فوقتاً میز پر کیا کرنا پڑتا تھا اور ان میں اپنے کام کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ اس ذریعہ سے ممالک اسلامیہ میں سلسلہ خلافت اور ہندوستان کے کارناموں کی اہمیت سمجھانے میں بڑی مدد ملی اور اس اتحاد اسلامی کے سنگ بنیاد قائم کرنے کا بہترین موقع میسر آیا جس سے بڑی بڑی امیدیں اور توقعات قائم ہیں۔ سعد پاشا زاعلول کے مصری وفد اور حجازی عربوں کے ڈیلیگیشن اور ترکی وفد کو اپنے ہاں کئی دفعہ بلایا۔ اٹلی میں ترکوں، مصریوں اور طرابلسیوں کو ڈروئے۔

العرض اس تمام تفصیل سے یہ معلوم ہو گا کہ وہاں کام کا بڑا ذریعہ لیکن گراں ذریعہ ڈنر اور دعوت ہے، اسی لئے آپ کو وفد کے حسابات کی تمام مددوں میں سے اس میں سب سے زیادہ رقم نظر آئے گی اور دفتر خلافت میں ہونٹوں کے حسابات کے بل اور رسیدیں ملیں گی جن میں سے کھانے کے حساب پر جہاں زیادہ صرف ہوا ہو محمد علی صاحب کے خود اپنے قلم سے وجہ زیادتی اور تعدد واسلے مہمانان کی تفصیل لکھی

راہنہ بول کر ایہ مکان و مہول و ترغقات (و دعائی جماعت) نوکروں کی تنخواہ، ہونٹوں کی ٹپ و ضروریات اتفاقی ارکان و غیرہ

ملے گی۔

مقامات سفر | جہاز ریل اور سواری کی گاڑیوں کی گرانی کرایہ کے واقعات ہم ادھر لکھ چکے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارا سفر صرف بمبئی سے لندن اور لندن سے بمبئی تک محدود نہیں ہے، ہم کو اغراض خلافت، وزیر اور مدیرین کی ملاقات جلسوں میں تقریریں کرنے اور اہم ترک و عرب اشخاص سے ملنے کے لئے انگلستان، فرانس سویزرلینڈ اور اٹلی کا پورا دورہ کرنا پڑتا ہے۔ انگلستان سے فرانس اور فرانس سے انگلستان، ہم کو بونچ دفعہ آمد و رفت کے دس بھیرے، آنا جانا پڑا۔ انگلستان میں دو گنگ کیمرج، آکسفورڈ، اڈنبرا، سوئٹز، ہانچسٹر، اسکا ربرو، گلاسگو، کارڈف میں جا جا کر جلسوں کو خطاب کیا، اٹلی میں روم پوسے، نیپلز، غالب کمال ہے۔ اور میلان امیر فیصل سے ملنے کے لئے گئے۔ سویزرلینڈ میں جنیوا کی تیسری سٹیٹ کانفرنس میں شرکت کی اور طریقے جا کر جلا وطن ترک و عرب و مصری احرار اسلام سے جا کر ملاقات کی۔

مصارف کی کل میزان | حسابات میں مصارف کی تہم مدیں دی ہوئی ہیں اور ہر ایک مد کی علیحدہ علیحدہ میزان بھی ہے۔ مرکزی دفتر خلافت سے وفد خلافت کو شروع آخر تک کل ایک لاکھ پچیس ہزار آٹھ سو چالیس و بیستین پائی مختلف تاریخوں میں دے گئے اور علاوہ ازیں دوسرے اتفاقی ذرائع امداد سے چار ہزار چار سو کو بیس سات آنے و پائی ولایت میں ملے، کل ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے قریب یہ رقم پہنچی ہے۔ اس میں سے بیس ہزار تین سو پچانوے سترمانڈ کے تھے جو غالب کمال بے وسیر ترکی متعین اٹلی، کے حوالے کئے گئے اور پندرہ ہزار دو سو چھیانوے ڈیڑھ ہیر لٹ

اخبار کے حصہ کی خریدار میں خرچ ہوئے۔ باقی تقریباً ۱۷،۰۰۰ ۳۴۷۰۰۰ روپے کو واپس کئے گئے ۲۹۲ روپیہ ابوالقاسم صاحب اور حسین صاحب کے ذمہ تھیں فند کے سفر، قیام، طعام، اور کاموں پر صرف ہوئے یہ سو لاکھ کے قریب روپے جو آٹھ ہینے کے انگلستان، فرانس، مصارف کا موازنہ | سویٹزرلینڈ، اٹلی کے گراہ جہاز زوریل، سفر، قیام، طعام، تبلیغ و اشاعت و طباعت و انعقاد مجالس مسعودیہ مصائب و مہانداری و میرانی وغیرہ میں صرف ہوئے، ان کی یکجائی رقم شاید بعض حضرات جن کو یورپ کے وفود کے کاموں کا تخیل، (آئیڈیا) نہیں شاید اندازہ سے زیادہ سمجھیں، لیکن ہندوستان سے جن سیاسی وفود نے چند گزشتہ سالوں میں اسی قسم کے کاموں کی خاطر صرف انگلستان تک کا سفر کیا ہے ان کے اخراجات کی مجموعی رقم بھی اسی کے لگ بھگ ہے، اسی زمانے میں جو صریح قومی و قدیورپ میں کام کر رہا تھا وہ کم از کم ۱۴ ہزار پونڈ دو لاکھ دس ہزار روپے کے کرپورپ گیا تھا۔

تفصیل کے مدخج | مولنا سید سلیمان صاحب نے آخر میں آمد و خرچ کی تفصیل بھی ایزاد کر دی ہے اپنی اہمیت کے لحاظ سے وہ بھی اس قابل ہے کہ پیش نظر رہے۔

”مجلس مرکز خلافت ہند کے اجلاس مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء منعقدہ دہلی میں مولنا محمد علی صاحب کے وفد انگلستان کے حسابات مع اوڈیٹر کے سرٹیفیکٹ کے پیش ہوئے مجلس مرکزی نے ان حسابات کو بالاتفاق منظور کر کے شائع کرنے کی اجازت دی۔ اخراجات و فدیہ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ مولنا محمد علی صاحب نے جملہ مصارف میں کفایت شعاری کو مدنظر رکھا و فدا کا کل خرچ سینے پڑھ ہزار روپیہ کے قریب ہے و قدیورپ چھ اصحاب تھے جو نہ مینے یورپ کے مختلف ممالک میں مسلمانان ہند کے جذبات

کی ترجیحی کرتے رہے اگر ان کے اخراجات کا مقابلہ اس وفد کے اخراجات سے کیا جائے جو گورنمنٹ کی دعوت پر علیجناب سیٹھ چھوٹانی صاحب کی سرکردگی میں گیا تھا تو آسانی سے اس امر کا احساس ہو جائے گا کہ مولانا کے وفد پر کم سے کم خرچ ہوا ہے۔ سیٹھ صاحب کے وفد میں بھی چھ صاحب تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے آغا خاں اور سیٹھ صاحب نے گورنمنٹ سے اپنا خرچ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ مسٹر حن امام صاحب، علیجناب ڈاکٹر انصاری صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب نے اپنے اخراجات بل پیش کئے۔ ان حضرات کے قیام انگلستان کے زمانے کا بیس پونڈ روزانہ الاؤنس بل میں لکھا تھا لیکن حکومت ہند نے صرف دس پونڈ روزانہ منظور کیا، اس پر مسٹر حن امام نے روپیہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب و قاضی عبدالغفار نے منظور کر لیا اور اس حساب سے ان کو دس دس ہزار روپیہ وصول ہوا۔

ان اعداد سے ظاہر ہے کہ مولانا محمد علی صاحب کے وفد پر فی کس گیارہ ہزار روپیہ خرچ ہوا اور مسٹر حن امام کے وفد پر فی کس دس ہزار روپیہ لیکن مولانا مدوح کا وفد نو ہزار یورپ میں رہا اور مسٹر حن امام کا وفد صرف ڈھائی ماہ انگلستان میں رہا۔ اس حساب سے مولانا کے وفد کے مقابلہ میں گورنمنٹ کے بھیجے ہوئے وفد کے اخراجات تین گنے ہوئے ان اعداد کو مدنظر رکھے ہوئے ان لوگوں کے خیالات پر حیرت ہوتی ہے جو مولانا محمد علی صاحب پر فضول خرچی کا الزام عائد کرتے ہیں۔

تبصرہ | مولانا سلیمان ندوی کے بیان کے اہم اور قابل ذکر حصص آپ کے سامنے پیش کئے جا چکے ہیں، ان پر کسی مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں

وفد خلافت یورپ کی ”فضول خرچیوں“ کے تعلق طرح طرح کی تاویلیں ”مشہور ہیں اور بہت

ادعا کے ساتھ بعض حلقوں سے یہ آواز بلند ہوئی اور حسب ضرورت اب بھی کبھی کبھی بلند ہو جاتی ہے کہ یورپ میں ”گھچھڑے“ اڑائے گئے، مسلمانوں کا رویہ بے دریغ صرف کیا گیا اور اس کا ذرا لحاظ نہ کیا گیا کہ یہ رویہ ایک غریب و نادار قوم کی جیبوں سے نکل کر آیا ہے، لیکن اس مفصل جواب سے یقیناً ^{یقیناً} مسانین کے علاوہ ان تمام حضرات کو تشفی ہو جائے گی جو واقعی اپنے دل میں کسی قسم کا شبہہ رکھتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے زیادہ حزم و احتیاط اور دیانت و امانت کا کیا خوبت دیا جاسکتا ہے جس کی تفصیل صفحات بالا میں گزر چکی ہے۔

حقیقت یہ کہ جہاں ہماری قوم میں بہت زیادہ محامد و محاسن ہیں وہاں سب سے بڑی خصوصیت خاصہ اس کا بلکہ تنقید ہے، مسلمانوں نے اپنے زعماء پر، مخلص قائدین پر، ایشیا پریشہ رہتاؤں پر جس بے دردی، سنگدلی اور شقاوت کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے، تنقید و تبصرہ کیا، سزاؤں اور بالآخر ان کے قوائے عمل کو مفلوج کر دیا ہے اور پھر آنسو بھائے ہیں، اس کی مثال شاید ہی کوئی اور قوم پیش کر سکے

اسی وفد کے معاملہ میں ارکان وفد کے ایشار، جذبہ خدمت، استقامت علی الحق، ثبات قدم، محنت و مستعدی اور ”ترک فرزند و زن“ کی داد کسی نے بھی نہ دی، لیکن حساب چرچنے کے لئے ہر شخص آما وہ تھا اور عدم اطمینان کی صورت میں قلم اس کے ہاتھ میں تھا، اخبارات کے کالم کھلے ہوئے تھے اور دیکھتے دیکھتے بڑے بڑے ”سنسی خیر اکشاف“ ہونے لگتے تھے، بہر حال اس موضوع پر مزید تفصیل سے گفتگو کرنے کا یہ محل نہیں ہے، اس لئے صرف اسی بیان پر اکتفا کی جاتی ہے۔

بہر حال محمد علی نے یقیناً برطانوی سیاست سے متعلق غیر ضروری جن ظن سے کام لیا، لیکن شاید ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ ”دروغ گورانا بہ خانہ باید رسید“ پر عمل کریں اور اس پر عمل کر کے

بالآخر وہ سب کچھ انھوں نے کیا جس کی ان جیسے جبری اور پختہ دماغ قائد اسلام سے توقع تھی۔

واپسی | بالآخر پورے آٹھ ماہ تک یورپ کا دورہ کر کے محمد علی ہندوستان واپس آئے۔

استقبال | بمبئی میں ارکان وفد خلافت کا نہایت شاندار اور قابل رشک طریقہ پر استقبال ہوا

اس عرصہ میں ہندوستان کی فضا اور زیادہ بدل چکی تھی اور گورنمنٹ برطانیہ کے خلاف حقارت و

نفرت کے جذبات پوری شدت کے ساتھ برانگیختہ ہو چکے تھے اور مسلمانوں میں ایک عام احساس پیدا

ہو گیا تھا، ایسا نقیذ المثال کہ پھر کبھی ہندوستان کی تاریخ میں وہ نمونہ دیکھے نہیں آئے اگر جوش و

خروش کے بہت سے مظاہرے آنکھوں نے دیکھے۔

ناکامی کا اثر | وفد کی ناکام مراجعت نے مسلمانوں میں اور زیادہ اشتعال پیدا کر دیا اور

اب ان کے لئے اس کی کوئی صورت باقی نہ رہی کہ وہ ایسی گورنمنٹ سے تعاون کر سکیں جس

نے پیہم وعدہ خلافیاں کیں، خلافت ورزیاں کیں، مسلمانوں کو مغالطہ میں ڈالنا، ان کو فریب دینا، اور

جب ایسا وعدہ کا وقت آیا تو ایک اولے و لنوازی کے ساتھ معاملہ ہی کو سرے سے مٹانے کی کوشش کی گئی۔

مقاطعہ | اب مقاطعہ کی تحریک پوری شدت کے ساتھ جاری ہو چکی تھی، اسکول خالی ہو رہے

تھے، کالج کے طلبہ اسٹرائک کر رہے تھے، یونیورسٹی کے ”اسکالر“ یونیورسٹی پر لعنت بھیج رہے تھے۔

سرکاری ملازمین دھڑا دھڑا استعفیائے سہے تھے، بڑی بڑی آسیاں اس خندہ پیشانی

سے چھوڑتے تھے گویا بہت بڑی نعمت غظمی پا گئے۔ خان بہادروں نے اپنے خطابات واپس کئے

غافل صاحبوں نے اپنے خطابات اس کے، حافظ الملک اور دوسرے ”سرس“ نے اپنے خطابات اس کے

اور بڑے بڑے حامی تعاون ہر گروں نے گورنمنٹ سے تعاون کا ہاتھ کھینچ لیا۔

لیکن اسی زمانہ میں چشم حیرت نے یہ تماشہ بھی دیکھا کہ کوئی خطاب واپس کر کے مسلمانوں کا

سرتاج بنا اور کوئی آستانہ حکومت پر ”سر“ ہو گیا! اللہ سے سرکار کے اقبال،

باب

جامعہ ملیہ

محمد علی کے کا زمانہ ہائے حیات کا ایک روشن ترین پہلو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تائیس ہجری۔ وفد خلافت جب یورپ سے ناکام و نامراد واپس آیا تو ہندوستان میں ترک تعاون اور ترک موالات کے الفاظ ہر ہندوستانی کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔

علماء کرام بھی ایک عرصہ کے جمود و تعطل کے بعد میدان عمل میں اتر آئے تھے اور نہایت جانبازی اور اخلاص کے ساتھ گورنمنٹ کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔

علی گڑھ کو دعوت خیر | سب سے پہلے محمد علی نے اپنے علیگڑھ کالج کو جس سے انھیں محبت تھی اور جس کی تعمیر و استحکام میں وہ نہایت نمایاں حصہ لے چکے تھے، دعوت الی الخیر دی اور بتایا کہ گورنمنٹ کا مسلمانوں کے ساتھ کیا طرز عمل ہے۔ مسلمانوں نے اب ہندوستان میں رہنے کے لئے کیا وسائل اختیار کئے ہیں، اسلامی ہند کس اضطراب و اضطراب کے عالم میں ہے اور اسلامیان ہند نے اس نازک وقت میں اپنی شاہراہ عمل کیا تجویز کی ہے، علیگڑھ جو مسلمانوں کی آرزوؤں کا منظر اور ان کی دیرینہ تباہی کی تعبیر ہے، اسے اس وقت مذہب کی پکار پر سرکفت میدان عمل میں اتر آنا چاہئے اس کی نظر قبل کی مصلحت شناسیوں کی طرف نہ ہونی چاہئے، بلکہ حال کی روح فرسا، بہت شکن اور دل و دماغ کو بچھین کرنے والی کیفیت پر ہونی چاہئے، علیگڑھ کے طلبہ اسلام کے سپاہی ہیں، بگل بچ چکا ہے جنگ بھی شروع ہو چکی ہے۔ پھر وہ کیوں مست خواب خرگوش ہیں؟

اس پیام حق و صداقت کا علیگڑھ کے طلبہ پر تو ایک حد تک ضرور اثر ہوا، مگر حکام علیگڑھ

خداوندان علیگڑھ اور ارباب علیگڑھ اس ضرورت کے منکر تھے، مسلمان اپنا ہاتھ تعاون سے کھینچ کر تھے اور علیگڑھ کے ارباب حل و عقد اپنا دست طلب گورنمنٹ ہی کی طرف دراز کر رہے تھے اور وہ ہنگامہ ختم ہو گیا اور بعد کو یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ اپنے قرطبہ اور غرناطہ کے نقش ثانی سے علی زینگی میں کس قسم کی توقعات قائم کیا جاسکتی ہیں اور اسلام کا درد ان کے دل میں کہاں تک موجود ہے؟

کورٹ میں تقریر | سب سے پہلے محمد علی اپنے رفقاء کار و ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجل خاں وغیرہ کے ساتھ کورٹ کے اجلاس میں شریک ہوئے اور اس کے ممبروں کو دعوت الی الخیر دی اور اپنی امید ظاہر کی کہ اسلام کے اس نازک وقت میں آپ لوگ جو مسلمانوں کے بھی ناخدا ہیں، اپنی جرات و ہمت سے مسلمانوں کی پیشوائی فرمائیں گے اور گورنمنٹ سے جو سرکاری تعلق علی گڑھ کو ہی اسے منقطع فرمائیں گے۔

کورٹ میں اس وقت مخالف اثرات پورے طور سے کام کر رہے تھے، چانسلر، وائس چانسلر پرووائس چانسلر، سبھی مخالف تھے اور کسی طرح اس تجویز پر غور کرنے پر بھی آمادہ نہیں تھے اور اسے بالکل نامنظور کر دینے پر تامل ہوئے تھے۔

نتیجہ | چنانچہ وہی ہوا جس کی توقع تھی، یعنی ان رہنمایان اسلام کے پیغام عمل کو ٹھکرا دیا گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجل خاں جیسے عظیم المرتبت ملامت کا دوٹ | رہنماؤں پر ملامت کی تجویز بھی پاس کر دی گئی کہ ان رہنماؤں نے اسلام علیگڑھ جیسے سدا بہار گلشن تعلیم پر درخشاں کو دعوت دی! سنرا بھی کتنی معقول تجویز ہوئی؟

اس طرف سے مایوس ہو کر اب سوا اس کے کوئی اور چارہ کار باقی نہ رہ گیا تھا کہ طلبہ کو باقاعدہ اور براہ راست دعوت الی الخیر دی جائے، کامیابی کی ایک ہلکی سی امید یہ بھی تھی!

یونین میں تقریر | چنانچہ ہر طرح سے طلبہ کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد کر کے پرائیویٹ صحبتوں میں

نصیحت کر کے اور جامع مسجد کے جلسوں میں وعظ کہہ کہے انھیں آمادہ کیا کہ اسلام کا سب سے زیادہ نازک وقت یہی ہے، اٹھو اور میدانِ عمل میں آؤ کہ اس وقت اسلام کو سرفروش سپاہیوں کی ضرورت ہے، تمہاری تعلیم، تربیت اور نشوونما اس لئے اور صرف اس لئے ہوئی تھی کہ تم جب اسلام پر کئی وقت پڑے تو مردانہ وار میدانِ عمل میں اتر آؤ، نہ اس لئے کہ اپنی بہت بارود اور اغیار کو طعن و تشنیع اور مسخر و استہزار کا موقعہ دو مسلمانوں کی شان اس سے ارفع ہے!

بقرہ محمد علی نے اپنی پوری سحر کاریوں کے ساتھ علیگڑھ کالج کی یونین میں کی، پھر دوسرے زعماء اور مولانا شوکت علی صاحب نے بھی ایک دروانگیز تقریر کی۔ اس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ یونین کے وائس پریذیڈنٹ (ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ) جو اس خیال سے آئے تھے کہ اس تعلیمی مقام کی مخالفت کریں گے، پورے طور سے مسخر ہو گئے اور انھوں نے بھی ایک دلورہ انگیز تقریر کی اور پورے طور سے آمادگی کا اظہار کیا۔

عمل کا وقت | لیکن جب عمل کا وقت آیا اور یہ سوال سامنے آیا کہ اب علیگڑھ کو چھوڑ دو تو پھر اس موردِ بلخ میں بہت کمی ہو چکی تھی لیکن الحمد للہ کہ ایک جماعت اپنے عزم و عقیدہ پر استقلال سے جی رہی اور نہایت استقامت سے جامعہ ملیہ کی تعمیر اور استحکام میں رکن رکن ثابت ہوئی۔
اولڈ بوائز لاج میں قیام | علیگڑھ کی اس نخلص جماعت کو لے کر محمد علی اولڈ بوائز لاج میں مقیم ہو گئے، اس لئے کہ اولڈ بوائز لاج پر کالج کا قبضہ نہیں تھا اور وہ محض اولڈ بوائز کی تھی اور محمد علی اور ان کے برادر بزرگ مولانا شوکت علی صاحب کی انتھک کوششوں اور پیہم اور لگاؤ کا رجب و جد کا نتیجہ!

نکل جاؤ | لیکن یہاں بھی امن و سکون کے ساتھ ان علمبردارانِ صداقت کو بیٹھا نصیب نہ ہوا کالج کے حکام نے ان سرکش باغیوں کو حکم دیا کہ اولڈ بوائز لاج خالی کر دو اور یہاں سے نکل جاؤ

جواب میں عرض کیا گیا کہ اولڈ بوائز لاج پر تو سرکار علیگڑھ کا کوئی تصرف ہی نہیں، وہ اولڈ بوائز کی ملکیت ہی، انھیں کو اس پر تصرف کا حق حاصل ہی اور وہی اس پر قبضہ رکھ سکتے ہیں، انھیں کھانز کا حکم آپ کے قبضہ قدرت سے باہر ہے۔

حاکمانہ انداز میں ارشاد کیا گیا کہ اولڈ بوائز لاج کالج کے حدود میں واقع ہے اور چونکہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تم علی گڑھ کے باغی اور سرکش ہو، نیز اپنے ساتھ بغاوت اور سرکشی کے بہت سے جرائم بھی لائے ہو، اور اتہائی میا کی سے تم نے انھیں کالج کی فضا میں چھوڑ بھی دیا ہے اور ان کی اس ”ربانی“ کے بڑے آثار بھی ظاہر ہو رہے ہیں اس لئے ”تحفظ امن عامہ“ کے قانون کے مطابق حکم دیا جاتا ہے کہ فوراً اولڈ بوائز لاج کو خالی کر دو۔“

انکار | لیکن یہ نشہ کہیں ان ترشٹیوں سے اتر سکتا تھا، ادب و التجا کے ساتھ عرض کر دیا گیا کہ فرماں جہاں پناہی سر آنکھوں پر مگر تعمیل سے معذوری ہے۔

اس انکار اور اس فرد کا ارباب علیگڑھ نے جواب یہ دیا کہ ہشتی کو حکم ہوا کہ پانی کا ایک قطرہ اولڈ بوائز لاج میں نہ جانے پائے، لائٹ کیپر کو حکم ہوا کہ ایک بلب اولڈ بوائز میں نہ جلے پائے دھوبی کو تہدید کی گئی کہ خبردار جو ادھر کے لوگوں کا ایک کیڑا بھی گھاٹ پر لے گیا، خاک و دب کو بلا کر یہ ہدایت کی گئی کہ اولڈ بوائز لاج کو بلبہ بنا ہونے سے اور کسی چیز میں ہاتھ نہ لگائے۔

لیکن یہ لوگ اتنے سخت جان تھے کہ اندھیرے میں ہے، ”ڈانگ ہال“ سے خارج ہوئے، دھوبی اور ہشتی کے اتنا عی احکام سنے، مگر ٹس سے مس نہ ہوئے اور نہ اپنے چشم دابر سے ظاہر ہونے دیا کہ وہ ان شائد سے کچھ بھی متاثر ہیں! کتنی عجیب بات تھی؟

پولیس کا داخلہ | دو ایک روز تک حکام کالج ہوا کا رخ دیکھتے رہے اور اس کے متوقع رہے کہ شاید یہ لوگ خود ان شائد کی تاب نہ لا کر راہ فرار اختیار کریں اس لئے کہ اس کے تمام ضروری

انظامات مکمل کر دے گئے تھے۔

لیکن جب اس کا بھی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا تو پھر پولیس سے استمداد کی گئی کہ وہی باغیوں کے اس قلعہ کا محاصرہ کرے اور انھیں شکست فاش دے۔

پولیس اپنی پوری شان جبروت و جلال کے ساتھ آئی، ڈنڈوں اور ٹنگینوں کے ساتھ آئی، بندو قوں اور سپتولوں کو لے کر آگے بڑھی!

حکم ہوا کہ اولڈ بوائز لالچ خالی کر دو، نیاز مندوں نے اس فرمان خسروی پر تسلیم کر دیا۔ باغیوں کا سردار محمد علی آگے آگے تھا اور عقیدہ مندوں اور جہاں نثاروں کی فوج پیچھے ہٹ چکی اور پولیس کے ڈنڈے باز اور مسلح دستے ارد گرد اپنے جلو میں انھیں لئے ہوئے تھے کتنا عجیب و غریب منظر چشم فلک نے دیکھا ہو گا کہ کل تک جہاں عزت و عظمت بیٹوانی کے لئے موجود، نعرہ ہائے تحمیں اور غلغلہ مسرت استقبال کے لئے حاضر، چشم عقیدت، محبت و اہلت سے لبریز۔

آج وہیں سے کشاں کشاں، پولیس کے جلو میں ویس نکالا دیا جا رہا ہے اور اتنی مجال نہیں کہ اپنے گلشن میں ایک سانس بھی لے سکیں، آہ!

قیام بلبل مجبور رحم باغبان تک سہ!

صغر صاحب کا بیان | جسٹس سر وزیر حسن کے برادر اصغر حسن کا کسی موقع پر ذکر ہو چکا ہے وہ اس وقت وہیں موجود تھے، اور قاصد صلح بن کر محمد علی کے پاس گئے تھے کہ محمد علی کو ”صراطِ مستقیم“ پر لاسکیں، ذیل میں ان کے بیان کا ایک حصہ درج ہے، اس سے نفس معاملہ پر کچھ روشنی پڑتی ہے، نیز محمد علی کے بلند کردار اور بلند تر عزم اور اس سے بھی زیادہ دوستوں اور رفیقوں سے بڑا دکا ایک ہکا سا خاکہ بھی نظر کے سامنے آ جاتا ہے، صغر صاحب فرماتے ہیں:

”آخری موقعہ جو ملاقات کا ہوا تھا اس کا دل پر ناقابل محو نقش ہے، نومبر سن ۱۹۴۷ء میں جب علی گڑھ کالج کو قومی ادارہ کرنے کا ہنگامہ علی گڑھ میں ہوا تھا جو محمد علی کاظمی نظر تھا اس وقت ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے مجھ کو اور سید جاد حیدر صاحب کو مرحوم کے گفتگو کرنے کے لئے بھیجا تھا، باوجود اس کے کہ مرحوم نہایت پر جوش جذبات کے شخص تھے ہم لوگوں کے ساتھ اس قدر لطف اور محبت کے ساتھ گفتگو کی کہ باوجود اختلاف رائے کے پرانی صحبتوں کا لطف تازہ ہو گیا، رات زیادہ ہو گئی تھی جب ہم لوگ اولڈ بوائز لاج سے جہاں مرحوم مقیم تھے اپنی جائے قیام پر جانے لگے تو مرحوم نے کہا اصغر! تمہاری ملاقات سے سیری نہیں ہوئی ہے، صبح آکر میرے ساتھ چائے پو تو ملاقات اور گفتگو ہوگی۔

اس کی صبح والا وہ دن تھا جبکہ ان کے اوپر پولیس کا پہرہ ہو گیا تھا اور اس کے ذریعہ سے وہ وہاں سے ہٹائے جا رہے تھے، مجھ کو آتا دیکھ کر دور سے کہا، اصغر تم میرے پاس نہ آؤ، تمہاری بہبودی بوجہ تمہارے ملازم گورنمنٹ ہونے کے اسی میں ہے، یہ الفاظ آبدیدہ ہو کر کہے گئے تھے۔“

۱۔ خیام میں قیام | اولڈ بوائز لاج سے اس شاندار انداز میں پاپائی اٹھا کر محمد علی آگے بڑھے اور یونیورسٹی کے حدود سے تھوڑی ہی دور آگے چند خیمے نصب کر لئے اور وہیں جم کر بیٹھ گئے درختوں کے نیچے تعلیم ہوتی تھی، چٹائیوں پر نشست ہوتی تھی۔

نہ کلاس روم تھے نہ لیو بڑی نہ ہال تھا نہ گراؤنڈ، نہ روپیہ تھا نہ پیسہ مگر استقامت تھی اس لئے اس بے سرو سامانی میں بھی بڑے بڑے فزے تھے، اس فقر و فاقہ کے عالم میں بھی عجیب کیف تھا اور اس بورینہ نشینی میں مسند زکرا و زنگار کا لطف تھا۔

کیا زمانہ تھا، شیخ الہند بانی، محمد علی پرنسپل، تصدق احمد خاں شروانی، رجسٹرار، اور جامعہ کا قیام! بعد کے انتظامات | کچھ عرصہ کے بعد بیرون علی گڑھ سے بھی طلبہ اسٹرانک کر کر کے، اپنے کالج چھوڑ چھوڑ کے جامعہ میں آنے لگے تو خیمے ناکافی ہوئے اور پاس ہی چند کوٹھیاں کرائے پر لیں اور اس طرح طلبہ کے قیام میں نسبتہ سہولت پیدا ہو گئی۔

محمد علی کی ”پرنسپل شپ“ | جن خوش قسمت لوگوں نے اس زمانہ میں تعلیم حاصل کی ہر دہائی کی اگر اپنے زمانہ کے بالخصوص محمد علی کے زمانہ پرنسپل کے حالات بیان کرتے ہیں تو عجیب کیفیت بنتی ہے۔ علمی حیثیت سے محمد علی کا جو پایہ تھا اسے ایک دنیا جانتی ہے، اس تحریک کے زمانہ میں ان پر مذہب کا رنگ بہت غالب تھا، اس لئے مذہب کے اوپر زیادہ تر ان کی تقریریں ہوا کرتی تھیں۔

راویوں کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں محمد علی صبح آٹھ بجے تشریف لاتے تھے اور تقریر کرنا، دہری کلاسز کے سامنے شروع کرتے تھے، تقریر کیا ہوتی تھی اسلام کے متعلق بیش بہا معلومات کا ایک خزانہ ہوتی تھی، اور بعض بعض دن ایسے بھی آئے ہیں کہ ۱۲ بجے تک مسلسل انھوں نے اسلامیات پر اپنا لیکچر دیا ہے، پھر کھانا وغیرہ کھا کے، نماز پڑھ کے اپنا لیکچر شروع کیا، عصر کا وقت ہو گیا عصر کے بعد پھر تقریر شروع ہوئی اور مغرب کے وقت کہیں جا کر آئے!

جامعہ ملیہ کی اسکیم | محمد علی نے باوجود اپنے گونا گوں کثیر مشاغل کے اور پھر سنہ ۱۹۰۲ء کی شغولیت کا کیا عالم ہو گا، جامعہ ملیہ پر ایک مختصر سی اسکیم شائع کی تھی، اس میں مقاصد اور طریقہ تعلیم کے متعلق بڑے سمجھے کہ اشارات ہیں، اس لئے کہ تفصیل کا وقت تھا اور نہ انھیں اس کی فرصت ہی تھی، اس اسکیم میں وہ لکھتے ہیں۔

”ہمارا مطلق نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہم اپنی درس گاہوں سے ایسے نوجوان پیدا کریں جو

نہ صرف حسب معیار زمانہ حال تعلیم و تربیت یافتہ شمار کئے جائیں گے مستحق ہوں، بلکہ سچے معنوں میں مسلمان بھی ہوں جن میں اسلام کی روح ہو اور جو اپنے مذہب کی تعلیمات سے اس قدر بہرہ اندوز ہو چکے ہوں کہ مبلغین اسلام کی فوج میں دھڑلے کی امداد سے مستغنی رہے نیاز ہو کر خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ اس مقصد کے لئے قرآن مجید سے پوری واقفیت حاصل کرنے کو ہم نے اپنی تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے، چنانچہ ہر منزل میں ہم نے اس امر کا انتظام کیا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم سمجھا کر دی جائے تاکہ مسلمانوں کی وہ جماعت جو اقتصادی یا دیگر وجوہ کی بنا پر منزل ابتدائی سے آگے بڑھنے کی استطاعت نہ رکھتی ہو، قرآن مقدس صرف نظر ہی پڑھ لے۔“

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے۔

”بچوں کے دل میں یہ بخوبی راسخ کر دیا جائے کہ مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات عقائد اسلامی کی صداقت، احکام اسلام کی عملی سودمندگی اور ان پرستی کے ساتھ عمل کرنے پر مبنی تھے۔ اور ہم اگر پھر اپنی گم شدہ عظمت کا اعادہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف یہی طریقہ ہے کہ عقائد اور احکام اسلامی پر کار بند ہو جائیں اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے نقش قدم پر چلیں۔“

یہ تھا مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق محمد علی کا صحیح اسلامی تخیل۔

اور اپنے اس عقیدہ میں کہ جامعہ کے اندر ہر طالب علم مذہبی احساس سے لبریز ہو اور مذہبی روح اس میں پورے طور سے سُریت کر جائے وہ بہت زیادہ سختی سے عامل تھے۔

فلسفہ کی پروفیسر شپ | چنانچہ مولانا عبدالمجید صاحب دیرپا بادی مذکر کا بیان ہے کہ جب جامعہ

قائم ہوئی تو محمد علی نے جناب ممدوح کو جامعہ تشریف لانے کی دعوت دی، اور فلسفہ کی پروفیسر بننے کی۔

لیکن چونکہ اس وقت تک جناب ممدوح کے ”مسلمان“ ہونے کا محمد علی کو علم نہ تھا۔ اس لئے محمد علی نے یہ بھی لکھ دیا کہ آپ تشریف لائے، لیکن اتنا لحاظ رہے کہ مجھے تعلیم سے زیادہ مذہب عزیز ہے، تعلیم کو میں چھوڑ سکتا ہوں لیکن مذہب پس پشت نہیں ڈال سکتا۔
بعض اسباب کی بنا پر جناب ممدوح جامعہ تشریف نہ لاسکے۔

جامعہ سے بے تعلقی اور تعلق | تھوڑے عرصہ کے بعد محمد علی سیاسی شغلیتوں میں ایسے مصروف ہوئے کہ پھر باوجود کوشش کے اس گرداب سے کبھی نہیں نکل سکے اور گوان کی یہ خواہش ہمیشہ رہی کہ کبھی انھیں فرائع خاطر حاصل ہو تو وہ جامعہ میں اپنے اوقات عزیز صرف کریں، اور وہاں کے طلبہ میں پھر وہی رُوح پیدا کریں جو ان کے لئے وہ ضروری سمجھتے تھے لیکن ان کی یہ آرزوئے دیرینہ نہ پوری ہو سکی اور علاوہ کوئی خدمت نہیں کر سکے۔

لیکن اس بے تعلقی کے بعد بھی ان کا قلبی تعلق ہمیشہ جامعہ کے ساتھ رہا، حکیم اجل خاں کا جب انتقال ہوا تو محمد علی نے مسلسل ہمدردی میں مضامین لکھے اور لوگوں کو اس کی امانت کی طرف مائل کیا

اسی طرح جامعہ جب دہلی میں آئی، تو انھوں نے مسلسل پروپیگنڈا کیا، جامع مسجد میں تقریریں کیں اور لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے بچوں کو جامعہ ہی میں داخل کرائیں!

باب ۱۸

ناگپور کانگریس

اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ء میں جامعہ کی تائیس اور اس کے اندر نظم و انتظام قائم کر کے محمد علی نے ملک کا دورہ کیا اور ترک موالات کی حمایت کی نصیحت کی۔

ناگپور کانگریس | پھر دسمبر سنہ ۱۹۰۱ء میں ناگپور میں کانگریس کا مشہور اور تاریخی اجلاس ہوا جس میں ملک تعاون کا پروگرام منظور کر لیا گیا اور گاندھی جی کے ہاتھ میں زمام قیادت سونپ دی گئی۔

خلافت کانفرنس | خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی اسی زمانہ میں ناگپور میں منعقد ہوا تھا مسلمانوں کے قلوب گورنمنٹ کے طرز عمل سے پاش پاش ہو رہے تھے، گورنمنٹ کی عالم اسلام پر دراز و ستیز اور وعدہ خلیفوں نے مسلمانوں کو آتش زیر پا کر رکھا تھا، اس سے پیشتر امرتسر، بمبئی اور دہلی کی خلافت کانفرنسوں میں ترک موالات کئی بار موضع بحث میں آچکا تھا اور حجامان عام اس کے قبول کر لینے پر آمادہ معلوم ہوتا تھا، چنانچہ ناگپور میں اس کی توثیق کر دی گئی اور طے کر لیا گیا کہ اب مسلمان بھی ترک موالات کی تحریک میں پورا حصہ لیں گے، مسلمانوں نے بھی اپنی قیادت کے لئے گاندھی جی کو منتخب کیا کیونکہ اس سے پیشتر گاندھی جی نے مسلمانوں کے مطالبات اور گورنمنٹ کی روش پر اپنی کارگزاریوں کا نہایت گراں بہا ثبوت دیا تھا اور مسلمانوں کی امداد و اعانت کے لئے ہر طرح آمادگی ظاہر کی تھی، پھر جنوبی افریقہ میں انھیں قیادت کا تجربہ بھی ہو چکا تھا، اس لئے مسلمانوں نے بلاپٹا پیش گاندھی جی کی رہنمائی قبول کر لی اور اس طرح عدم تشدد کے وہ بھی پابند ہو گئے

اختلاف | اس وقت تک کانگریس سے لبرل حضرات علیحدہ نہیں ہوئے تھے اور وہ بھی اس

میں شریک ہوتے تھے، انہیں چونکہ ”غیر اپنی“ دوش پسند نہیں تھی، اس لئے وہ بھی پوری طاقت کے ساتھ کانگریس میں شریک ہوئے اور تجویز ترک موالات و ترک تعاون کو منظور کرانا چاہا۔

ہندوؤں میں پنڈت مالویہ اور مسلمانوں میں مسٹر خلیفہ پیش پیش تھے۔

سی آر داس | مسٹر سی آر داس بھی اس وقت تک پریکٹس کر رہے تھے اور مقاطعہ اور ترک موالات کے وہ بھی شدید مخالفین میں تھے، اس لئے بظاہر بڑی پریشانی تھی کہ دیکھے انجام کیا ہوتا ہے؟
محمد علی کی کوششیں | محمد علی نے اپنے آپ کو اس تجویز کے منظور کرانے کے لئے وقف کر دیا تھا کبھی گاندھی جی سے گفتگو کر رہے ہیں، کبھی مالوی جی سے مل رہے ہیں، کبھی مسٹر خلیفہ کو سمجھا رہے ہیں اور کبھی سی آر داس کو مجبور کر رہے ہیں کبھی اور دوسرے لوگوں سے تبادلہ خیالات کر رہے ہیں اور انہیں تجویز کی اہمیت سمجھا رہے ہیں، غرض اس زمانہ میں محمد علی کا کھانا پینا بند ہو گیا تھا اور رات کی نیند حرام ہو گئی تھی۔

سی آر داس کی رضامندی | محمد علی کو سب سے زیادہ فکر سی آر داس کی تھی، مان کی نگاہ دور رس نے بھانپ لیا تھا کہ یہ جوہر قابل ہے، اگر اتھا گیا تو تحریک کو چار چاند لگ جائیں گے، اس لئے محمد علی کا سارا زور سی آر داس پر صرف ہو رہا تھا، وہ انہیں ملائل سے، براہین سے، محبت سے، پیار سے، خفگی سے، دلا سے، غصہ سے، خوشامد سے ہر طریقہ سے ہموار کر رہے تھے کہ وہ اپنی لاکھوں روپیہ سالانہ کی پریکٹس پر لات مار دیں، ایک رات کو وہ اسی فکر میں غلطاں بیجاں گاندھی جی کے پاس سے واپس آ رہے تھے کہ اس نے محمد علی کا ہاتھ پکڑا اور الگ لپکا کر کہا، محمد علی! تمہاری رائے صحیح ہے میں نے طے کر لیا ہے کہ تحریک کی حمایت کر دوں اور اپنی پریکٹس چھوڑ دوں، محمد علی یہ سنتے ہی دفور مسرت سے داس کے گلے پٹ گئے اور ان کے خوب ہی خوب بو سے لئے
محمد علی کو آخر عمر تک ہمیشہ اپنی اس خدمت پر فخر رہا کہ داس حبیبی شخصیت کو میدان عمل میں

لانے ولے وہی تھے۔

رہ گئے، سٹرجن اور پنڈت مالویہ ان سے انہیں کوئی خاص امید نہیں تھی، اس لئے تجویز پاس ہو گئی | اب وہ بے فکر ہو گئے، بڑے ہنگاموں اور بڑے اندیشہ اختلاف کے بعد یہ تجویز کانگریس نے منظور کی۔

نتیجہ | اس سے ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ سائے ہندوستان میں ایک روح عمل تازہ ہو گئی اور ہر شخص کے دل میں آزادی کی سڑپ اور سر میں آزادی کا سودا پیدا ہو گیا، بچہ بچہ آزادی کا علمبردار تھا۔ دوسرا اہم نتیجہ یہ نکلا، کہ کانگریس معتدین اور عافیت پسند مبلمان سے خالی ہو گئی، وہی تاریخی کانگریس ہے جس کے بعد سے پھر سٹرجن اور دوسرے معتدین کبھی کانگریس میں شریک نہ ہوئے، گو ملک پر بڑے بڑے نازک دور آئے اور گزر گئے۔

تحریک کا آغاز | اب تجویز کے منظور ہو جانے کے بعد گاندھی جی نے محمد علی اور شوکت علی کے ساتھ سائے ملک کا دورہ کرنا شروع کیا۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ گاندھی جی اور علی برادران کی غیر معمولی کوششوں اور سرگرمیوں کا یہ مفید نتیجہ نکلا کہ انگریزوں کا ڈر عوام کے دل سے کا فور ہو گیا، قید خانہ ایک مذاق گنا اور گرفتاری ایک کھیل۔ یاد ہو گا وہی وہ تحریک تھی جس میں انگریزوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوا، اور ہندو نہیں مرنے کی سڑپ پیدا ہو گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندو بھی اپنے اندر مرٹنے کی آرزو پانے لگے۔

ونٹائل نٹائل کا خیال | مشہور ماہر سیاست و فلسفہ ونٹائل نٹائل اپنی کتاب *Unrest in India* کے آخری ایڈیشن میں کتنی سچی بات لکھتے ہیں کہ

مسلمانان ہند کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کے زیادہ فائدہ داری علی برادران کی گردن پر ہے جنہوں نے کانگریس میں خیل مکر اس پند ہندوؤں میں برائے کے عناصر پر پکے اور دھرم مان فوج کو بغاوت پڑھایا۔

باب ۱۹

تحریک خلافت

انگلو رکانگرس کے بعد محمد علی کی زندگی کا وہ رخ شروع ہوتا ہے جس میں محمد علی نے اپنی قوت قیادت، قوت فیصلہ اور قوت عمل کا دوست دشمن، موافق، مخالف، سب کے اعتراف کر لیا اور جس نے نظیر اور عدیم المثال قوت ایمان و عمل کا تذکرہ ہندوستان کے آئندہ مورخ کے لئے ناگزیر ہر دورہ | محمد علی نے اس زمانہ میں تقریباً سارے ہندوستان کا دورہ کیا، اور جہاں بھی وہ گئے ان کے یمن قدم سے ہر جگہ ایک نئی فضا اور ایک تازہ حرکت پیدا ہو گئی جس نے ملکیت کے تھمر فلک بوس میں تزلزل پیدا کر دیا۔

انھوں نے لکھنؤ، اجیمیر، علی گڑھ، دہلی، بمبئی، الہ آباد، مدراس، بیگانا، آسام، پنجاب، تمام مقامات کا دورہ کیا اور جہاں بھی وہ گئے کامیابی ان کے قدم لینے کو بڑھی اور اقبال نے ان کے آگے سر جھکایا۔

جوش و خروش | جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ دیہاتی جنھیں لال گپڑی، کو دیکھ کر تپ و لرزہ کی شکایت پیدا ہو جاتی تھی، وہ مردانہ وار استقبال کرتے تھے، جلسوں میں شریک ہوتے، جلوسوں میں حصہ لیتے تھے، پولیس و ریفوج کے سامنے اللہ اکبر اور ہندو مسلم اتحاد کی جے کے روج پر زور سے لگاتے تھے، ڈپٹی کھاتے تھے اور گولیاں اپنے سینہ پر روکتے تھے، انھیں موت سے ہراس تھا نہ جیل کا ڈر نہ بال بچوں کی پروا۔

وہ جب جیل جاتے تھے تو ان کے گھروں لے انھیں مبارکباد دیتے تھے، ان کے دوست اجاب

خوش ہوتے تھے، اور ان کے اہل و عیال اس کا زمانہ پر فخر سے اپنا سر اٹھاتے تھے۔
بچوں کا یہ حال تھا کہ خلافت اور خلیفہ کے معنی سے نا آشنا تھے، اسلام اور اسلامیت کے
مفہوم سے ناواقف تھے، تحریک اور تحریک کے محرکین سے بے خبر تھے، وہ تو بس گاندھی جی کو
جانتے تھے اور مولیٰ شوکلی، محمد علی شوکت علی سے واقف تھے۔

صبح ہوئی اور ان کا قافلہ چلا، شام ہوئی اور انھوں نے بازار کا رخ کیا، کوئی گاندھی جی
کے بے کے نمبرے لگا رہا ہے، کوئی علی برادران کے جیکا سے بھر رہا ہے کوئی سودیشی کا پرچار کر رہا
ہے، کوئی گورنمنٹ کے متعلق سر راہ پیشین گوئیاں کر رہا ہے اور جب گرفتاری کا وقت آتا ہے تو ہنسی
خوشی مسرت سے سر بلند ہو کر پامیوں کو مجبور کر رہا ہے کہ ہمیں بھی گرفتار کرو اور اگر سپاہی بچہ سمجھ کر
چھوڑ گیا ہے تو وہ وہیں چل جاتا ہے اور رونے لگتا ہے، اس کا رونا جب ہی بند ہو سکتا تھا جب
وہ گرفتار کر لیا جائے، اسیر زنداں کر دیا جائے۔

شوق گرفتاری | بڑے بڑے ثقہ لوگوں کا بیان ہے کہ بعض مشہور شہر میں جب فوج یا پولیس
کی جماعت لاریاں لے کر گرفتار کرنے آتی تھی تو بیتیابی اور اشتیاق کا یہ عالم ہوتا تھا کہ لاری میں بیٹھنے
کی جگہ نہیں رہتی تھی اور گرفتار ہونے والے و فور شوق میں لاری کے پامدان پر کھڑے ہو ہو کر اپنی تینیں
گرفتاری کے لئے پیش کرتے تھے اور جب تک عروس تناسے ہکمار نہیں ہو جاتے تھے ان کی حالت
دیوانوں کی سی رہتی تھی۔

چندہ | اسی زمانہ میں کانگریس فضا اور خلافت قضا کے لئے چندہ کی تحریک شروع ہوئی اور شاید
ایک کروڑ کا مطالبہ ایک نہایت ہی مختصر اور محدود زمانہ میں کیا گیا کہ اتنے عرصہ تک یہ چندہ ضرور جمع
ہو جائے۔

دلیپتروں کے دستے گھومنے لگے اور غریب فاقہ مست مزدوروں اور کام کرنے والوں سے

چندہ مانگنے لگے، اس زمانہ میں کسی خاص تحریک کی ضرورت نہیں تھی، صرف ذرا سا اشارہ کر دیجئے۔ اور اتنا چندہ جمع کر لیجئے کہ چندہ مینے والوں کو ابھی چندہ مینے سے سیری نہ ہو اور آپ کو ”نگی امان“ کی شکایت ہو جائے۔

جو غریب تھے انھوں نے اپنی مزدوری کاٹ کاٹ کر پیسے جمع کئے اور چندہ دیا، جو محتاج تھے انھوں نے اپنے گھر کی چار پائیاں، لوٹے اور برتن بہن رکھے اور چندہ دیا، جو اس وقت خالی ہاتھ تھے انھوں نے اپنی بیویوں سے انکا زیور اٹکا انھوں نے فنی خوشی زیور اتار، پوٹلی باندھ شوہر کے سامنے لا کر رکھ دی، شوہر صاحب گئے اور چندہ دیا ”سر خرد“ ہوئے۔

یہ تو تھا غریب طبقہ کا حال، اگرچہ اس زمانہ میں سرمایہ داروں نے کوئی خاص مدد نہیں پہنچائی لیکن طبقہ متوسط نے ایثار و قربانی، فدایت اور جان نثاری کی انتہا کر دی۔

ترک ملازمت | اسی طبقہ کے افراد تھے جنہوں نے ملازمتیں چھوڑیں، فاقہ کئے، میلے کھیلے کپڑے پہنے اور لاکھ لاکھ اصرار کی بجائے ان کا انکار برابرتقام رہا اور وہ اپنے ارادہ سے نہ ہٹے، طالب علم ترک تعلیم | جو تھے انھوں نے اسکول بند کر کے، کالج خالی کر دئے، یونیورسٹیوں میں قفل لگوا دئے اور جوق در جوق اللہ کے راستے میں شہداء و مصائب برداشت کرنے کے لئے چل پھڑے ہوئے، انراہ کے مصائب کا خوف نہ فرق و فاقہ کا ڈر، ایک غم تھا جو سب کچھ کرائے جا رہا تھا! کیا زمانہ تھا۔

اور اس سارے نظام کی محور، ایک ذات تھی، محمد علی! جس کی طرف اشارہ کر دیا اس نے وکالت چھوڑ دی، جس کی طرف دیکھ لیا، اس نے نوکری چھوڑ دی اور جس سے کہہ دیا وہ جیل خانہ ہوا یا۔

اتفاق واتحاد | ایک یہ زمانہ ہے کہ ہندو مسلمان سے متفرق، اور مسلمان ہندو سے بیزار، اور

ایک وہ مبارک و مسعود زمانہ تھا کہ ہندو مسلمان دونوں بھائی بھائی معلوم ہوتے تھے، عید ہوئی اور ہندوؤں نے سبیل لگا دی، شربت پلا رہے ہیں اور راہ گیر مسلمانوں کی ہر طرح سے خاطر تواضع کر رہے ہیں، کبھی پان کھلاتے ہیں، کہیں پوریاں پیش کجاتی ہیں، کبھی الائچی۔
ہولی آئی اور مسلمانوں نے اظہارِ مسرت شروع کر دیا، اپنے ہندو بھائیوں کی دعوتیں
کیں، ان کی خوشی پر خوش ہوئے اور ہر طرح سے ان کی لچپی میں اضافہ کرنے کی کوشش کی!
وہ زمانہ ہوا کی طرح آیا اور بادل کی طرح نکل گیا۔

باب

معافی کا افسانہ!

اسی زمانہ میں کہ محمد علی کا طوطی بول رہا تھا، ہر شخص ان کے نام کا کلمہ پڑھ رہا تھا اور وہ ملتعار کرتے ہوئے سائے ہندوستان کو فتح کر رہے تھے کہ ہندوستان بھر میں یہ افواہ مصدقہ طور سے اڑی اور بڑی شہرت کے ساتھ اڑی کہ

علی برادران کی ”معافی“ | علی برادران نے گورنمنٹ سے معافی مانگ لی! ہر شخص نگشت بندیا رہ گیا کہ علی برادران اور معافی!

مگر بڑے زور شور سے یقین دلایا گیا کہ ہاں علی برادران نے معافی مانگ لی! گورنمنٹ کے سامنے تو بکر لی!

مقصد | اس افواہ کا مقصد یہ تھا کہ علی برادران کا بڑھتا ہوا اثر زائل ہو جائے اور سائے ہندوستان سے برگشتہ ہو جائے، تاکہ علی برادران اپنے مقاصد ”ششموہ“ میں کامیاب نہ ہو سکیں اور جس ”پبلک“ کے بل پر وہ اتنا ہنگامہ برپا کر رہے ہیں وہی ان کے خلاف ہو کر ان کی زندگی دو بھر کر دو اثر | لیکن اس خبر کو جس عیارانہ سرعت کے ساتھ پھیلایا گیا، اسی قدر اس میں ناکامی ہوئی۔ سننے کو تو ہر شخص نے سن لیا، مگر یقین کسی کو بھی نہ آیا ہر شخص نے خندہ امتحار سے ”مخبر کا ذب“ کی اس خبر کی تکذیب کی اور علی برادران کے اثر و رسوخ میں کوئی فرق نہ آیا وہ سائے ہندوستان کی ہی طرح ستراج رہے اور سائے ہندوستان نے اسی عقیدت و محبت کا ان سے برتاؤ کیا جس کے نتیجے میں محمد علی کا بیان | خوش قسمتی سے اس مسئلہ کے متعلق خود محمد علی نے ضمناً نہایت تفصیل سے اظہار

خیال کیا ہے جس سے ساری حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے، اہم اقتباس یہ ہے۔
گاندھی جی کی لارڈ ریڈنگ کے ملاقات | ”ہم تانگا گاندھی لارڈ ریڈنگ سے جو اس وقت نووارد
 وائس لے تھے شملہ میں ملے، ان پر اس ملاقات سے یہ اثر ہوا کہ لارڈ ریڈنگ ہندوستان
 کو آزادی دلانے اور خلافت ترکیہ کے اقتدار و قوت کو بحال کرانے میں مدد دیں گے
 مگر وہ فقط اس کے خواہاں ہیں کہ ترک تعاون کی تحریک تشدد سے بری ہے۔

سازش کا الزام | ہمارے خلاف یہ خبر مشہور تھی کہ ہمارے پاس علیحضرت شاہ افغانستان کا
 بھیجا ہوا ایک آدمی آیا تھا اور ہم ہندوستان پر افغانستان کا قبضہ کر دینا چاہتے ہیں،
 افغانی ہوسے بعض ڈرنے والے ہندو نے ہمارا جی کو پریشان کر رکھا تھا کہ آپ
 ان دونوں بھائیوں پر اس قدر اعتماد کیوں کرتے ہیں۔

انڈینڈنٹ کے نامزدہ کے سوالات | ان کو مطمئن کرنے کی غرض سے ہمارا جی نے مجھ سے
 چند سوالات کرائے اور میرے جوابات افغانی حملہ اور قبضہ ہندوستان کے متعلق
 حاصل کئے اور انڈینڈنٹ اخبار میں شائع کرا دیے۔

شبہ مالوی اور سپروکوتھا | پھر مالوی جی اور ڈاکٹر سپرو نے انہیں ہماری تقریروں کے چند
 جھوٹے سچے بیاق و سباق سے بے تعلق اقتباسات اس غرض سے دکھائے کہ انہیں
 ہم سے بدظن کر دیں۔

لارڈ ریڈنگ کا مواد | یہی اقتباسات لارڈ ریڈنگ نے انہیں دکھائے تھے اور ہمارا جی کو
 یہی مناسب معلوم ہوا کہ ان کے متعلق ہمارا ایک بیان شائع کر دیا جائے کہ ہمارا
 گاندھی کی ترک تعاون کی تحریک میں ہمارا ارادہ نہیں ہے کہ ہم تشدد سے سونچ
 ناسل کریں، لیکن بعض اجاب پر ہماری تقریروں کا یہ غلط اثر پڑا ہے اس لئے ہم

اٹھارہ فوس کرتے ہیں کہ ہم نے کیوں ایسے الفاظ استعمال کئے جن سے یہ غلط مطلب بھی نکل سکتا ہے، ہمارا خیال کبھی بھی نہ تھا کہ لارڈ ریڈنگ اسلام کا بھلا چاہتے ہیں لیکن ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہم ایک ایسا بیان شائع کرنے سے انکار کریں اور ہمارے ہندو دشمن ہباتاجی کو ہم سے یہ کہہ کر بدگمان کر دیں کہ یہ مسلمان سورج چاہتے ہی کب ہیں؟ ان کو تو مسلمان راج مطلوب ہے اور یہ تشدد اور اتفاقی مدد سے ہندوستان کو غلام بنانا چاہتے ہیں، اسی لئے ایسا بیان ٹینے سے انکار کرتے ہیں اور یہ تو بہت ممکن تھا کہ ہباتاجی بعد کو کہتے کہ لارڈ ریڈنگ ہندوستان کو سورج والا دلائے صرف اسی وجہ سے رک گئے کہ ہم نے بیان مطلوبہ نہ دیا، اس خیال سے ہم بیان ٹینے پر اسی وقت راضی ہو گئے، مگر میں نے کہا کہ پہلے وہ اقتباسات تو دیکھیں جن کی اس طرح تاویل کی گئی ہے ہباتاجی اس کی معقولیت کے قائل ہو گئے اور وائسرائے کو تار دیا کہ وہ اقتباسات یسٹی ارسال کر دے جائیں، احتیاطاً مالوسی جی کو بھی اسی مطلب کا تار دیا گیا۔

وائسرائے کا انکار | وائسرائے مالوسی جی سے بھی زیادہ کائیاں تھیں، انھوں نے ہمارے تقریروں کے اقتباسات بھیجنے سے قطعاً انکار کر دیا مگر مالوسی جی نے ارسال فرما دیا میں نے جب یہ اقتباسات پڑھے تو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ بعض تو غلط فہمی یا غلط سننے یا غلط نویسی کا نتیجہ ہیں اور بعض کو صرف غلط معنی پہنچا جا رہا ہے ہیں، ایک بھی اقتباس ایسا نہیں ہے جس کی تردید کی ترغیب یا نیت ثابت ہوتی ہو۔

بیان ٹینے سے انکار | اس لئے ہم نے انکار کر دیا کہ ہم ایسا بیان ہرگز نہ دیں گے، البتہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ گو نہ ہمارا یہ مقصد تھا نہ ان تقریروں ہی سے یہ

مطلب سمجھ میں آسکتا ہے، تاہم چونکہ بعض سربراہ اور وہ حضرات نے اس کے یہ معنی بکالے ہیں، افسوس ہو کہ ایسا ہوا، اور ہم ہر شخص کو اس کا یقین دلاتے ہیں کہ ہماری نیت یہیں ہے کہ ترک تعاون کی تحریک میں ہم کسی کو تشدد کی ترغیب دیں چنانچہ ہم نے ہی بیان کی اشاعت | بیان شائع کر دیا اور اس کے شائع کئے جانے کے بعد ہاتھاجی نے

وائسرائے کو بھی اس کی اطلاع دیدی، اشاعت سے پہلے اس ترمیم کی جس پر ہمیں اصرار تھا وائسرائے کو اطلاع نہ دی گئی تھی، اس لئے کہ ہاتھاجی نے فرمایا تھا کہ یہ بیان تمہارا ہے جو جی چاہے لکھو، وائسرائے کے حکم سے کچھ نہیں لکھا جا رہا ہے کہ ان کی منظوری ترمیم کے متعلق پہلے حاصل کر لی جائے۔ اور نہ یہ بیان تم وائسرائے کو وائسرائے کے لئے نہیں | اطمینان دلانے کے لئے ہے ہو بلکہ اپنے ہندوستانی بھائیوں

کی غلط فہمی رفع کرنا مقصود ہے تو ان کے اطمینان کے ساتھ وائسرائے کو بھی اطمینان ہو جائے گا، نہ ہاتھاجی نے مجھ سے فرمایا نہ مجھے اس کا دم و گمان تھا کہ ہمارا بیان اس لئے شائع کیا جانے والا تھا کہ ہم سراسے بچائے جائیں، وائسرائے نے جس وقت ہاتھاجی کو وہ اقتباسات دکھائے تھے جو مالومی جی اور ڈاکٹر سپر و پہلے ہی نہیں دکھائے تھے تو ہاتھاجی نے ارشاد فرمایا تھا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں اس قسم کا بیان ان دونوں بھائیوں سے کہہ کر شائع کرادوں، تاکہ ان کے بعد پھر کسی کو بے اطمینانی کے لئے وائسرائے کی گاندھی جی سے گفتگو | کوئی غدر بھی باقی نہ رہے اس پر وائسرائے نے کہا تھا کہ

یہ بہت ہی اچھا ہوگا حکومت ہند نے فیصلہ کیا تھا کہ علی براہدان پر مقدمہ چلایا جائے لیکن اگر یہ بیان شائع ہو جائے گا تو پھر مقدمہ چلانیکی کوئی ضرورت نہ رہے گی یہ سن کر گاندھی جی کا جواب | ہاتھاجی نے فرمایا کہ مقدمہ چلانا یا نہ چلانا آپ کا کام ہے، اس

سے ہیں کوئی غرض نہیں، ہمیں تو ایک ضروری بیان شائع کرنا چاہیے اور وہ ہمارا ہر حال میں فرض ہے، خواہ آپ مقدمہ چلائیں یا نہ چلائیں، یہ سب آخری دائرے سے ملاقات تھی۔

مقدمہ چلانے کا ذکر | اور مقدمہ چلانے کا اس سے پہلے کبھی بھی ذکر نہیں آیا تھا، ورنہ شبہ ہو کہ دائرے کی اس دھمکی پر ہاتھ تاجی نے ہمارے بچانے کی یہ صورت نکالی تھی تاہم جب ہمارا بیان شائع ہوا تو دائرے کا ہاتھ تاجی کے نام کچھ اس انداز کا آگیا کہ ہمارا یہ بیان دائرے کے حکم سے شائع کیا گیا تھا اور ہماری ترسیم انھوں نے کرم فرما منظور فرمائی تھی ہم اس وقت بھر دوج جا رہے تھے، ہاتھ تاجی نے خاموشی کا دن شروع کر دیا تھا، وہ تو نہ بول سکتے تھے مگر تار دیکھ کر میں کھٹکا کہ اس کے غلط معنی تو نہیں پہنچائے جا رہے ہیں اور ہاتھ تاجی سے عرض کیا کہ یہ تو کچھ اور ہی فرما رہے ہیں انھوں نے مسکرا کر سر ہلادیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی ایسا ہی خیال کرنے لگے بہر حال ہر مہرچ میں میرے ایک دوست رات کے دس گیارہ بجے بیٹنی سونامیں اسی غرض سے آئے کہ مجھے بیٹنی کرائیکل کا وہ پرچہ دکھائیں۔

لارڈ ریڈنگ کی تقریر | جس میں لارڈ ریڈنگ کی جیمس فورڈ کلب ڈالی تقریر تھی جو ہاتھ تاجی کی ملاقاتوں اور ہمارے اس بیان کے متعلق دی گئی تھی اور جس کی غرض سے سر محمد نے لاٹ صاحب بہادر کو دعوت دی تھی تاکہ اپنے دو مسلمان بھائیوں کو ذلیل و خوار کر سکیں اس تقریر میں ہاتھ تاجی کی بہت تحقیر کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ وہ ملاقات کے سائل بن کر آئے تھے، حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ دراصل۔

مالوی جی کا بلانا | لاٹ صاحب بہادر کی طرف سے مالوی جی نے اپنی علالت کا غرض

کر کے اور یہ کہہ کر کہ اگر آپ مجھ سے ملنے نہ آ سکیں تو اسی حالت میں میں آپ سے ملنے
الہ آباد آؤں، مہاتما جی کو بلایا تھا،

لارڈ ریڈنگ کی عیاری | لارڈ ریڈنگ سے زیادہ کوئی چالاک وائسرائے اس صدی
میں تو ہندوستان آیا نہ تھا، انھوں نے یہ چالاک کی کر اپنی تقریر میں ملاقاتوں کا ذکر
کچھ اس طرح کیا کہ پہلے اپنی ساری گفتگو سنا دی، پھر مہاتما جی کا جواب، حالانکہ گفتگو
چھ ملاقاتوں میں ہوئی تھی اور اس کا مجموعی دوران پندرہ گھنٹے تھا اور خطا ہے کہ
دس گھنٹے لٹ صاحب تقریر فرماتے رہے تھے نہ اتنی ہی دیر اس کے
بعد مہاتما جی، بلکہ چند منٹ ایک بوتلا ہو گا چند منٹ دوسرا، اس طریقہ پر گفتگو کا خلاصہ
کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگ سمجھے کہ وائسرائے نے مہاتما جی سے کہا کہ ہم علی براہ راست
پر مقدمہ چلانے والے ہیں اور مہاتما جی نے جواب دیا کہ میں ان سے کہہ کر اٹھ رہا
افسوس کر رہا ہوں اور اس طرح ہم دونوں بیویوں کی جان بخشی ہوئی اور ہم نے سزا
کے ڈر سے لٹ صاحب سے معافی مانگ لی۔

حسرت کا خط | چنانچہ میرے جلد باز بھائی مولانا حسرت موہانی نے اس تقریر کو پڑھتے ہی مجھ
ایک کا رڈ لکھا جس میں درج تھا کہ اگر مہاتما جی نے تمہیں اس بیان کو شائع کرنے سے
پہلے اطلاع دیدی تھی تو وائسرائے نے اس شرط پر تمہیں معاف کیا ہو تو تم سے بڑھ کر
بزدل کوئی نہیں اور اگر انھوں نے اس کی اطلاع تمہیں نہ دی تھی تو ان سے
بڑھ کر کوئی بے ایمان نہیں۔

لیکن میرے ان جو شیلے بھائی کو یہ نہ سوچا کہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ لارڈ
ریڈنگ نے ملاقات کا خلاصہ غلط دیا ہو بہر حال جب میں نے چیمبروف ڈکلبٹ الی

تقریریں۔

تقریر سے تاثر | تو سارا بدن پھٹک گیا اور میں نے ہاتھ جی سے اسی قدر کہا کہ اجازت ہو تو اس کا جواب دیدوں، جلسہ خلافت کا تھا میں صدر تھا، تقریر صدارت کچھ اور ہونے لگی تھی، مگر اس کے بعد میں نے صرف لارڈ ریڈنگ کی تلبیس کا پردہ چاک کیا اور شکل ہی سے میں نے ساری عمر میں اس سے زیادہ سخت کوئی اور تقریر کی ہو گی غالباً جون سٹورٹ کے بیسی کرانیکل میں اس کی مفصل رپورٹ شائع ہوئی تھی جس کے بعد لاٹ صاحب بہادر کو بھی جواب دینا پڑا کہ باوجود اس موسم کے جو لاٹ صاحب کی تقریر ہی میں موجود تھا اگر تشدد کی ترغیب نہ دی گئی اور محض حکومت سے لوگوں کو بد دل کیا گیا تو دفعہ ۱۲۴ الف کے جرم میں کسی تارک تعاون کو ناخونہ کر کے مقدمہ نہ چلایا جائے گا۔

لارڈ ریڈنگ کی تحریک | انھوں نے (وائسرائے نے) حکومت بمبئی کو مجبور کیا کہ کراچی پر کراچی خلافت کانفرنس کے ایک ریزولوشن کی بنا پر مقدمہ چلائے، اور احتیاطاً کراچی کی ایک اور تقریر بھی دفعہ ۱۲۴ الف کے ماتحت مقدمہ چلایا جائے اور وعدہ خلافی سے بچنے کے لئے یہ عذر بھی تلاش کر لیا گیا کہ تشدد کی ترغیب نہ تھی لیکن کراچی کانفرنس کی تجویز مسلمان پامیوں کو متہیاء رٹوانے کی طرف مائل کرتی تھی اور یہ تشدد سے بھی بدتر ہے۔

سر سپرو کی ”مساعی حسنہ“ | سب لوگ جانتے ہیں کہ کس طرح ڈاکٹر سپرو بمبئی گئے اور ایڈووکیٹ جنرل کو پیر دی کرنے پر آمادہ کرنا چاہا اور بالآخر الہ آباد ہی کے ایک انگریز بیرسٹر مسٹر اسٹن کو اٹھارہ ہزار روپے کرہائے جس دوام کی سزا کا سامان کیا گیا، مگر

کس طرح حیوری کے عیسائی اور انگریز اراکین نے بھی حق کی حمایت کی اور ہم کو بری کر دیا، مگر جو ذلیل کشتہ نے ایک اور الزام پر ہم کو دو دوبرس کی سزا دیدی۔
اس مقدمہ سے پیشتر ہاتاجی نے وائسرائے کو نچ کر دیا تھا، اور باوجود مالوسی جی کی اس عنایت کے کہ انھوں نے لائٹ صاحب کی طرف سے حق وکالت پوری طرح گاندھی جی کی وائسرائے کے نام تحریر | ادا کیا، ہاتاجی نے وائسرائے کو صاف لکھ دیا کہ علی برادران کا رُسے سخن تمھاری طرف نہ تھا بلکہ اپنے اہل وطن (مثلاً مالوسی جی اور ڈاکٹر سپر) کی طرف تھا اور ان کے اظہارِ افسوس کے ہرگز یہ معنی نہ تھے کہ وہ تم سے معافی مانگ رہے تھے اور اپنا ایک علیحدہ بیان شائع کرنے کی دھمکی دے کر وائسرائے کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک متفقہ بیان شائع کریں جس میں صاف اقبال ہو کہ ہمارا بیان کسی بھٹو کی بنا پر اور مول تول کرنے کی غرض سے ہرگز نہ دیا گیا تھا اور مقدمہ چلانے کا ذکر وائسرائے نے اسی وقت کیا تھا جب ہاتاجی خود پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ وہ ہم سے ایک بیان شائع کرنے کے لئے کہنے ولے ہیں۔“

یہ اس معافی کی حقیقت ہے اس زمانہ میں ہر ہڑتات اور قصبہ کے لوہے پر لڑی اسکولوں تک میں پہنچا گیا تھا اور شہر کیا گیا تھا کہ دیکھو تمھارے سب سے بڑے سوا اور بہادر گورنمنٹ بہادر سے اس طرح لرزتے ہیں کہ ذرا سی گرفتاری کی دھمکی پر معافی مانگنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔
دنیا کو یہ حقیقت خوب معلوم ہے کہ اس فریب کا رانہ جدوجہد کا کیا نتیجہ ہوا؟ اور علی برادران کی فحش مغزت میں فرق آیا یا اضافہ ہوا؟
اس پر لطیف ”معافی“ کے بعد اب انکی گرفتاری اور سزائی کا زمانہ آتا ہے یعنی مشہور مقدمہ کراچی کے حالات اس کی ضروری تفصیل اور سببِ عمل پر بحث آئندہ طور پر ہوگی۔

کی گرج کمرۂ عدالت میں گونجی اور گوجیٹرٹ اور جی سب ہی بچ ہوئے، مگر متاثر ہونے کے آخر سب ہی خاموش ہوئے۔

اس جگہ عدالت سوان کی آئینی جنگ کو طوالت کے خیال سے نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن جن لوگوں نے مقدمہ کراچی پڑھ لیا ہے وہ محمد علی کی شجاعت و بہالت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں اور معلوم کر لے سکتے ہیں کہ اس وقت جب وہ ایسے الزام میں مانوڑتے تھے جس میں بھانسی اور کم از کم جس جوام کی سزا آسانی دی جاسکتی تھی، اس وقت بھی ان کی زبان کلمہ حق سے خاموش نہیں ہوتی۔

سزا کا اثر | محمد علی اور ان کے رفقا کی سزایابی نے ہندوستان کے جواں بہت فرزندوں میں ایک اور ولولہ پیدا کر دیا اور تحریک کی رفتار میں بہت زیادہ خلاف توقع اضافہ ہو گیا۔ وہی زمانہ تھا جب ہر گھر خلافت کمیٹی کا دفتر اور ہر فرد خلافت کمیٹی کا ممبر تھا۔ یگم محمد علی اور بی اماں محیر العقول طریقہ پر سائے ہندوستان کا دورہ کر رہی تھیں اور خلافت فنڈ کے لئے چندہ جمع کر رہی تھیں، مسلمان خواتین ہیں اتنی جوش و خروش کا اندازہ بعد کو ہوا۔

اجاب پراثر | یہ معلوم ہو چکا ہے کہ محمد علی کو اور ان کے رفقا کو سزائے با مشقت ہوئی تھی۔ محمد علی کے احباب محمد علی کے طرز ماندوبودے پورے طور سے واقف تھے، اس لئے جب ان کے کانوں میں یہ خبر پڑی کہ سزا با مشقت ہوئی ہے اور بعد کو پھر قید تنہائی کا بھی اضافہ ہوا ہے تو ان کے قلق و اضطراب کی انتہا نہ رہی۔

ایک یادگار واقعہ | چنانچہ اسی حکم سزا کو جب محمد علی کے ایک عزیز مخلص اور ”پچھے“ دوست نے سنا تو اسی دن سے انھوں نے چارپائی پر استراحت کرنا ترک کر دیا۔

چونکہ ایک مباح چیز کو وہ حرام نہیں کر سکتے اس لئے کبھی کبھی تو چارپائی ضرور استعمال

کر لیتے ہیں، لیکن اکثر دیشتر فرش خاک ہی ان کا فرش خواب ہوتا ہے! خلوص و محبت کی یہی
روح پر درشمالیں آج کل کس قدر کمیاب ہیں؟

تاثرات مابعد | اسی زمانہ میں، یعنی اسی سیری کے بعد پیچ کے فائل ایڈیٹر نے محمد علی پراکٹ سری
تقریب کے سلسلہ میں خیالات و تاثرات ذیل کا اظہار فرمایا تھا۔

”کار ساز عالم کی کار ساز یوں میں شاید یہ سب سے عجیب تر حقیقت یہ ہو کہ کائنات
کے اہم ترین حوادث و نتائج کے وجود کا ذمہ دار ایسے ذرائع و اسباب کو بنایا
جاتا ہے جو بظاہر اس کے قطعی منافی اور عقل بشری کے اعتبار سے بالکل بعید
از قیاس ہوتے ہیں۔

بجلی کا خزانہ پانی کے دھارے میں مخفی ہوتا ہے، آتش سوزاں کے شرارے ہری ہری
شاخوں کی رگڑ سے پیدا ہوتے ہیں، خلیل بت شکن کی صدائے توحید بت پرستی
کے مرکز سے بلند ہوتی ہے، آزادی کی شعاعیں استبداد کی گہری تاریکیوں سے
پھوٹ کر نکلتی ہیں

یہی لطیف و خیر صنع کی صنعت گری تھی جس نے بیسویں صدی عیسوی کی
روشن خیال، علم پرور اور شائستگی نواز دنیا کو ایک بار پھر صحابہ کرام کے صدق علی
خلوص قلب و یحییٰ ایمان کا زندہ نمونہ دکھا دیا اور اس غرض کے لئے انتخاب ایسے
شخص کا کیا جس کی ایک عمر اس طرح گزری کہ ہر سانس و نگیت کی فضا میں آتی
اور جاتی تھی ورنہ چند سال پیشتر کس انسانی دماغ کو یہ اندازہ ہو سکتا تھا کہ علی گڑھ
کی روشن خیالی و فرنگی محل کی مولویت کے ہاتھ پر بالآخر بیعت کرے گی؟ انگریزی
زبان کا سحر نگار انشا پر واز اپنے بہترین اوقات کو حفظ قرآن کے لئے وقف کر گیا

مارگولیس کا شاگرد شہنشاہ کونین کے عشق میں بلال وادیس کے جوش جنوں کی یاد تازہ
 کرے گا، مل و مارلی گلیڈاسٹن و بریڈلاکے مدرسہ تحقیق کے فاضل کو تصباتی قوالوں
 کی غیر مہذب صدائیں قہص و وجد میں لائیں گی، اکسفرڈ کا آئر زمین گریجویٹ
 سلسلہ عالیہ قادریہ کی غلامی پر فخر کرے گا، نفیس اور بیش بہا سوٹ پہننے والا پلٹا
 کی بھٹی پرانی، سیلی کیلی کی شوق سے اوڑھے گا، مغل کے کوچ اور پرتکلف مہری
 پر لٹنے والا کھری زمین کے مرطوب فرش پر چلنے کے جائے، ہنسی خوشی کا تہنگ
 اور صوبہ کے گورنروں، پارلیمنٹ کے ممبروں اور امرامہندو انگلستان کا وہ عزیز
 دوست جس کا ایک دن بھی بغیر سرکاری ضیافتوں اور پارٹیوں کے ٹیکل گزرتا
 تھا، وہ ایک دو وقت نہیں مدتوں وہ غذا کھا کر رزاق مطلق کا شکر ادا کرے گا،
 جس کی جانب انسان تو الگ ہے ان حکام و الامقام اور اعلیٰ نادر کے کتے
 بھی شاید رخ نہ کرتے۔

مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہ کے اس پراثر تاثر نے محمد علی کی زندگی کے ہر رخ کو ظاہر
 و باہر کر دیا ہے، وہ بھی جب ”مسٹر“ تھے اور وہ بھی جب وہ ”مولانا“ ہو گئے اس موقع میں ان
 کی عیش و عشرت اور پھر بعد کو شدائد و مصائب کا پورا اندازہ کر لیا جاسکتا ہے۔

باب ۲۳

سنرا کے بعد!

ملک کی عام حالت | یہ بتایا جا چکا ہے کہ محمد علی اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کے بعد تحریک میں کسی قسم کا اضمحلال نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ اس کی رفتار میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

جس ریزولیشن پر محمد علی کی گرفتاری اور سنرایابی کا ”حادثہ“ وقوع میں آیا تھا، اس کو ملک کے ہر طبقہ نے عام جلسوں میں ایک بار نہیں متعدد بار دہرایا۔

گانڈھی جی کا اعادہ | گانڈھی جی نے اور کانگریس کے دوسرے زعمار نے، مولانا ابوالکلام آزاد نے اور خلافت کے دیگر کارکنان نے بکرات و قرات بالا اعلان اسی ریزولیشن کا اعادہ کیا اور گورنمنٹ کو دعوت دی کہ اس نے صرف علی براہ اور ان کو کیوں گرفتار کیا، ہمیں کیوں نہیں گرفتار کرتی، سارا ہندوستان اسی ریزولیشن کا اعادہ کر رہا ہے، وہ کیوں آزاد ہے؟

علی براہ اور ان کی گرفتاری کے وقت تک صرف دو تین لاکھ روپیہ چندہ جمع ہوا تھا، لیکن ان کی گرفتاری اور سنرایابی کے بعد ایسا جوش و خروش پیدا ہوا اور ایسا بے پناہ جذبہ عمل ظاہر ہوا کہ نہایت تھوڑے عرصہ میں پچیس تیس لاکھ چندہ کا ڈھیر لگ گیا جس میں بگیم محمد علی اور بی اماں کی انتھک کوششوں کو بہت دخل تھا۔

سول نافرمانی کا ارادہ | علی براہ اور ان کی گرفتاری کے وقت تک گانڈھی جی صرف مقاطعہ اور تحریک کے آلات کے اجراء پر زور دے رہے تھے، لیکن پھر وہ اس کے نئے پورے طور سے آمادہ ہو گئے کہ سول نافرمانی کی مہم کا بروہی سے آغاز کر دیں اور ملک کے اس جذبہ عمل کو کسی ایک مخصوص

و متعین راستہ پر لگا دیں۔

ملک نے بھی اس تحریک کے شروع کر دینے پر اپنی پوری آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔
واقعہ چوری چورا | کہ اسی زمانہ میں چوری چوراکا مخوس واقعہ پیش آگیا جس میں چند
 ہندوستانیوں نے پولیس کے ظلم و جبر سے تنگ آکر پولیس کے پوسٹ خانہ کو مع سپاہیوں کے نذر
 آتش کر دیا تھا۔ جس سے گورنمنٹ بھی بہت پریشان ہوئی۔

مالوی جی کی کوششیں | مالوی جی شروع ہی سے اس تحریک کے، علی برادران کے اثر
 و رسوخ کے اور مسلمانوں کی اس شرکت عمل کے سخت مخالف تھے انھیں کی شخصیت تھی جس نے
 افغانستان کا ہوا اپنی تصور آفرینی کی قوت سے لاکھڑا کیا تھا، اور وہی تھی جو یہ سمجھ رہے تھے کہ ملی
 برادران تو ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت چاہتے ہیں اور وہی تھے جن کا محور عمل ”فرام الد آباد
 ٹوٹلہ اور فرام وائسرائے ہاؤس ٹوٹلہ“ رہ گیا تھا۔

اس واقعہ نے انھیں موقع دیا کہ وہ گاندھی جی کو شیب مفران سمجھائیں اور جس چیز کو گاندھی
 جی شروع میں ماننے سے انکار کر رہے تھے اسے ان کی آنکھوں کے سامنے لاکھڑا کر دیں۔

پروگرام کا التوا | نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی پورے طور سے متاثر ہو گئے اور انھیں یقین آگیا کہ تحریک
 اگر جاری رہی تو تشدد سے محفوظ نہیں رہ سکے گی، اس لئے وہ بار دہلی پہنچے اور وہاں پروگرام
 کے التوا کا اعلان فرما دیا کہ کسی مناسب موقع کا انتظار کیا جائے، مولانا حسرت موہانی شروع سے
 گاندھی جی کی قیادت کی مخالفت کر رہے تھے مگر اس وقت اس تقارن میں طوطی کی آواز کون
 سنتا تھا؟

التوا کا اثر | اس اعلان التوا کے بعد بھی جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی، لیکن صوبوں اور
 ضلعوں کی کانگریس کمیٹیوں نے گاندھی جی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو متنبہ کرنا شروع کیا کہ التوا کا

اثر برپڑے گا، جوشِ عمل سرد ہو جائے گا۔ چورمی چورا کا حادثہ ایک اتفاقی اور مقامی حادثہ ہے تمام ملک عدم تشدد کے اصول پر عامل ہو اور اسی عقیدہ کا قائل ہے، مگر گاندھی اس واقعہ سے اتنے گھبرا پکے تھے کہ وہ کسی طرح بھی نظر ثانی کرنے پر راضی نہ ہوئے، انہیں یہی یقین رہا کہ تشدد کی ہلکا اب اس تحریک کا محفوظ رہنما کل ہے۔

تحقیقاتی کمیٹی | بہر حال حامیانِ خلافت، رضا کاران کانگریس اور صوبہ اور ضلع خلافت کمیٹیوں اور کانگریس کمیٹیوں کے پیہم اصرار اور احتجاج سے گاندھی جی نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرائی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ملک بھر کا دورہ کرے اور یہ معلوم کرے کہ آیا ملک سول ناظرانی کرنے کے لئے تیار ہے یا نہیں اور اس میں اس کی صلاحیت و استعداد ہے یا نہیں اور آیا تشدد کا مرض ”متعدی“ تو نہیں ہو رہا ہے۔

اس تحقیقاتی کمیٹی کو سائے ہندوستان میں دورے کے لئے حکم دینا، بیان لینا، شہادت لینا اور دوسرے حوادث و واقعات کو اس کے احاطہ تحقیق میں کرنا، جس مقصد کے ماتحت تھا، وہ پورا ہو گیا، یعنی دیکھتے دیکھتے تحریک میں انخطاط شروع ہوا اور چند ہی ہفتوں کے بعد تحریک قتل ہو گئی۔ گاندھی جی کی گرفتاری | اس ضمن حال کے باوجود گاندھی جی کچھ نہ کچھ کام کئے ہی جا رہے تھے ان کے دورہ اور تقریر کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک بار اجیر میں ایک تقریر کرنے کے بعد گاندھی جی بھی گرفتار کر لئے گئے اور اس طرح رہی سہی جان کا بھی خاتمہ ہو گیا اور جو قسم لگا رہ گیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

سوامی شروہانند کی رہائی | سوامی شروہانند جو اس تحریک میں سزا بابتھے اور جن مسلمانانِ دہلی نے جامع مسجد کے ممبر پر دعوتِ تقریر دی تھی، اور گوشِ ہوش سے ان کی تقریر سنی تھی، دفعۃً و بعتۃً میاں دوسری ختم ہونے سے پیشتر غیر مشروط طور سے رہا کر دئے گئے، اس رہائی کی وجہ بعد

میں معلوم ہوئی!

فسادات ملابار | بدقسمتی سے اسی زمانہ میں ملابار کے پرجوش اور مجاہد مسلمانوں میں طرح طرح سے اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، انھیں گورنمنٹ کے خلاف بھی اکسایا گیا اور ہندوؤں کے خلاف بھی۔

وہ ایک ایسی جماعت تھی جس کے اندر تعلیم کم اور جوش زیادہ تھا، چونکہ تعلیم سے نا آشنا تھی اس لئے اس کے اندر مصلحت بینی، دو رائے بینی اور نکتہ بینی کا مادہ بہت کم تھا اور چونکہ مسلمان تھی اور جنت کو تلواریں کے سایہ میں سمجھتی تھی اس لئے جوش جہاد موت سے بے خوفی، شہادت کی تمنا اور اسلام پر مرنے کی ہوس موجود تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے انگریزوں کو بھی پٹیا اور ہندوؤں کی خبر بھی لی اور اس کی پاداش انھیں یہ ملی کہ وہ جلا وطن کر دئے گئے، مفلس اور فقیر کر دئے گئے، تباہ و زنا دار کر دئے گئے، ذلیل اور بے عزت کر دئے گئے۔

وہ دن ہوا اور کنج کا دن، گورنمنٹ کا عتاب ان پر بدستور ہے، وہ اسی طرح جلا وطن ہیں اسی طرح فقر و فاقہ میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں، اسی طرح اپنی اmlاک و جاگیر سے محروم ہیں۔
ملکانہ راجپوتوں کی سندھی | سوامی شرومانند کی غیر مشروط اور قبل از وقت ہائی کا حال آپ کو معلوم ہو چکا ہے، انھوں نے آتے ہی اپنی کارگزاریوں کا ایک ثبوت جو آئندہ کے عزائم کا آئینہ وار تھا، یہ دیا کہ ملکانہ راجپوتوں پر بچا پ مارا۔

وہ بچا پے نام کے مسلمان تھے نہ کسی مولوی نے انھیں کلمہ پڑھایا، نہ کسی صوفی نے انھیں مرید کیا۔ نہایت آسانی سے قابو میں کر لئے گئے اور شدہ ہو گئے۔

اثر | اس خبر سے کہ ملکانہ راجپوت ہزاروں کی تعداد میں شدہ کر لئے گئے اور ابھی بہت

سے شدھ کے جائیں گے، مسلمانوں میں اک آگ لگ گئی اور ان میں ایک تازہ حرکت پیدا ہو گئی، لیکن اس حرکت کا رخ دوسری طرف تھا اور یہ جذبہ عمل کوئی دوسرا نتیجہ ظاہر کر رہا تھا۔

تبلیغ | فوراً مسلمانوں نے دفاعی طور سے تبلیغی مہم جاری کر دی اور بڑے زور شور سے تبلیغ کے ”قد اوم پوسٹر“ میدان میں نظر آنے لگے۔

اب مسلمانوں کے دل سے بھی آزادی کا سودا نکل چکا تھا اور وہ پورے طور پر مستعد تھے کہ پہلے ہندوستان میں اپنے قیام و بقا کا کوئی انتظام کر لیں اور شدھی اور سنگٹھن کا جو یہ طوفان اٹھا ہے اس کا مقابلہ کر لیں، پھر آزادی کا دیکھا جائے گا! مسلمانوں کو یہ احساس بھی تھا کہ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے اس کی تبلیغ تو نہ ہو اور جس مذہب کے لوگ سمندر پار جانے سے کافر ہو جاتے ہوں اور جہاں تبلیغ ایک جرم ہو وہاں تبلیغ ہو رہی ہو، یہ بات ان کے سمندر غیرت پر ایک تازیانہ ثابت ہوئی۔

انقلاب | ان تحریکوں کے شروع ہو جانے سے ملک میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا، پہلے ہندو مسلمان اس لئے ایک مقام پر مجتمع ہوتے تھے کہ پیمان محبت مستحکم کریں لیکن اب دونوں کی ملاقات اس لئے ہوتی تھی کہ قوت آزمائی کریں، پہلے ہندو مسلمان گورنمنٹ کے خلاف صف آرا تھے لیکن اب وہی ایک دوسرے کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے لٹکار لٹکار کر دعوت بہارت دے رہے تھے اور ایک دوسرے کا خون بہا کر خوش ہوتے تھے اور اسی کو سب سے بڑی سولج اور سب سے بڑی کامیابی سمجھتے تھے، پہلے اگر حلیہ اور جلوس غیر معمولی سے ہو گئے تھے تو اب فسادات کی خبریں کوئی ندرت، کوئی اہمیت اور کوئی حیرت نہیں تھی۔

جو کانگریسی تھے اور آزادی وطن کے لئے ہر قسم کے مصائب برداشت کرنے کو تیار تھے انھوں نے اب اپنی قامت پر لباس مہا بسمائیت چت کر لیا۔

جو خلافتی تھے وہ بھی تبلیغی بن کر میدان عمل نظر آ رہے تھے۔

لیکن اس حیرت انگیز واقعہ کو ہندوستان کی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی کہ آزادی کی جنگیں سب سے پہلے انہوں نے پیدا کیا، جو اکثریت میں تھے، سب سے پہلے ہندو مسلمانوں میں تفریق انہوں نے پیدا کی جو اکثریت میں تھے، شدھی و سنگٹھن کی ضرورت سب سے پہلے انہوں نے محسوس کی جو اکثریت کے بل پر زور والے، طاقت والے اور اقتدار والے تھے، سب سے پہلے اور سب سے زیادہ نمایاں حصہ شدھی و سنگٹھن میں انہوں نے لیا، جو یاد رکھے، جو کانگریسی تھے۔

کانگریس کے عقیدہ پر، اصول پر اور پالیسی پر انتہائی استقامت اور استقلال سے جو عہد قائم رہی وہ خلافت کی تھی! نہ وہ شدھی سے متاثر ہوئی نہ سنگٹھن سے، نہ تبلیغ نے اسے اپنی طرف مائل کیا، نہ تنظیم نے، وہ جماعت مسلمہ میں نہرور پورٹ کے بعد برگشتہ ہوئی! صبر کی کوئی انتہا ہے؟

سرمایہ خلافت کیا ہوا؟ | اور جو اسباب و واقعات عرض کئے ہیں اصل میں وہی تحریک کے زوال و انحطاط کے موجب ہیں جب یہ تحریک بالکل ختم ہو گئی اور آثار حیات مفقود ہو گئے تو اب مسلمانوں کو یاد آئے کہ خلافت کا سرمایہ کیا ہوا؟ بیکاری کا ایک بچہ شعلہ یہ بھی ہے، چھوٹا بیٹہ پر غبن کا الزام ثابت کر دیا گیا!

محمد علی کی گرفتاری کے بعد فضلاس درجہ مبہوم و ناموافق ہو گئی تھی!

باب ۲۲

رہائی اور کانگریس کی صدارت!

اپنے ایام اسیری پورے کر کے کم دیش دو سال کے بعد محمد علی کو پھر رہائی نصیب ہوئی، مرغ اسیر کو شلخ چمن پر پھر نغمہ سرائی کا موقعہ حاصل ہوا۔

آمنہ بیگم کی علالت | محمد علی کو جیل ہی میں اپنی منجلی صاحبزادی آمنہ بیگم کی علالت کی تشویش انگیز اطلاع مل چکی تھی اور وہیں سے انھوں نے اپنی بیمار لڑکی کو ”پیام زندان“ بھیجا تھا۔

تیری صحت بہن منظور ہو لیکن اس کو نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں جب وہ جیل سے رہا ہوئے تو دہلی میں اینٹیل کانگریس کی شرکت کے بعد سیدھے کوہ بھوانی نشتہ لے گئے جہاں نئی ٹوریم میں وہ بستر علالت پر دراز تھیں۔

رہائی کے بعد بیان | محمد علی نے رہائی کے بعد پریس کے نمائندہ کو ایک بیان دیا جس میں کہا۔
”میں ایک چھوٹے جیل سے نکل کر بڑے جیلخانہ میں آگیا ہوں، مجھے یہ دو جیل کی کنجی کی تلاش ہے تاکہ میں گاندھی جی کو رہا کر سکوں اور اس کے حصول کا انحصار آزادی پر ہے۔“

صدارت کے لئے نامزدگی | اسی سال محمد علی کو تمام صوبہ کانگریس کمیٹیوں نے بالاتفاق انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ جلسہ کے لئے صدر منتخب کیا اور اگرچہ وقت کم رہ گیا تھا لیکن پھر بھی محمد علی نے نہایت دلنشیں اور کامیاب خطبہ صدارت پڑھا جو اپنے مغز و تعلیم کے اعتبار سے، اپنی زبان و انشاء کے لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔

عہد صدارت | محمد علی کا عہد صدارت بہت پر آشوب تھا، اسی زمانہ میں شدھی و گنگھن اور

تبلیغ و تنظیم نے کانگریس کی گرمی بازار سرد کر رکھی تھی، ہندوؤں نے مہاسیما قائم کر لی تھی اور میلا تو
نے تبلیغ کانفرنس، آزادی کی منترل مقصود بعید تر ہوتی چلی جا رہی تھی اور کامیابی کی امید
روز بروز موموم -

ایک طرف تو یہ حالت تھی، دوسری طرف خود کانگریس کے اندر تفریق پیدا ہو چکی تھی۔
ایک مختصر سا گروہ تھا جو ”نوجہر“ تھا، یعنی کانگریس کے اصولوں سے بغاوت کرنا نہیں چاہتا تھا
اور انہیں اسلوب پر اپنی مستعدی اور جذبہ کا رکھ صرف کرنا چاہتا تھا، جنہیں کانگریس نے متعین
کر دیا تھا یعنی گورنمنٹ سے قطع تعلق کر کے بے نیاز ہو کے۔

دوسری جماعت تھی جو کانگریس کی، کسی زمانہ میں سرگرم کارکن رہ چکی تھی، وہ اب جوانی
تعاون کی پالیسی اختیار کرنے پر تکی ہوئی تھی، کونسل اور اسمبلی کے خوش نما اور خوش مزہ لیکن غائب
آور، مناظرے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی، اس جماعت میں کانگریس کے وہ تمام لیڈر تھے جن پر
غیر معمولی اعتماد کیا جاسکتا تھا، یعنی پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، مسٹر سی آر داس۔

موتی لال تو اسمبلی میں جانے کے لئے اس قدر مصر تھے کہ وہ فرماتے تھے، اگر کانگریس نے
یہ تجویز منظور نہیں کی تو میں کانگریس میں جھانکنے تک کا نہیں۔ اس طرح دھمکا کر وہ اپنا مقصد بڑی
حد تک گیا کانگریس میں حاصل کر چکے تھے اور اب کوکنا ڈا میں پھر حاصل کرنا چاہتے تھے۔

ایسے اڑک دور میں صدارت کرنا اور کامیابی سے اسے اتمام تک پہنچا دینا کچھ محمل علی ہی
کا کام تھا اس نے ان سب کی تالیف قلب کی، سب کو بھجایا اور جو لوگ اس کے نقطہ نظر پر
نہیں آ سکے انہیں بھی اس نے کانگریس نے جدا نہیں ہونے دیا۔

گاندھی جی کی رہائی | کچھ عرصہ کے بعد گاندھی جی جو چھ سال کے لئے ایسے زندان کے گھر
تھے اپنی شدید علالت کی وجہ سے رہا کر دیے گئے۔

گاندھی جی جب رہا ہوئے تو حسب توقع اپنے عقائد میں بہت سخت تھے اور اس پالیسی سے سخت متفق تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ کونسلوں میں جا کر گورنمنٹ کو شکست دیجائے، عہدے نہ قبول کئے جائیں لیکن صدارت قبول کی جائے اور کسی سرکاری کمیٹی کی ممبری نہ قبول کی جائے، ہاں کبھی کبھی اگر ”اسکیں کمیٹی“ کی ممبری قبول کر لی جائے تو زیادہ مضائقہ نہیں۔

محمد علی کی روش | محمد علی خود تو عقیدہ سخت کانگریس تھے اور وہ کسی طرح اس پر راضی نہ تھے کہ کونسل یا اسمبلی میں جائیں لیکن ان کے جو غلط کار دوست اس میں جاسے تھے ان کی راہ میں وہ حائل بھی نہیں ہوئے اور انھیں اپنی جماعت سے خارج بھی نہیں کرنا چاہا، گاندھی جی کی ہنجیال عقیدہ جماعت نے ”سوراج پارٹی“ کے خلاف کانگریس کے ایک جلسہ میں سخت جدوجہد کی اور محمد علی نے حسب معمول نرم گرم خود برداشت کر کے معاملہ ختم کر دیا اور سوراج پارٹی کے خلاف کوئی گاندھی آشرم میں بوجھار | آئینی اقدام نہیں کیا، اس پر جب وہ گاندھی جی کے آشرم میں پہنچے تو ان پر بہت سخت تنقید ہوئی کہ انھوں نے کیوں ایسا نرم رویہ اختیار کیا اور کیوں نہیں انھوں نے سوراج پارٹی کے خلاف جدوجہد میں کوئی عملی حصہ لیا، محمد علی نے اسے برداشت کیا اور اپنی صلح گل پالیسی میں فرق نہیں آنے دیا اور دونوں پارٹیوں سے اپنی ہمدردی کا اظہار اور ہرجات کے انصاف کا برتاؤ کرتے رہے۔

کانزاس | اس زمانہ میں سب سے بڑا کانزاسہ جو محمد علی سے ظہور پذیر ہوا وہ یہ کہ جب کانگریس اور سوراج پارٹی میں سمجھوتہ ہو گیا اور لوگ کانگریس کے کلکٹ پرائسبلی اور کونسل میں جانے لگے تو پنجاب خلافت کمیٹی، اور احرار پنجاب نے مجلس مرکزی خلافت کو بہت مجبور کیا کہ وہ بھی خلافت کے کلکٹ پرائسبلی اور کونسل میں جانے کی اجازت دے دیں تاکہ ان گلجھوں پر بھی ہمارا اثر و اقتدار رہے اور ان مقامات پر وہی لوگ جاسکیں جو ہمارے یعنی جہور کے مقصد علیہ ہوں۔

پنجاب خلافت کمیٹی نے اس تجویز کے منظور کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دی، لیکن محمد علی نے اس سے سخت اختلاف کیا۔ اور کہا کہ جس چیز کو خوب سمجھ کر اور غور و فکر کے بعد ہم چھوڑ چکے ہیں، اس کے تقاضے و معائب معلوم کر چکے اور اس کے محامد و محاسن کے ہم قائل نہیں ہوئے تو پھر کانگریس کی تقلید میں ایسا کرنا کہاں کی دانائی ہے؟

اور بالآخر یہی فیصلہ ہوا کہ ذاتی اور شخصی طور سے جس کا جو جی چاہے کرے، مگر خلافت کے ٹکٹ پر، خلافت کے نام پر اور خلافت کی حمایت میں کوئی شخص بھی کونسل یا اسمبلی کی امیدداری کے لئے نہیں کھڑا ہو سکتا۔

محمد علی کا یہ نہایت قابل فخر کارنامہ ہو کہ انھوں نے محض کانگریس کی پیروی اور اتباع کے جوش میں خلافت کمیٹی کو ان مفاسد سے بچایا جو اس صورت میں پیدا ہونے والے تھے۔
ممبر ہو سکتے تھے | حالانکہ اگر چاہتے تو وہ بہت آسانی کے ساتھ اسمبلی کے ممبر ہو سکتے تھے اس لئے کہ زیادہ سزا یافتہ شخص کی میری کے لئے شرط یہ تھی کہ وہ اجازت لے لے اور اجازت کی نوعیت ایسی تھی جیسے اخبار کے ڈیکلریشن کی جس کا تمنا یقینی ہے پچنانچہ لالہ لاجپت رائے وغیرہ کو بغیر کسی وقت کے اجازت مل ہی گئی اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ انھیں ”کانٹنٹی ٹیوشن“ معاملات سے بڑی دلچسپی تھی، پھر تو وہ اور زیادہ جانے کے حامی ہو سکتے تھے مگر اپنی اس ”دلچسپی“ کے باوجود انھوں نے اپنے اصول میں فرق نہیں آنے دیا۔

باب ۲۵

عہدِ تعطیل یا ردِ عمل

عام حالت | محمد علی کی رہائی کے بعد ملک کی جو حالت ہو گئی تھی اور انھوں نے ملک کو جس حالت میں پایا تھا اس کا سرسری اندازہ آپ کو سطور بالا سے ہو گیا ہوگا۔

اس سائے جمود و خمود اور اس سائے تعطیل اور فراموشی کی

اصل علت | اصل علت یہ ہو کہ ملک کے سامنے اس وقت کوئی پروگرام نہیں تھا جس پر عمل پیرا ہو کر اپنے عمل کو سنوارنا اور کوئی صحیح اقدام کر سکتا۔

یہی وجہ تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق پیدا ہوئی، اور کانگریس و خلافت کے بچاے تبلیغ و سنگٹھن نے ان کی جگہ لے لی۔

استقامت | محمد علی نے اپنی غیر معمولی استقامت کا ثبوت دیا اور اس ردِ عمل کا نہایت استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا، حالانکہ اگر وہ چاہتے تو انھیں تبلیغ میں شریک ہونے کے بعد، یا کانگریس کا مخالف ہو جانے کے بعد پھر سرانگھوں پر بیٹھایا جاسکتا تھا، لیکن انھوں نے رائے عامہ اور میلان عام کی اصل پروا نہیں کی اور جو علاج قوم کے لئے مفید سمجھتے تھے، اسی کا تجربہ قوم پر کرتے رہے۔

زرقار کی علیحدگی | محمد علی کے لئے وہ بہت ہمت شکن اور حوصلہ فرساز زمانہ تھا جب ایک رفیق الگ ہو رہا تھا جن دوستوں اور ساتھیوں پر سب سے زیادہ اعتماد تھا وہی اپنی کارگاہِ عمل سے کل کر حریف کے کیپ کو زینت بنے ہوئے تھے۔

موتی لال چیمبر پر کیٹس شروع کر چکے تھے، واس سورج پارٹی کے ناخدا بن چکے تھے، دوسرے

شکر کا بھی الہ آباد اور لکھنؤ میں اپنی اپنی وکالت و سرسٹری کو فروغ دینے کے سامان کر رہے تھے۔
دوسری طرف علما کا گروہ پورے طور سے علیحدہ ہو چکا تھا، تبلیغ و تنظیم اس کے دائرہ عمل کا
اہم جزو قرار پا گئی تھی۔

تیسری طرف ڈاکٹر کھلپو نے تنظیم کا ایک متوازی ادارہ قائم کر دیا تھا، اور اکثر متعدد علیہ رفتار
کنج کھنچ کر اس طرف جا رہے تھے، مولانا عبدالمجید بدایونی، مولانا نثار احمد کانپوری اور دوسرے
بزرگ علی الاعلان خلافت سے الگ بلکہ بیزار اور تنظیم کے شریک کار ہو چکے تھے۔

محمد علی بھی اگر چاہتے تو مسٹر تانبے، سر سید ناتھ بھرجی، بیمن چندر پال اور سنگرن ناتھ کے طرز
عمل کی پیروی کر کے گورنمنٹ کے حلقہ میں خاصا رسوخ پیدا کر سکتے تھے، ہندوؤں کو گالیاں دیکر
مسلمانوں میں اپنا اقتدار بحال کر سکتے تھے، لیکن یہ واقعہ ایک تاریخی واقعہ کہ اس وقت وہ نہایت
استقلال سے کانگریس کے ”واماندگان“ کی صف میں نظر آتے رہے جب اس کا بازار سرد ہو چکا
تھا اور گرمی محفل کے اسباب دوسری جگہوں پر پائے جاتے تھے۔

محمد علی کے تاثرات | محمد علی نے اس حالت پر خود بھی ایک بار ضحکہ اظہار خیال کیا تھا، وہ کہتے

ہیں:

”دو سال تک ہندوستان نے جس سامان بربانی کا معائنہ کیا، وہ فرانس کے انقلاب
کی یاد کو تازہ کرتا تھا، مگر جب حکومت نے ہندوستان کے بڑے اور چھوٹے تیس چار
ہزار لیڈروں کو جن میں ہندو مسلمان سکھ، انگریزی تعلیم یافتہ، مولوی اور پٹن
سبھی شامل تھے، جیل خانوں میں بھر دیا اور عوام ایک بے سری فوج کی طرح
گئے تو حکومت کے گرگے اور وہ لوگ جن کی ”لیڈریاں“ اس عجیب و غریب ہنگام
میں اند پڑ گئی تھیں، سکھ اور عوام کو ان کے صحیح رہنماؤں سے جو قید و بند میں گرفتار

تھے، بدظن کرنا اور انھیں گمراہ کرنا شروع کیا، ایک طرف شادی اور نکاح کی تحریکوں نے زور پکڑا دوسری طرف تبلیغ و تنظیم کی صدائیں بلند ہونا شروع ہوئیں اور زیادہ تر وہ لوگ سربراہ اور وہ نظر آنے لگے جو آزمائش کے وقت گوشہ عافیت سے کبھی باہر نہ نکلتے تھے، اب یہی سب سے بڑے قائد تھے اور انھیں کے لئے جبکارے لگائے جاتے تھے اور انھیں کے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے تھے۔

جب ترک تعاون کی آزمائش والے زمانہ کے قید خانوں سے نکلے تو انھوں نے اصلاح کی بہت کچھ کوشش کی، مگر اب طوائف الملوکی کا زمانہ تھا، ہر شخص ”لیڈر“ تھا، مفت داؤں کی اتنی کثرت تھی کہ مقتدی مشکل ہی سے کسی کو میر آتے تھے، عوام پریشان تھے کہ کس کو رہنما سمجھیں، ایک، ایک راستہ پر لجانا چاہتا تھا تو دوسرا دوسرے راستہ پر اور ایک رہنما دوسرے رہنما کو رہنما قرار دے رہا ہے، سب الگ الگ سرالاپ رہے تھے ”ذوق نغمہ“ کی شدت اور کثرت اب کہاں میر آتی بہت سی طوطیوں نے اس نقار خانہ میں اپنی صدا کو بلند کر دیا جن کی غرض نمائش تھی انھوں نے اس غرض کو پورا ہوتا ہوا نہ دیکھ کر خاموشی اختیار کی، بعض نے اس جھج پکار میں اپنی صدا بلند کرنے کو ازراہ فرزانگی میٹو بھا اور اقبال کی طرح کہنا شروع کیا کہ

فرخ اہل عالم میں تغیر آگیا ایسا کہ رخصت ہو گئی دنیا کی کیفیت وہ سیابی
فتانیم شب شاعری با گوش ہوتی کہ نہ ہو چشم مفضل شک لطف خوابی
کسی کا شعلہ زیاد ہو ظلمت رہا کیونکہ گراں ہر شب پستوں پر سحر کی آسمان تابی
ابھاتا کاغذ می خاموش ہو گئے اور ہمارے بعض ساتھیوں نے تو سکوت ہی اختیار کیا

فرمایا بلکہ ایک نقارہ نے کراسی نقارخانے کے نقارچی وہ بھی بیٹھے۔
لیکن ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے نہ سکوت اختیار کیا، نہ کوئی نیا سلاخ
شرع کیا اور سامعین کی قلت اور بے پروائی کا مطلق پاس نہ کر کے ہم نے
حافظ ہی کے شعر پر اپنا عمل جاری رکھا،

حافظ وظیفہ، تو دعا گفتن است بس در بندایں مباش کنشید یا شنید
ہم نے اور ہمارے چند ساتھیوں نے ذوق نغمہ میں کمی محسوس کر کے جس قدر تلخ
نوائ کی اور محل کو گراں پا کر جس قدر صدی کو تیز تر کیا اسے ہم جانتے ہیں ہمارا خدا
سب سے حیرت انگیز جو چیز ہے وہ یہ کہ ہم مسلمانان عالم کی موجودہ ذہنیت کو بدل کر
انہیں از سر نو تائیس خلافت راشدہ کی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک بار
پھر تمام مسلمانان عالم ایک ہی رشتہ میں منسلک ہو جائیں اور خلافت کیٹیوں کا
سلسلہ ہر ضلع کے ہر گاؤں اور ہر شہر کے محلہ سے لے کر ہر صوبہ، ہر ملک، ہر براعظم
میں پھیلتا ہو اور خلافت راشدہ تک پہنچ جائے اور ہم یورپ کی شہنشاہیت
یا امپریلزم کی جڑ بنیاد کو اوٹھیر کر چھنکنا چاہتے ہیں اور نہ صرف ہندوستان کو بلکہ
تمام مشرقی ممالک اور بالخصوص اسلامی ممالک کو اس کے پنجہ سے نکال کر آزاد
کرانا چاہتے ہیں اور تمام عالم اسلام میں پھیلانا چاہتے ہیں۔

راے | یہ محمد علی کا وہ سچا خاکہ جو انہوں نے خود پیش کیا ہے اور بلا خوف تردد کہا جاسکتا ہے
کہ اپنی زندگی بھر انہوں نے اپنے اس بیان کردہ اصول کو نبھایا، تغیر محمد علی میں نہیں ہوا، بلکہ گرد
پیش کن حالات میں ہو جنہوں نے محمد علی کو مجبور کر دیا کہ وہ اب مدافعت کریں اور صلح جوئی
کا دروازہ بند کریں۔

اس عنوان کے بعد محمد علی کے اس کارنامہ کا ذکر آئے گا جو ہندوستان کے لیڈروں میں
بہت نادر الوجود ہے اور جس نے محمد علی کی قدر و قیمت میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا۔
یعنی کانگریس سے وفاداری! محمد علی کی وفاداری ”بشرط استواری“ تھی، جب تک
یہ شرط پائی گئی ان کی وفاداری غیر متزلزل رہی، لیکن جب یہی چیز منفق و مہو گئی تو بیشک ان
کی وفاداری بھی ختم ہو گئی ورنہ ان کے معتقدات سیاسی وہی تھے جو ۱۹۲۰ء میں اور اس
کا بہترین ثبوت ان کی گول میز کانفرنس کی تقریر ہے۔

باب ۲۶

کانگریس سے وفاداری

کانگریس کی تاریخ اور محمد علی کی زندگی کا یہ نہایت روشن صفحہ ہے۔

کانگریس میں اب پختگی آگئی ہے اور اس کے حامیوں میں سنجیدگی کے ساتھ جذبہ آزادی پیدا ہو گیا ہے، لیکن تحریک شدہ شیو شیکشن کے زمانہ کا رنگ بالکل جدا کاڑھا، اس وقت سرفاری دس فرازی کا تاج اس کے سر پہ تھا جو ہندو مسلمانوں میں لڑائی پیدا کرانے اور تجارت و دولت کا برباد اس کے ساتھ جو اتفاق و اتحاد کی تلقین کرے، اس زمانہ میں محمد علی پہاڑ کی طرح اپنے مقاصد و داعیات کے علمبردار ہے، اور کسی طرح بھی جادہ حق سے ان کے قدموں کو جنبش نہ ہونی۔
تبلیغی جماعتوں کی دعوت | ہندوستان کی تبلیغی جماعتوں نے محمد علی کو دعوت دی، ان کے عقیدہ مندوں اور پیروؤں نے انہیں مجبور کرنا چاہا کہ وہ بھی تبلیغ کے میدان میں قدم رکھیں لیکن محمد علی نے ایسا نہیں کیا۔

اپنی مشہور اور مسلمہ مذہبیت کے باوجود محمد علی نے کیوں تبلیغ کے میدان میں قدم نہیں رکھا؟
یہ ایک حل طلب سوال ہے

جواب بالکل صاف ہے، اس وقت تبلیغی ادارے اور تبلیغی پوسٹرس جس انداز سے چل رہے تھے وہ ایک سنجیدہ مسلمان کے شایان شان نہیں تھے، نیز تبلیغ کا جو اصل مقصد ہے وہ بعید تر ہوتا جا رہا تھا، نظر صرف اس پر تھی کہ غلغلہ کس کا بلند ہو رہا ہے؟ شور کس کا ہو رہا ہے، شہرت کے میدان میں حیت کس کی ہوئی؟

ان شیطانات سے محمد علی الگ رہے۔

پھر تبلیغ کا وہ انداز بھی محمد علی کو پسند نہیں تھا جس انداز پر کام شروع کیا گیا تھا وہ اس تبلیغ کے مخالف تھے کہ صرف خارجی موثرات سے اسلام کی دعوت دی جائے وہ اس کے حامی تھے کہ اسلام ایسے رنگ روپ میں پیش کیا جائے کہ ہر شخص میں خود طلب و جستجو پیدا ہو، اس کے بعد جو اسلام لائے گا وہ سچا مسلمان ہوگا اور وہی اپنے اسلام پر مستقیم ہوگا۔

جمعیت تبلیغ انبالہ | ہندوستان میں صرف ایک تبلیغی ادارہ ایسا پیدا ہوا جو صحیح معنوں میں تبلیغ کا اہل تھا، یعنی میرنریگ کی جمعیت تبلیغ، اس انجمن کے ساتھ محمد علی کی ہمدردیاں ہمیشہ رہیں اور ہمیشہ انھوں نے اس کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔

بلغام خلافت کانفرنس | بلغام خلافت کانفرنس کے صدر صاحب محمد علی کے ”یکے از اسیان کراچی“ رفیق تھے جو اس وقت ہندوؤں سے سخت بیزار تھے اور تنظیم کا علم جہاد کے کھرٹے ہوئے تھے۔

اس زمانہ میں یہ دستور ہو گیا تھا کہ قومی مجالس کے خطبہ ہائے صدارت بہت زیادہ آتشیں ہوتے تھے، ہندو سیما، آریہ لیگ، جمعیت تنظیم، مسلم لیگ ان تمام جماعتوں کے خطبہ صدارت اٹھا کر ملاحظہ فرمائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک مستقل دعوت جنگ ہو جائے ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو نہایت رستمانہ انداز سے سے رہا ہے۔

خلافت کانفرنس بلغام کے صدر منتخب بھی ان جذبات سے متاثر تھے، ان کا خطبہ صدارت نرم کیے ہو سکتا تھا، انھوں نے بھی ایک نہایت آتشیں خطبہ صدارت تیار کیا تھا اور ہندوؤں کے طرز عمل پر نہایت تلخ انداز میں نکتہ چینی کی تھی اور مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ان کے ”مقلد“ کے لئے صاف آرا ہو جائیں، اسی مفہوم کو اگر نرم و ملائم الفاظ میں ادا کیا جاتا تو زیادہ مضافت

نہیں تھا، لیکن غضب یہ ہوا کہ اسے نہایت ہی سخت لہجہ میں ادا کیا گیا تھا۔

محمد علی کی اصلاح | وقت بہت کم رہ گیا تھا، صبح خطبہ صدارت پبلک میں آنے والا تھا، محمد علی خٹا کانفرنس کو میدان جنگ بنانے پر راضی نہیں تھے اس لئے رات بھر جاگ کر محمد علی نے خلافت کانفرنس کے صدر کے خطبہ صدارت میں قطع و برید کی اور اس کے ناقابل برواشت اور سخت جملوں کو خارج کر دیا، پھر بھی وہ ایک حد تک سخت رہا، لیکن اب پہلے سے بہت کم ہو گیا تھا۔

بنگام کانگریس | ستمبر میں بنگام کانگریس کے گاندھی جی صدر تھے اس میں ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوا کہ آیا کانگریس کی ممبری کے لئے کھدکاتنے کی شرط رکھی جائے یا نہ رکھی جائے؟ ”نوجیز“ اس کے حامی بلکہ زبردست محرک تھے اور سوراج پارٹی کے محترم ارکان کو سخت اختلاف تھا۔

مولانا حسرت موہانی تو کھدکاسی کی شرط کے نہیں قائل تھے مگر دوسرے لوگ یعنی ٹھیل بھائی ٹیل، پنڈت موٹی لال نہرو، مسٹری آرداس، لالہ لاجپت رائے وغیرہ کھدکاسی تھے لیکن ہر ممبر کے لئے اس کے کاتنے کی شرط کو ”مضحکہ خیز“ تصور کرتے تھے، محمد علی کا تعلق پہلی جماعت سے تھا اور وہ اس شرط کے سخت حامی تھے، چنانچہ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

”چرچہ کو شرط ممبری ہونا چاہئے، جو اتنی ہی مقدار کی کم از کم قربانی ہو اگر کوئی جرمن پروفیسر اپنے طول طویل نام کے ساتھ کہدے کہ چرچہ آزادی حاصل کرنے کا تہا ذریعہ ہے تو چرچہ کاتنے میں کافی جوش پیدا ہو جائے اور اس وقت ہندوستان بلا پس پیش چرچہ کو قبول کرے مگر چونکہ یہ بات ایک ہندوستانی نے کہی ہے، اس لئے لوگ شک کرتے ہیں۔“

ناہے کہ اس تقریر نے بعض لوگوں کے چہروں پر نہایت نمایاں تغیر پیدا کر دیا!

فادات کو ہاٹ | کو ہاٹ کا فساد وہ پہلا واقعہ ہے جس کا مذہبی جی اور ان کے جنرل مولانا شوکت علی میں اختلاف رائے پیدا ہوا اور یہی وہ پہلا دن ہے جس سے ہندوؤں نے بالخصوص ہندو پریس نے علی برادران کی مخالفت کرنے کی ٹھان لی۔

مختصر واقعہ یوں سمجھئے کہ کو ہاٹ میں فساد ہوا، ہندوؤں کو شکایت تھی کہ مسلمانوں نے زیادتی کی، مسلمانوں کا بیان تھا کہ ”چھیڑ“ کا آغاز ہندوؤں کی طرف سے ہوا۔

کانگریس کا وفد | کانگریس کا ایک وفد جو گاندھی جی اور مولانا شوکت علی پر مشتمل تھا کو ہاٹ کے قصد سے روانہ ہوا، مگر گورنمنٹ نے وفد کو کو ہاٹ جانے کی اجازت نہیں دی اس لئے وفد نے اپنی کارروائی غالباً راولپنڈی ہی میں کر لی تھی، مسلمان بیان دینے نہ آ سکے، صرف دو ایک آدمی آئے اور ہندوؤں کی کافی جماعت آئی اور اس نے شہادت دی جب رپورٹ شائع ہوئی تو گاندھی جی نے مسلمانوں کو قصور وار ثابت کیا مولانا شوکت علی نے اس الزام کو قبول کرنے سے اس لئے انکار کیا کہ جانیں کے بیانات مساوی اور قابل قبول طور پر نہیں حاصل ہو سکے۔

تنہا پیش قاضی رومی رہتی آئی

کوئی انصاف کا اصول نہیں ہے۔

گاندھی جی نے اس اختلاف کو شرافت کے ساتھ برواشت کیا اور شوکت صاحب نے وقاداری کے ساتھ اختلاف کیا، مگر ہندو پریس میں اک آگ لگ گئی اور آفت برپا ہو گئی

محمد علی کا نظریہ | لیکن محمد علی کا نظریہ ان دونوں سے مختلف تھا، وہ یہ کہتے تھے کہ فساد ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ فادات کا ہونا لازمی ہے قوم کے لیڈروں نے اگر اس وقت یہ روش اختیار کی کہ اپنی قوم کو بے قصور بتلایا اور دوسری قوم کو قصور وار تو اس سے اختلاف کے بڑھنے کا اور زیادہ امکان ہے اور ہمیں اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے اختلافات

کم کریں اور آزادی کی منزل مقصود کی طرف کوچ کریں، لہذا بہترین صورت انھوں نے پیش کی کہ ہریڈرا اپنی قوم کی غلطیوں پر اسے سرزنش کرے اس لئے کہ یہ تو مسلم ہر مالی دونوں ہاتھوں سے بچتی ہو، چنانچہ اس فساد کے بعد پنجاب پر وائشل خلافت کانفرنس میں محمد علی نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

”یہ وقت نہیں ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے سرالزام تھوپے بلکہ موزوں یہی ہو کہ ہر شخص اپنے ہم مذہبوں کو متنبہ کرے اس لئے فسادات کو ہاٹ کی جتنی ذمہ داری مسلمانوں کے سر ہے، میں انھیں ملامت کرتا ہوں۔“

صرف اسی موقع پر نہیں بلکہ ہمیشہ محمد علی نے یہی کیا اور مسلمانوں میں غیر ہر دلعزیز ہوتے رہے۔ اور صرف اسی موقع پر نہیں بلکہ ہمیشہ ہندو زعماء نے یا تو ”سکوت مصلحت شناس“ پر عمل کیا اور یا پھر ”سچی سچی باتیں“ باطل ”مجبور“ ہو کر ان کو مسلمانوں کے متعلق بیان کرنا چاہا۔ دھرم شالہ چھیدی لال کا جلسہ | ۱۳ اپریل ۱۹۳۷ء کی رات کو قومی ہفتہ کے سلسلہ میں دھرم شالہ چھیدی لال میں کانگریس کی طرف سے ایک جلسہ منعقد ہوا، حاضرین کی تعداد بہت کم تھی لیکن محمد علی اس مدوجزر سے واقف تھے، ان پر اس کا باطل اثر نہیں ہوا، انھوں نے اپنی تقریر شروع کی۔

تقریر | ”آج کے جلسہ میں بہت کم حاضری ہو مگر اس افسردگی کا اثر ان لوگوں پر کچھ نہیں پڑ سکتا جو اپنے عقیدہ اور رائے پر پکاڑ کی طرح قائم ہیں اگر آج یہاں صرف دو آدمی ہوتے تب بھی جلسہ کیا جاتا، اس وقت تک ہم لوگ برابر نپا کوششوں میں مصروف و مشغول رہیں گے جب تک ہم اپنی رائے اور عقیدہ کو صحیح سمجھتے ہیں۔“

آج جو افسردگی و اضمحلال آزادی کی تحریک میں پیدا ہو گیا ہے، یہ کوئی نئی چیز

نہیں ہو، ہمیشہ ہر ملک میں تحریک آزادی کو نشیب و فراز سے گزرنا اور پستی و بلندی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔“

موتی لال سے اختلاف کی وجہ | اپنے اور پنڈت موتی لال نہرو کے اختلاف پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد علی کہتے ہیں۔

”میرا ان کا سارا اختلاف اسی باعث ہو کر اہل تو انھوں نے مہاتما گاندھی کے قید و بند کے زمانہ میں ان کے خلاف بغاوت کی اور کانگریس کے دو ٹکڑے کر ڈالا دوسرے انھوں نے ایک اور باغی لالہ لاجپت رائے کی امداد حاصل کرنے کی امید پر صوبہ سرحد اور سوراج پارٹی دونوں کے مسلمانوں کی حق تلفی کر گوارا کیا اور حق پر ثابت قدم نہ رہے۔“

محمد علی کی یہ تحریر اس وقت شائع ہوئی تھی جب مسلم لیگ میں موتی لال نہرو صاحب نے امیلی کے اندر صوبہ سرحد کو مسادی حقوق مینے سے اختلاف کیا تھا۔

ایک غیر مسلم اخبار کا اعتراف | ایک غیر مسلم اخبار جس نے ہمیشہ کسی نہ کسی نہج پر محمد علی سے اختلاف کیا، محمد علی کی اس خبری کا وہ بھی مداح تھا کہ جب کانگریس سے لوگ کٹ رہے تھے، محمد علی نے اپنے تعلقات اور زیادہ مستحکم کر لئے، وہ لکھا ہے۔

”گو آج عدم تعاون کی تحریک کمزور ہو جانے کے باعث ہندوستان کے سیاسی مہان پر مہاتما گاندھی اور ان کے رفیقوں کا علم بلند نہیں ہو رہا ہے اور ملک کے اندر شدھی تبلیغ کی موجودہ مافوسناک گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، مگر ملک کے محترم لیڈر مولنا محمد علی کی قابلیت، خلوص اور قومی خدمات کی یاد لوگوں کے ذہن میں اس وقت تک محفوظ رہے گی جب تک کہ ہندوستان کے رہنے والوں کے

دلوں میں حریت و آزادی کے خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے ۛ

ایک اہم اختلاف | سترہ میں پنجاب کے ایک لیڈر اور اسلامی ہند کے ایک شاعر نے پنجاب کو قسمل میں ایک تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں ہندو مسلم افسران کے بجائے انگریز افسران کا خیر مقدم کروں گا۔

محمد علی کو ان خیالات سے قدرتی طور پر سخت اختلاف ہونا چاہئے تھا، چنانچہ انھوں نے اس تحلیل سے سخت اختلاف کیا اور اس موضوع پر اپنے گرائڈر خیالات پیش فرمائے جو سہرورد کی کئی اشاعتوں میں کئی کئی کام میں شائع ہوئے، ہم اس مضمون کے اہم حصص کا خلاصہ محمد علی ہی کے الفاظ میں درج ذیل کرتے ہیں۔

”وہ آج ہمارے مرض کا علاج اسے نہیں سمجھتے کہ ہندوؤں کو غیرت دلائیلی کوئی کیجائے کہ اقلیت کے ساتھ نا انصافی نہ کرو جب تک اس کو رام نہ کر کے سورا نہ لے سکو گے اس کے استیصال کا خیال حاقت نہیں جنوں ہے۔“

تاریخی تشیل | جب محمد بن قاسم مٹھی بھر مسلمانوں کو لے کر سندھ میں داخل ہوا تھا تب اس کے استیصال کا اچھا موقع تھا تم نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے دیا جب محمود غزنوی سترہ بار ہندوستان آیا اور سائے ملک میں گھوما گھوما پھر اگروہی چند ہزار فوج کے ساتھ تب بھی موقع تھا کہ اس اقلیت کا استیصال کر دیا جائے اس وقت بھی تم نے اس کا استیصال نہ کیا، اس کے بعد شہاب الدین غوری آیا تم نے اس موقع کو بھی ہاتھ سے جانے دیا، غلاموں تک کے خاندان نے یہاں بادشاہی کی اور بظاہر تم نے اسے بھی قبول کر لیا پھر ایک فرغہ سے بھاگا ہوا غلام بابر یہاں آیا اور تم نے سارا گھر بار اسے مے ڈالا اس کے بیٹے کو یہاں سے

بھالابھی تو اس کے بھائیوں نے یا مسلمان بھائیوں نے اور ان بھائیوں کے ہاتھ سے بھی عنان حکومت نکلی تو پھر اسی کے ہاتھوں آگئی، اور اس کے بعد بھی بنے بقال اس ملک کی حکومت کو ان مغلوں کے ہاتھ سے نہ چھین سکے جو رانا سنگھ جیسے راجپوت پر غالب آئے تھے، ایک اور مغل اکبر نامی اس ملک پر حکمران ہو کر رہا، تم نے سکھوں کو بھی جو اسلام سے بہت ہی قریب آگئے تھے مغلیہ حکومت سے بھڑوا دیا، تب بھی سوا اس کے کچھ نتیجہ نہ نکلا کہ بجائے دہری مذہبی جاعتوں کے تین بن گئیں، جب انگریز عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد چند ہی سال میں کئی بار بھائیوں، بھائیوں میں پھر تخت کے لئے جنگ چھڑی اور جو جیتا وہ بھی عیاشی میں پڑ گیا اور وہ مرہٹوں کی قوت جس کو اپنا مطیع و منقاد بنانے کا عزم بالآخر کر کے اورنگ زیب دہلی کو چھوڑ کر وکن گئے تھے اور ۲۶ برس تک جب تک کہ وہ اور زندہ ہے اس میں مصروف ہے اور بالآخر اس قوت کو دبا کر ہی انھوں نے دم لیا اور دم دیا، وہ قوت پھر بڑھنے لگی اور ایک سینا جی کی جگہ چار چار مرہٹے راجہ برہمن پیشوا کے درباری بنے اور جب نادر شاہ نے مغلیہ سلطنت کو بالکل ضعیف چھوڑا تو سب نے مل کر اتنی بہت کی کہ دہلی پر دھاوا بول دیا، اس وقت بھی ایک غریب الوطن بھائی احمد شاہ ابدالی نے بہادری کو اس طرح شکست دی کہ پھر بھی اس قوم نے شمال کا رخ نہیں کیا، بہادری نہ دھیا ایسا بہادری پانی پت سے اس طرح بھاگا کہ ساری عمر وہ اس تعاقب کرنے والے بھائی کو نہ بھولا جس کا چھوٹے قد کا گھوڑا اس کے پیچھے برابر چلا آ رہا تھا اور اس کے نتھنوں نے نکلتی ہوئی بھاپ جے وہ بار بار مڑ کر دیکھتا

تھا تو لز جاتا تھا، ساری عمارتیں خواب میں سناپی رہی، وہ آخری موقع تھا کہ تم اس اقلیت کا استیصال کر سکتے تھے مگر تم نے اس کو بھی ہاتھ سے کھو دیا، احمد شاہ ابدالی نے غضب کیا کہ تم کو تباہ بھی کیا اور خود قیام بھی نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے بھی سلطنت مکمل گئی اور تمہیں بھی نذر سکے، سات ہزار میل کے فاصلہ سے سات ہزار بار کر کے کچھ سوداگر جہاگیر کے دربار میں تجارت کرنے کی اجازت لینے آئے تھے انھوں نے جہاگیر کے وارث اندھے شاہ عالم کو دوسو برس کے بعد اپنی "حفاظت" میں لے لیا اور اس کی اور تہاری دونوں کی رہی یہی طاقت کو مٹا کر اپنی سلطنت قائم کر لی۔

راہ عمل کیا ہو | اب اگر غلامی سے بھگتا ہے تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ ہم تم ایک دوسرے کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کریں ایک دوسرے کی طرف سے جوازیت زبان سے یا ہاتھ سے پہنچتی ہے اس پر صبر کریں، مگر اس غلامی کو ہرگز نہ برداشت کریں جس میں تم بھی سو ڈیڑھ سو برس سے مبتلا ہو اور ہم بھی، اور جو یقیناً ہندو راج سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے اور مسلم راج سے بھی۔

دشمن منتخب کر لو | نہ ڈاکٹر . . . صاحب اسے ہمارے مرض کا علاج سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو صبر کی تلقین کریں اور ان سے کہیں کہ گو یہ یقینی امر ہے کہ تمہیں خدا کی خاطر ساری خدائی سے لڑنا پڑے گا لیکن تم ایک ہی وقت میں ساری دنیا سے نہیں لڑ سکتے دشمنوں میں سے ایک کو جھانٹ لو جسے تم الہ انصاف سمجھتے ہو جو تمہارے دشمنوں میں سب سے زیادہ قوی ہے، اگر ہو سکے تو اس کے خلاف اور لوگوں کو اسی طرح اپنا حلیف بنا لو جس طرح رسول اکرم نے یثرب کے یہودیوں تک کو مشرک

مکہ کے خلاف اپنا حلیف بنایا تھا، اگر کوئی جماعت بھی تمھارے سیاسی تدبیرے رام ہو کر تمھاری حلیف نہ بن سکے تب بھی ہر محاذ جنگ پر یکساں زور نہ لگاؤ اور محاذوں پر صرف مدافعت کرتے رہو اور جس محاذ پر جہاں جنگ کا فیصلہ ہونے والا ہو پورا زور صرف کرو، اور جبکہ صبر و ضبط سے کام لو، جب سب بڑے محاذ جنگ پر فتح حاصل ہو جائے تو دوسرے محاذوں پر آپ ہی فتح حاصل ہو جائے گی اور اس وقت ایک ایک کر کے ہر دشمن سے دل کھول کر انتقام لے لینا، یہ امر دیکھ نہیں ہے بلکہ اسی کو عزم کہتے ہیں۔

الداخصام کون ہے | اگر چین و عرب بھی تمھارے ہیں اور ہندوستان بھی تمھارا ہے اور تم سب مسلمان ہو اور سارا جہان تمھارا وطن ہے تو اسی دشمن کو الداخصام سمجھو جو سائے جہان پر حاوی ہونا چاہتا ہے، یقیناً وہ دشمن ہندو نہیں ہے، اس غریب کی تنگ و دو تو مندر کے کنارہ تک ہے، یہ تو گولڑا کھا بیٹھا ہے جس کی ساری دنیا اسی گولڑے میں محدود ہے، ایمان سے کہو کیا تم اس سے خائف ہو؟ ریل پر کسی ڈبے میں چھ سات ہندو ہوں اور ان میں تم بھی جا کر بیٹھ جاؤ تو کیا تمہیں ان سے ڈر لگے گا بعض اوقات تو انہیں کو تم سے ڈر لگتا ہے، البتہ اگر اس ڈبے میں دو چار گوسے ہوں تب تو تم کو اور ان کو دونوں کو ڈر لگتا ہے، کہ یہ سارے گیسے یا سامان پھینک دیں گے یا گالی دیں گے یا پانوں دبوائیں گے آج اگر ہندو تم پر ظلم کرتے ہیں، تمھارے سیاسی و مذہبی حقوق پامال کرتے ہیں، تمھاری عبادتوں میں خلل ڈالتے ہیں تو اس لئے کہ حکومت تمھاری اور تمھارے حقوق کی حفاظت میں کوتاہی کرتی ہے، نیز اگر تمہیں ان سے لڑنا ہی ہے تو

کس ہتھیار سے لڑو گے؟ لٹھ پونگے میں تم اب بھی درہتے ہو اگر آج انگریز بیچ میں
 نہ کوڈ پڑیں تو تم اب بھی ان سے جھگتے ہو ایک جگہ بھی تو آج تک دن بھر
 لڑائی نہ ہونے پائی، پولیس آجاتی ہے، فوج آجاتی ہے اور بالآخر اپنے اپنے
 گھروں میں دبا کر بیٹھ جاتے ہو، پھر کپڑے دھو کر شروع ہوتی ہے جن مسلمانوں
 کے لئے تم گلا بھاڑ پھاڑ کر چننا کرتے تھے کہ سرکار سی نوکریاں انھیں دی جائیں وہ
 تو اس خوف کے مارے کہ کہیں سرکار انھیں متعصب اور طرفدار سمجھ کر برخواست
 نہ کرے، بعض اوقات خود ہی نا کردہ گناہ مسلمانوں تک کو بھنپوا دیتے ہیں۔
 سہارنپور میں کیا ہوا؟ علیگڑھ میں کیا ہوا؟ وہ تو ہندو ہی ہیں جو خود تمہارا
 قول کے مطابق اپنے مجرموں تک کو چھٹوا دیتے ہیں اور جہندو پولیس افسر
 ہندو ہا بھاکے صدر سے بقرعید کی صبح کو ٹیلیفون پر احکام لیا کرتے ہیں کہ کس
 محلہ اور کس گلی اور کس بازار میں پولیس زیادہ لگوائی جائے؟ اور کس میں کم؟
 جب مقدمات کچھری میں پہنچ جاتے ہیں تو تمہارے یہاں وکیلوں کا کال ٹیچا
 ہے، خود تمہارا بیان ہے کہ عبدالرشید کے مقدمہ پر ایک بیرسٹر نے چار سو روپیہ
 روز رکھوائے اور اگر شب قبل میں آٹھ بجے سے پہلے یہ رقم وصول نہ ہو گئی تو
 بوریہ بھنا باندھ اسی وقت اسٹیشن کا رخ کرنے کی دھمکی دی، نہ سشن میں نہ
 ہائیکورٹ کی اپیل میں کسی نامور مسلمان بیرسٹر نے پوری فیس نہ لے کر پیروی
 کرنا قبول کیا؟ اندور میں آج بھی مسٹر آصف علی جن کے لئے انتخاب میں بوڑھو
 اور مفلوج مسلمان تک پالکیوں میں پڑ پڑ کر ووٹ دینے کے لئے آئے تھے غریب
 مل کے مزدوروں سے دس ہزار اپنے لئے اور ایک ہزار اپنے منشی کے لئے (۱)

ٹہرا چکے تھے اور بنگلہ کا کرایہ ستر ہزار علیحدہ اور کھانے کا خرچ ڈیڑھ سو ہزار
مستزاد اور ڈیڑھ سو ہزار موٹر کا خرچ سو نے پر ہاگ۔

جب حالت یہ ہو تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ فسادات سے جہاں تک ہو سکے بچا
جائے! ”

کانگریس کی حمایت میں، انگریزوں کی مخالفت میں، ہندو مسلم اتحاد کی موافقت میں اس
سے بڑھ کر کچھ کہا جاسکتا ہے؟ یا کسی بڑے سے بڑے مدبر نے ایسے نفسیاتی دلائل کبھی پیش کئے ہیں؟
بہنی تحقیقاتی کمیٹی | ۲۹ء کے فسادِ بمبئی میں محمد علی نے جو کچھ کیا وہ آپ پڑھ چکے ہیں، پھر اس
کے بعد جب تحقیقاتی کمیٹی بمبئی تو محمد علی نے اپنی علالت اور کانگریس کی مخالفت کے باوجود اس
میں بیان دیا اور کانگریس کو ہندو مسلمانوں کا ادارہ بتایا، اپنے اختلافات کو فردعی اور خانگی نکالا
کیا، اور لاہور کے اجلاس کانگریس میں شرکت پر آمادگی کا اظہار کیا، گورنمنٹ، پولیس اور فوج
پر پوری تنقید کی حالانکہ محض ایک ”فرقہ دارانہ“ لیڈر کا فرض یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ
اس تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے اپنی ملت کو مظلوم اور دوسری کو ظالم ثابت کر کے چلا آتا۔
مسٹر ٹیل کی ٹوپی | سوراج پارٹی کے رکن کی حیثیت سے جب مسٹر ڈٹل بھائی ٹیل
نے پہلے اسمبلی کی ممبری اور پھر صدارت قبول کی اور صدارت قبول کرنے کے بعد جس طرح
وہ پورے سرکاری لباس میں سر پر ”دگ“ ڈال کر تشریف لائے ہیں اس پر سبھی
متحیر و متعجب ہوئے تھے اور اس طرز عمل کو ”تعاؤن کا درمیانی قدم“ بتایا تھا۔

مگر محمد علی نے نہ صرف یہ کہ اس روش کی مخالفت کی بلکہ مسٹر ٹیل کو ہر طرح سے آمادہ کیا کہ
صدر ہوجانے سے آدمی کے عقائد میں فرق نہیں آنا چاہئے، آپ کو اپنا قومی لباس ہی زیب
کرنا چاہئے اور ”دگ“ کے بجائے اپنی وہی ٹوپی جو اس سے قبل آپ کو محبوب تھی

چنانچہ سٹریٹیل نے اس نصیحت کو قبول کیا اور ان کی قبولیت کی خبر ان الفاظ میں شائع ہوئی۔

”معلوم ہوا ہے کہ سٹریٹیل پریسڈنٹ یوبلیٹو اسمبلی نے مولانا محمد علی کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے ”وگ“ کو اتار پھینکا اور اپنی اصلی کھدر کی ٹوپی پہن کر کرسی صدارت کو زینت دینے لگے۔“

الحمد للہ!

باب ۲

”یونٹی کانفرنس“

ملک کی عام حالت | تحریک ترک موالات کے التوار اور پھر گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد ہندوستانی سیاست میں جو انقلاب عظیم پیدا ہوا وہ ظاہر و باہر ہے ”ہندو مسلمانوں کے الگ الگ محاذ جنگ قائم تھے، اور ہر فریق کی پوری کوشش اس میں صرف ہوتی تھی کہ دوسرے فریق کو نیچا دکھایا جائے۔“

سنگٹھن | پھر ایک نئے دلولہ کے ساتھ سنگٹھن کی تحریک شروع ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ چند ہی دنوں کے اندر ہندوؤں میں اتنی توانائی آجائے کہ وہ مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال کر چلا تک میں ”اوم“ کا جھنڈا لہرائے۔

اس آرزو کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے!

اور اس مقصد کے حصول کے لئے کیا یہ گیا کہ اکھاڑے قائم کئے گئے جہاں کشتی کی تعلیم کے لئے پہلوان مقرر کئے گئے، ہندوؤں میں یہ احساس پیدا کر لیا کہ ”حفاظت خود اختیاری“ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بانکا، بنوٹ، پھری، گنگہ ان تمام فنون میں مہارت حاصل کریں تاکہ یہ سب چیزیں بڑے ضرورت کام آویں۔“

دوسری طرف مالوی جی، لاجپت رائے اور سوامی شرودھانند کی علی الاعلان تعلیم ہندو خواتین کو یہ تھی کہ وہ بھی اپنے پاس کم از کم ایک ”قزولی“ ضرور رکھیں، کیا معلوم کون وقت کیا ہوتا ہے؟

مسلمانوں میں جوش | ان باتوں سے مسلمانوں میں ایک جوش تو ضرور پیدا ہو گیا، لیکن الحمد للہ کراٹھوں نے اس قسم کی نمائشی حرکتیں نہیں کیں جن کا مقصد صرف تخویف و ترہیب تھا۔
نتیجہ | ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فسادات کا ایک موسم مقرر ہو گیا، جہاں کوئی مذہبی تقرب آئی اور فسادات کا موسم شروع ہو گیا۔ مسلمان اپنی لاٹھیاں لے لے کر نکلے اور ہندو اپنی اپنی ایک بار خوب خوزیز خلیگ ہو گئی، کچھ مرے، کچھ زخمی ہوئے، کچھ جیل خانے گئے اور کچھ پھانسی کے تختہ پر لٹکے۔

اس تمام ہنگامہ دار و گیر میں سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہوا تھا اس لئے کہ ان بجا بڑا کو پیر دمی کے لئے دلیل بھی نہیں ملے، اور بڑی بڑی فیسیں مے کر اگر اپنے کو بچا سکتے تو جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جہاد میں کیوں اترتے۔

لکھنؤ کا فساد | اسی زمانہ میں لکھنؤ میں ایک نہایت خوزیز فساد بغیر کسی امید کے دفعۃً و دفعۃً ایک جماعت نے کر دیا، یہ فساد اتنا خونچکان تھا کہ بیان نہیں کیا جاسکتا، کئی روز تک مسلمانوں کے محلہ میں ہندوؤں کی اور ہندوؤں کے محلہ میں مسلمانوں کی جان کی خیر نہیں تھی، سیکڑوں راہ گیر مسافر غریب الوطن مذریع بیدریغ کر دئے گئے اور کشتوں کے پتے لگ گئے۔

اسباب فساد | لیکن اس خوزیزی، اس کشت و خون اور اس قتل عام کے اسباب و محرکات کیا تھے؟ یا جہ، گائے اور دوسرہ، ہولی!

مذہب کے نادان دوست مذہب کے نام پر کتنا بدنامی لگا رہے تھے؟
نوٹی کانفرنس | ان حالات میں ایک نوٹی کانفرنس دہلی میں طلب کی گئی جس میں ہندو مسلمانوں کے "متفقہ" اور مسلمہ زعماء نے کوشش کی کہ راہ صلح و امن پیدا کی جاسکے، لیکن یہ مقصد صرف پر جوش اور دھواں دھار تقریروں سے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی!

کئی روز تک اجلاس ہوتا رہا، تقریریں ہوتی رہیں، صلح و امن کی راہ تلاش کی جاتی رہی مگر وہ مل نہ سکی!

محمد علی کا حصہ | محمد علی بھی اس ”ملاپ کانفرنس“ میں شریک ہوئے تھے، انھوں نے اپنی پوری قوت صرف کر دی کہ کوئی ایسا حل نکل آئے کہ جانبین کا فساد پسند عنصر راضی ہو جائے مگر ایسا نہیں ہوا، محمد علی نے اپنی تقریر میں پہا تک کہہ دیا کہ ”اگر کوئی ہندو میری بیوی کی دفن کرے، جب بھی میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میری ماں کو قتل کرے جب بھی میں عدالت مقدمہ نہیں لیجاؤں گا، لیکن اب اس بدترین صورت حال کا علاج ہونا چاہئے، ذرا ذرا سی بات پر ہم کو چاہئے کہ تلواریں میان سے نہ نکال لیا کریں، ورنہ ہم آزادی کی منزل سے دور ہوتے چلے جائیں گے، اور اختیار برابر ہمارا مضحکہ اڑائیں گے، اور ہم پر زبان طعن و راز کریں گے، لیکن وہ فضا ایسی تھی کہ ہندوؤں نے تو اس تقریر سے کوئی ہمدردانہ اثر نہیں لیا، مسلمان مخالفین نے محمد علی کی اسلام دشمنی کے ثبوت میں ان کی یہ تقریر البتہ اچھا لانا شروع کر دی۔

ایک بات پر اگر شردھاندا اپنی ”نیم رضامندی“ کا اعتراف کرنے پر آمادہ ہوتے تھے۔ تو مالوی جی کڑک کر ایک ڈانٹ بتاتے تھے، اگر مالوی جی کچھ صلح پسندی پر مائل ہوتے تھے تو ”شیر پنجاب“ لالہ لاجپت رائے کی ایک دہاڑان کا پیٹ پانی کر دیتی تھی۔

غرض کئی روز کی کوششوں کے بعد معلوم ہوا کہ

نشستیں گفتگو و برخاستند

کا ہمہ گیر کلیہ یہاں بھی حاوی ہے۔

التوا کے بعد | ”ملاپ کانفرنس“ کے التوا کے بعد اس لئے کہ وہ برخاست نہیں کی گئی تھی! ہندو مسلم زعماء پھر اپنی اپنی قوم کو ”مستقبل“ کے لئے تیار کرنے لگے، فساد کی گرم بازاری

میں کوئی کمی نہیں ہوئی، اور ہندو مسلم اختلافات میں اضافہ ہوتا رہا۔

محمد علی کا طرز عمل | اس التوار کے بعد محمد علی نے نہ گوشہ عافیت اختیار کیا، نہ خاموشی اختیار کی اور نہ فساد پسند طبع کو ابھارنا شروع کیا بلکہ انھوں نے مسلسل دوڑے کئے، تقریریں کیں، ہتھیار لکھے، پرائیویٹ ملاقاتیں کیں، جلے طلب کئے، گاندھی جی کو سمجھایا، مالوی جی کی منت کی، مگر! نتیجہ؟ ناکامی!

شملہ یونٹی کا نفرنس | آخر فسادات میں اضافہ ہوتا رہا اور ہندو مسلم تعلقات بد سے بدتر ہوتے رہے، گاندھی جی یہ کہہ کر کہ ”اب میری بات کوئی نہیں سنتا“ اپنے آشرم میں متکلف ہو گئے لیکن محمد علی کی کوششوں کا اب بھی خاتمہ نہیں ہوا۔

سلسلہ میں شملہ میں اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا، وہیں مجلس مرکزیہ خلافت نے اپنا جملہ طلب کیا، تقریباً تمام ممبران شریک ہوئے، ہاں سبھا کی مجلس بھی اس زمانہ میں وہیں ہو رہی تھی، خلافت کے اکثر ممبران کا اصرار تھا کہ آخر ہم کتنا ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگائیں گے؟ ہم تو یہ نعرے لگا رہے ہیں اور دشمن ہماری غفلت سے فائدہ اٹھا کر ہمیں تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے، ”لہذا کم از کم ہمیں دفاعی پروگرام پر تو عمل کرنا چاہیے، مگر خلافت کیلٹی نے پھر اس پر جوش عنصر کو قابو میں رکھا۔

قاصدا من | مولانا شوکت علی نے مرکزیہ کی طرف سے مٹھ شیب قریبی اور ڈاکٹر انصاری کو اپنا سفیر بنا کر ہندو ہا سبھا کے قائد ڈاکٹر مونسے کے پاس بھیجا کہ اب پانی سر سے گزر چکا ہے، حالات نازک سے نازک تر ہوتے جا رہے ہیں، ہم اپنے مقصد حریت کی خاطر دفاعی کارروائی کرنا بھی نہیں چاہتے، لہذا اب ان اختلافات کو ختم کیجئے اور ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھئے اور دل جوڑ کر اٹھئے! پھر حیب خدا وہ دن کرے کہ ہم عروس حریت سے ہلکا رہوں تب پھر جتنا جی چاہے

اڑیے گا۔

کانفرنس شروع ہو گئی | آخر قلم کی بلندیوں پر ایک بار پھر ملاپ کانفرنس کی کارروائی کا آغاز مشرجح کی صدارت میں ہوا اور اس میں خلافت اور ہندو ہمسایہ کے اور بعض دوسری انجمنوں کے نمائندے اور بعض حضرات شخصی حیثیت سے شریک ہوئے۔

بیگم بھوپال کا تار | اسی زمانہ میں بیگم صاحبہ بھوپال ڈالکٹراس "ملاپ کانفرنس" کے نام بھیجا اور بڑی پر زور استدعا کی کہ اب فسادات و اختلافات کا خاتمہ ہونا چاہیے، نیز ممدوحہ نے "بان" پیرائہ سالی اپنے خدمات پیش کئے! دوسرے لوگ بھی جو نہ آ سکے انھوں نے ہمدردی کے تار دئے اور وقتاً فوقتاً شرکت پر لگاؤ کی ظاہر کی، اس امید افزا فضا میں "ملاپ کانفرنس" کا آغاز ہوا۔

محمد علی کی کوششیں | محمد علی نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کی جتنی کوشش کی کہی لیڈر نے کم کی ہوگی، تجویزوں کا مسودہ تیار کرنے میں، الفاظ گھٹانے بڑھانے میں، معاملات کو رد براہ کرنے میں، لوگوں کو ایک نقطہ نظر پر لانے میں محمد علی نے اپنی ساری قابلیت اور ساری کوشش صرف کر دی کہ کسی طرح اس افتراق و انتہا کا خاتمہ ہوا اور ایک بار پھر وہ مبارک زمانہ آجائے کہ ہندو مسلمانوں کی تعریف کر رہا ہوا اور مسلمان ہندو کی منقبت۔

مجلس مرکزی خلافت کا جلسہ ختم ہو گیا، اس کے ممبران چلے گئے، مولانا شوکت علی واپس گئے، مگر ملاپ کانفرنس ختم نہیں ہوئی وہ ہفتوں ہوا کی

شاہد کی علالت | محمد علی قلم میں ہندو مسلم اتحاد کی گرہ کشانی کر رہے تھے اور دہلی میں ان کا عزیز بھتیجا شاہد علی مرگ و زیست کی کشمکش میں گرفتار تھا، حالت بہت زیادہ نازک ہو گئی تھی۔ بھنیے کی یٹنا کہ وہ آخری وقت اپنے شفیق چچا کا دیدار کرے اور چچا کی یہ کوشش کہ وہ آخری

بار اپنے بھتیجے کو بیاہ کر لے، مگر ملکی و ملی خدمت کی زنجیر ایسی پڑی ہے کہ قدم نہیں اٹھانے دیتی
آخر

مندگئیں دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں ہر ہر

مگر چچا کو موقعہ نہ مل سکا کہ وہ جنازہ ہی میں شرکت کر سکتا، یا کم از کم مٹی ہی مے سکتا۔

پھر التوار | سہفتوں کی اس مسلسل نشست اور گنگا پور کے باوجود پھر بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ہوئے
یہ کانفرنس ملتوی ہو گئی کہ کسی آئندہ موقع پر دیکھا جائے گا، اس وقت نقصان سبب نہیں ہے۔
یہ ایک واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے اقلیت میں ہونے کے باوجود جس جس طرح ہندو مسلم اتحاد
کی کوشش کی اور یہ چاہا کہ کوئی صحیح راہ عمل متعین ہو سکے، اس کی نظیر ملنی دشوار ہے لیکن
اس کی نظیر بھی اس سے زیادہ ملنا دشوار ہے کہ ”اکثریت کو اپنے متعلق اتنا خطرہ ہو کہ ہمیں صلح کی کوششوں سے
بھاگے، اتحاد کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرے اور اشتراک عمل کا نام سننا بھی پسند نہ کرے۔
اس التوار کے بعد پھر دوسرے نام سے جو کوششیں ہوئیں اور محمد علی نے ان میں جو
حصہ لیا اس ذکر بعد کو آئے گا۔

باب ۲۸

مسلم حج و حجاز

عالم اسلام سے بالعموم اور حجاز مقدس سے بالخصوص ہمیشہ محمد علی کو ایک گہرا تعلق رہا اور جب بھی کوئی نازک موقع پیش آیا ان کے قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹے بلکہ ہمیشہ انھوں نے ملت اسلامیہ کی صحیح رہنمائی کی۔

شریف حسین کی غداری | جنگ عمومی میں جس طرح حسین شریک مکہ نے صرف ترکوں ہی سے نہیں بلکہ اسلام اور قبلہ اسلام سے اپنی غداری کا ثبوت دیا، وہ ہر شخص کو معلوم ہونا چاہئے۔

جنگ عمومی میں یہی وہ ”معزیز بال“ تھا جسے شاطر رنگ نے اپنے دام استعمار میں اپنی بساط سیاست کا ایک اہم تہہ سمجھ کر لانا چاہا تھا، اور اس دشمن اسلام کو ”وحدت عرب“ اور ”حکومت متحدہ حجاز“ کے سبز باغ دکھا کر ترکوں سے بغاوت کروائی اور اپنا کام نکالا۔ اور پھر جنگ کے بعد جس طرح اس سے وعدہ خلافیاں کی گئیں اور رفتہ رفتہ اس غریب کو جس طرح اپنی ”حفاظت“ میں لے لیا گیا وہ ایک عجیب و غریب داستان ہے جس کا اہل یہ کہ حجاز کھڑے کھڑے ہو گیا، شام میں فرانس کا انداب اور عراق و شرق ارون پر برطانیہ کی نظر عنایت ہوئی، البتہ یمن اور نجد دو مقامات ایسے تھے جو گورنمنٹ کے اثر سے کلیتہً آزاد تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ حجاز کو اس عالم کبیر سی میں بہنے دیں۔

حکے اراے | آخر نجد کے جوال بہت شہزادہ عبدالعزیز ابن سعود نے حجاز مقدس کو

ان گندگیوں سے پاک کرنا چاہا، اس لئے کہ عالم اسلام کی ہمدردی شریف حسین کھو چکا تھا اور خود حجاز کے باشندے اس کے مظالم اور عجیب عجیب ٹیکسوں سے تنگ آچکے تھے، اس لئے سب کو یہ جملہ ایک آیت رحمت معلوم ہوئی کہ وہاں سے ایک صحیح العقیدہ اور پختہ مذہب شخص ان تمام گندگیوں کا امتیصال کرنا چاہتا ہو۔

گورنمنٹ کا طرز عمل | جنگ شروع ہوئی تو گورنمنٹ کی دلی ہمدردی ”ظاہر ہوئی کہ شریف حسین کے ساتھ تھی، وہ کیوں چاہتی کہ اس کا ایک ٹکڑا مفت میں ہاتھ سے نکل جائے اور حجاز پر ایک ایسی حکومت قائم ہو جائے جو اس کے اثر سے کلیتہً آزاد ہو اور آزاد رہنا چاہے، اس لئے گورنمنٹ نے چاہا کہ کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے کہ صورت حال میں تغیر پیدا کر دیا جائے اس کا نتیجہ یقیناً حسب دلخواہ نکلے گا، اور چونکہ علی الاعلان وہ کسی کی طرف داری یا مخالفت کر نہیں سکتی تھی ورنہ ہندوستان کے مسلمان ایک آفت برپا کر دیتے اس لئے اس نے یہ تجویز تیار کی کہ التواجدج کی تجویز | اس سال ۱۹۲۱ء میں ہندوستان سے حاجیوں کو حج کرنے جانے ہی نہ دیا جائے، چنانچہ گورنمنٹ کی طرف سے ایک کمیونکے شائع ہو جس میں حجاز کی حالت نہایت خطرناک اور دہشت ناک بتائی گئی اور حاجیوں کو حکم تو نہیں دیا جاسکتا تھا، اس لئے ”مشورہ“ دیا گیا کہ وہ حجاز کا رخ نہ کریں، ورنہ ہم ان کے جان و مال، کسی چیز کی حفاظت کے ذمہ دار اور جواب دہ نہ ہوں گے! اس کمیونکے کی خوب اشاعت ہوئی۔

محمد علی | محمد علی اس کمیونکے کی اشاعت کے بعد کس طرح چین سے بیٹھ سکتے تھے، انھوں نے اس مسئلہ میں گورنمنٹ کی خوب مخالفت کی اور حاجیوں کو ”حکم“ دیا کہ وہ حج کرنے ضرور جائیں، دوسری طرف خلافت کا ایک وفد حجاز مقدس بھیجا، چاہا جو شریف حسین اور علی سے مل کر حالات میں اصلاح کرائے، ان کوششوں کا اثر یہ ہوا کہ خلاف توقع حاجیوں کے قافلہ

کے قافلہ بیٹی میں پہنچے لگے، شمع حرم کے ان پروانوں کو جان و مال کی پروا ہی کیا تھی۔
چونکہ جدہ پر گولہ باری ہو رہی تھی اس لئے حکومت سعود نے رابع، ققہدہ، لیت
جدید بندرگاہوں کو اس قابل بنادیا کہ حجاج وہاں سے جاسکیں اور سب سے بڑھ کر گورنمنٹ کے
لئے ستم یہ ہوا کہ حکومت سعود نے حاجیوں کی جان و مال کی حفاظت وصیانت کی ذمہ داری
بھی لے لی۔

سر حبیب اللہ سے خط و کتابت | اس زمانہ میں سر حبیب اللہ حکومت ہند کی ”اگر کیو کوئل“
کے ممبر تھے، ان سے محمد علی نے نہایت پر لطف خط و کتابت کی اور انھیں بہ دلائل معقول باور
کرایا کہ ایسی صورت میں حج کا التوا قطعاً ناجائز ہے، اس اہم فریضہ مذہبی کو ضرور پورا ہونا
چاہئے۔

ایک طرف یہ خط و کتابت دوسری طرف جدید بندرگاہوں کا انتظام، پھر ہندوستان
کے طول و عرض میں ایک ہنگامہ اور سب سے بڑھ کر حاجیوں کے غول کے غول کا بیٹی میں جا کر
ڈیرے ڈال دینا یہ سب اسباب ایسے ہوئے کہ گورنمنٹ اجازت دینے پر مجبور ہو گئی۔
”مسلمانوں کی مخالفت“ | ایک طرف تو محمد علی یہ کوشش کر رہے تھے کہ حاجیوں کو حج سے روکا
جائے اور گورنمنٹ پر دباؤ ڈال ہے تھے کہ وہ ایسی صورت پیدا کرے کہ حاجی جاسکیں دوسری
طرف سرکار پرست مسلمانوں کا ایک جم غفیر میدان میں تو نہیں آسکا، ہاں اسمبلی کے ایوان
میں اور اخبارات کے صفحات میں اس نے بھی اپنے زور بازو اور زور زبان و زور قلم
کا پورا مظاہرہ کیا، اور کوئی ایسی ذلیل سے ذلیل تہمت نہیں تھی جو محمد علی پر نہ لگائی گئی ہو۔
یہاں تک کہا گیا کہ اس معاملہ میں محمد علی خواہ مخواہ اس لئے دخل دے رہے ہیں کہ کانگریس اور
کانگریسی لیڈروں کی وقت جا چکی، یہ اپنا اقتدار اسی طرح بحال کرنا چاہتے ہیں، اللہ اعلم

نے اپنے اس ناقد کو دعوتِ مقابلہ دی کہ بھائی اگر واقعہ یہ ہو کہ میں آبرو باختہ لیڈر ہوں اور
فرار | تم لوگ صحیح رہنمائی کر رہے ہو، کانگریسی لیڈر بے وقعت ہو چکے ہیں اور ان کی بات
 سنی نہیں جاتی اور تم لوگ ماشاء اللہ با وقعت ہو اور تمہاری باتوں پر خوب عمل کیا جاتا ہے۔
 تو بسم اللہ۔

ہمیں میدان ہیں چوگاں، ہمیں گوئے

جامع مسجد ہی میں آجاؤ، میں بھی تقریر کروں گا تم بھی اپنی صحیح رہنمائی سے لوگوں کو مستفید
 کرنا پھر جس کے حق میں فیصلہ ہو جائے وہ لیڈر اور جس حق میں نہ ہو وہ ”آبرو باختہ“ لیڈر۔
 یہ چیلنج اگرچہ منظور کر لیا گیا لیکن جمعہ کے دن وہ بزرگ اپنی ”صحیح رہنمائی“ سے مستفید
 حسب اطلاع و خلاف وعدہ تشریف نہ لاسکے، حاضرین کو بہت سخت اشتیاق و انتظار رہا؛
کامیابی | بہر حال اس تمام شور و شغب اور اس تمام ہنگامہ کے باوجود گورنمنٹ کو ابھارا
 دینی پڑی اور حجاج سوئے بیت اللہ گورنمنٹ کی نہیں بلکہ خدا کی حفاظت میں روانہ ہوئے۔
خیر و عافیت | ایک طعنے محمد علی کو اور ان کے برادر بزرگ مولانا شوکت علی کو یہ بھی دیا
 جا رہا تھا کہ اتنے حاجیوں کو بھیج تو ہے ہو مگر ان سب کا خون ناحق تمہاری ہی گردن پر
 رہے گا۔ لیکن اللہ کو اپنے ان سپاہیوں کی عزت رکھنی منظور تھی، ایک حاجی کی ہیکس تک نہیں
 پھوٹی، سب بخیریت گئے اور بعافیت واپس آئے، ذلک فضل اللہ!

باب ۲۹

آویرش نجد حجاز

محمد علی کی زندگی ایک عالم ریختہ تھی، انہیں اپنی زندگی میں بڑے بڑے معرکوں سے دوچار ہونا پڑا اور سب میں دنیا نے ان کے استقلال و استقامت کا ایسا نمونہ دیکھا جس نے ہمیشہ لوگوں کو متحیر کر دیا۔

شریف کی بدکرداریاں | حسین، شریف مکہ کے متعلق اجمالاً بتایا جا چکا ہے، یہاں کسی اٹھ کی ضرورت نہیں، ہاں اتنا ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی ان بدکرداریوں کے باوجود، عالم اسلام کے اس سے بیزار ہونے کے باوجود اور وحدت اسلامیہ کو پارہ پارہ کر دینے کے باوجود ہندوستان میں ایک بہت بڑی جماعت ایسی بھی تھی جو اس سے عقیدت و محبت رکھتی تھی، اور گواس کے افعال و اعمال سے نالاں تھی مگر پھر بھی حجاز پر وہ اسی کا اقتدار چاہتی تھی۔

شریف کے حامی | اس کی حمایت میں سب سے بڑی دلیل یہ لائی جاتی تھی کہ وہ آل رسول ہے، نجیب الطرفین سید ہے اور اس کا مستحق ہے کہ حجاز کی زمام قیادت اسی کے ہاتھ میں رہے۔

ابن سعود کے خلاف ان لوگوں کے دلائل کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ ”وہابی“ تھا!
ہندوستان میں اسلام پیروں اور مرشدوں کے ذریعہ پھیلا، اس لئے ہمیشہ سوائے گرو چلے آتے ہیں جنہوں نے مقدس اسلاف کے غیر مقدس اخلاف کو ان کا صحیح جانشین سمجھا اور ان کی ہر بدعت کو، ہر گمراہی کو اور ہر خباثت نفس کو اسلام سمجھا۔

اور اگر نہ قبول کرے تو میں تمھارے ساتھ ہوں اور جو کشتیشیں تمھاری حمایت اور اس کی مخالفت میں صرف کر سکتا ہوں وہ سب تمھارے لئے وقف ہوں گی اور مجھ سے بڑھ کر تمھارا کوئی شریک کار نہ ہوگا۔ مگر

بات بھی کھوئی اتجا کر کے کیا ملا سہ من مدعا کر کے
اگر کوئی نتیجہ نکلا تو یہ کہ اختلاف روز بروز بڑھتا گیا اور اس نے رفتہ رفتہ پوری مخالفت کی صورت اختیار کر لی!

لکھنؤ کے معاونین | لکھنؤ میں محمد علی کے چند ہم خیال تھے یعنی مولانا ظفر الملک علوی مدیر الاناظر، چودھری خلیق الزماں اور مولانا عبد الماجد (دریادہ)، مظہر، یہ واقعہ ہے کہ اس سیلاب کا پہاڑ کی طرح سے اگر کسی نے مقابلہ کیا تو وہ یہی بزرگ تھے، اپنی "اقلیت" کے باوجود انھوں نے "اکثریت" کا جس پامردی جس استقلال اور جس غیر معمولی عزم سے مقابلہ کیا وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

ایک جلسہ | چنانچہ شاید "امتنا" ایک جلسہ سلطان ابن سعود کی حمایت میں ان حضرات نے لکھنؤ میں منعقد کرنے کا اعلان کیا، وقت مقررہ پر حاضرین آنا شروع ہو گئے اور جلسہ چونکہ عام تھا، دعوت مخالفین اور موافقین سب کو دی گئی اس لئے سب ہی آئے۔

جلسہ میں مخالفین حضرات کے لیڈر پیش پیش تھے، مولانا قاری شاہ سلیمان صاحب بھلاوری، مولانا عبدالباری صاحب مغفور، شیخ شیر حسین صاحب قدوائی، ٹھاکر نواب علی صاحب اور داماد عیاض بن مولانا ظفر الملک وغیرہ۔

مقررین | قاری شاہ سلیمان صاحب صدر منتخب ہوئے، پھر مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے ایک تقریر شروع کی، ان کی زبان سے چند لفظ نکلے ہوں گے کہ بعض حضرات

میں سخت اشتعال پیدا ہو گیا، ایک بزرگ نے جواب کونسل آف ایڈیٹ کے ممبر ہیں، عبدالرزاق صاحب کو دھکا دیا اور سخت نالائتم الفاظ استعمال کئے، ایک دوسرے بزرگ نے جن کا اب اتعال ہو چکا ہے، بہت زیادہ درشتی سے فرمایا کہ وہ اس وقت خوش ہوں گے جب عبدالرزاق کا سر دیکھیں گے۔

محمد علی کو دعوت | ان حالات میں محمد علی کو دعوت دی گئی کہ وہ ایک جلسہ میں تشریف لائیں اور تقریر کریں، ان لوگوں کی دراز دستیاں اب یہاں تک پہنچ چکی ہیں، بغیر آپ کے آئے اب کام چل نہیں سکتا، اس لئے کہ لکھنؤ ہی خدام الحرمین کا مرکز ہے، یہیں ہیں اپنا پورا زور صرف کرنا چاہئے۔

محمد علی کا ارادہ | اس وقت محمد علی پراونشل کانگریس سیتاپور میں شریک ہونے کے لئے گئے تھے، وہیں سے مولنا عبدالماجد دریا بادی نے انھیں لکھنؤ چلنے پر مجبور کیا، جب انھوں نے یہ حالات سنے تو وہ فوراً آمادہ ہو گئے اور لکھنؤ تشریف لائے۔

جلسہ کے حالات | جلسہ کے صدر چودہری خلیق الزماں تھے، محمد علی کے ساتھ توفیق شریف بھی آئے تھے، محمد علی نے پہلے ان کا ایک مختصر تعارف کرایا اور پھر ان سے تقریر کرائی، وہ عربی میں تقریر کرتے جاتے تھے اور مولنا عبدالرحمن مرحوم اردو میں اس کا ترجمہ فرماتے جاتے تھے۔

توفیق شریف کی تقریر | توفیق شریف کی تقریر جب تک ہوتی رہی لوگ خاموشی کے ساتھ ان کی تقریر سنتے رہے، ان کی تقریر کے اختتام کے بعد صاحب صدر نے اعلان کیا کہ اب محمد علی تقریر کریں گے اور ان کی تقریر کے بعد مخالفین ہیں جو لوگ تقریر کرنا چاہیں گے، ایسے پورا موقعہ دیا جائے گا، کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

خلل نڈازی | محمد علی جیسے ہی اس قرارداد کے مطابق تقریر کے لئے کھڑے ہوئے، خدامِ اہل سنتی
جماعت کے بعض افراد نے ایک ایک کوٹنے سے شور کرنا شروع کیا کہ ”ہم نہیں سنتے“ بیٹھ جاؤ“
”پہلے مولنا حسرت موہانی تقریر کریں۔“

محمد علی ایسے ہنگاموں کے وقت خود کو دشرف پڑھتے تھے اور چاہتے تھے کہ سب یہ
ہا کہ اختلاف کم ہو، چنانچہ انھوں نے لوگوں کو خاموش کرنا چاہا، مگر وہ چند آدمی جو اس پر تلے بیٹھے
تھے کہ آج جلسہ نہ ہونے دیں گے۔ وہ خاموش نہیں ہوئے۔

اصحابِ جلسہ یعنی وہ لوگ جو محمد علی کی تقریر سننے آئے تھے، سخت پریشان اور مترو
تھے کہ جس مقصد کے لئے آئے ہیں وہ فوت ہو جاتا ہے، جواب میں انھوں نے بھی ہنگامہ
بپا کرنا چاہا مگر جلسہ کے منتظمین نے انھیں خاموش رکھا۔

بعض لوگوں نے محمد علی سے کہا کہ مولنا حسرت موہانی سے کہئے وہ اگر کہیں گے تو یہ
شور ختم ہو جائے گا، مگر محمد علی نے ان سے استدعا کرنے سے انکار کر دیا، کیونکہ وہ ایسا جلسہ کرنا
نہیں چاہتے تھے جو دوسروں کے رحم و کرم پر منحصر ہو۔

بہر حال پندرہ بیس منٹ سے زیادہ تک یہ ہنگامہ برپا رہا اور باوجود کوشش کے
یہ شور ختم نہیں ہوا، جناب صدر نے دوسرے آدمی کی مدد سے جلسہ کو قائم رکھنا نہیں چاہا اس
لئے کہ جلسہ جس کی صدارت میں ہو رہا ہو اسی کو جلسہ پر قابو ہونا چاہئے
اس خیال کے ماتحت انھوں نے کچھ دیر انتظار کیا جب دیکھا کہ یہ لوگ باز نہیں آئیں گے
تو جلسہ برخاست کر دیا۔

برفائی کا اثر | محمد علی کے حامیوں اور معتقدوں کو اس حرکت سے سخت اشتعال پیدا ہوا
اگر اس وقت انھیں قابو میں نہ رکھا جاتا تو یقیناً بہت سخت ہنگامہ ہو جاتا، مگر اعیانِ جلسہ کی

مصلحت بنی اور مال اندیشی ان وقتی جذبات پر غالب آئی ، انہوں نے اپنے حامیوں اور معتقدوں کو پوسے طور سے قابو میں رکھا اور کسی قسم کا ہنگامہ نہیں ہونے دیا۔

اثرات | لیکن یہ سنہ اندازی بالکل بے اثر بھی نہیں رہ سکتی تھی ، اب انہوں نے اونٹن عزم صمیم کے ساتھ طے کر لیا کہ وہ جلسہ کریں گے اور ابن سعود کی حمایت میں کریں گے ، یہ سب کچھ دن کی روشنی میں ہوگا ، مخالف و موافق سب مدعو ہوں گے اور مکہ مکرمہ کو تار کر کے رکھ دیا جائے گا چنانچہ منتظمین پوسے طور سے آئندہ جلسہ کی تیاریوں میں منہمک ہو گئے۔

محمد علی کی روانگی | محمد علی دہلی واپس چلے گئے ، اس لئے کہ وہ بہت مجبوری کے عالم میں تشریف لائے تھے اور وعدہ کر گئے کہ آئندہ جلسوں میں پھر آئیں گے۔

دوا اور جلسے | مولانا ظفر الملک صاحب علموی نے اب پھر بڑے انتظامات کے ساتھ جلسہ کا اعلان کیا ، مولانا محمد علی کو دعوت دی گئی اور وہ تشریف لائے ، عام خیال یہ تھا کہ اس جلسہ کا کامیاب ہونا بھی مشکل ہے۔

خدام الحرمین کے انتظامات | انجمن خدام الحرمین نے بھی جلسہ کے درہم برہم کرنے کے پوسے انتظامات کر لئے تھے۔

جلسہ کا منظر | بعد نماز عصر ممتاز دارالیتامی لکھنؤ میں جلسہ کا اعلان ہوا ، ندوہ کے کچھ طلبہ انتظامات کے لئے طلب کئے گئے تھے راقم الحروف اس وقت اگرچہ ندوہ کی ایک نیچے جماعت میں پڑھتا تھا لیکن پھر بھی اسے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وہ جلسہ کی خدمت بجالا سکے۔

جیسے جیسے جلسہ کا وقت قریب آتا گیا ، حاضرین کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور ممتاز دارالیتامی میں لوگ داخل ہونے لگے ، مگر وہاں داخلہ کی شرط یہ تھی کہ لٹھی لیکر کوئی جلسہ میں نہ جائے جنہوں نے تمبیل کی وہ داخل ہوئے ، جنہوں نے انکار کیا وہ روک دئے گئے۔

اتنے میں ہزاروں کی تعداد میں چاروں اور پاسیوں کا ایک لٹھ بند گردہ آیا، سینہ پر ”خدام الحرمین“ کے بٹے لگے ہوئے تھے۔ وہ سب بد زبانیاں کرتے ہوئے آئے اور ہال اور پارک کو گھیر لیا اور داخلہ کی کوشش کی جس کی ممانعت کی گئی اور وہ داخل نہ ہو سکے۔ علی برادران اب تک نہ آئے تھے، اب بہت زیادہ ہنگامہ پیدا ہو رہا تھا، اور نہایت صاف الفاظ میں محمد علی شوکت علی کے متعلق مغلط سے مغلط سے گالیاں سنی جا رہی تھیں۔

محمد علی کی آمد | اتنے میں محمد علی مع اپنے برادر بزرگ مولانا شوکت علی کے چودہری خلیفہ الزما کے ساتھ تشریف لائے۔ ایک جگہ ٹرچ گئی، مشتاقان زیارت ویدار حاصل کرنے کو بڑھے، اور خلیفہ ”حملہ“ کرنے کو، اس یورش کی تفصیل بیان نہیں کیا جاسکتی، یہ سارا لٹھ بند گردہ اور دوسرے لوگ اسی طرف ٹوٹ پڑے، یہ دونوں بھائی نہایت وقار و متانت سے آہستہ آہستہ بڑھے یا تو یہ عالم تھا کہ یہ لوگ محمد علی پر یورش کرنے کے لئے بڑھے تھے، ان کا جلسہ درہم برہم کرنے آئے تھے اور انھیں ”مذہ“ چکھانے آئے تھے، یا یہ عجیب و غریب منظر بھی دیکھنے میں آیا کہ لاٹھیاں جھک گئیں سر خم ہو گئے، اور تقریباً سب نے ”محمد علی شوکت علی کی ہے“ کے نعرے لگانا شروع کئے، کہ اللہ اکبر کے نعروں سے فضا گونج گئی، ہر شخص بیتاب ہو ہو کر بڑھ رہا تھا کہ مصافحہ کا فخر حاصل کرے۔

لیکن خدام الحرمین کے مخصوص لوگ اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے اور انھوں نے اسی حالت میں جلسہ میں جانا چاہا، پھر بھی داعی جلسہ مولانا ظفر الملک علوی نے مخالف جماعت کے صلاح کار، شیخ شیر حسین صاحب قدوائی سے استصواب کیا کہ اگر وہ امن و امان کی ذمہ داری لیں کہ جلسہ میں کسی قسم کا اختلال نہیں پیدا ہوگا تو پھر ان مسلح آدمیوں کو آنے کی اجازت بھی دی جاسکتی ہے مگر یہ ذمہ داری لینے سے انھوں نے انکار کیا، اور پھر بغیر کسی نتیجہ

پر پہنچے ہوئے، یہ جلسہ بھی ملتوی کر دیا گیا۔

دوسرا جلسہ | لیکن دوسرے روز امین الدولہ پارک میں اور اس سے پہلے ممتاز حسن مرحوم کی کوٹھی میں ایک نہایت عظیم الشان اور کامیاب جلسہ ہوا جس میں محمد علی نے کئی گھنٹہ تک تقریر کی اور اپنے خیالات و دلائل لوگوں کے سامنے پیش کئے، جلسہ کی یہ حالت تھی کہ ہزاروں کی تعداد میں انسانوں کا ایک سمندر معلوم ہو رہا تھا اور سب لوگ گوش ہوش سے یہ تقریر دلچسپی سے سن رہے تھے، اگر کوئی آواز سنائی دیتی تھی تو وہ اللہ اکبر کے فلک رسانوں سے تھے، یا محمد علی شوکت علی کی بے تھی، جو فضا آسمانی میں گونجتی تھی، اس کے بعد پھر دو روز تک محمد علی لکھنؤ میں اور مقیم رہے اور انھوں نے خوب دھواں دھار تقریریں کیں، نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ کا اسلامی طبقہ ان کے ساتھ ہو گیا۔

غیر معمولی کامیابی | اس طرح محمد علی نے اپنی ساحرانہ شخصیت کے ساتھ سائے اسلامی ہند کے جوش کو ٹھنڈا کیا اور انھیں آمادہ کیا کہ وہ مستقبل کا انتظار کریں کہ کیا ظاہر ہوتا ہے اس کے بعد وہ اپنے طرز عمل میں آزاد ہوں گے۔ ان کی کوششوں کا حاصل یہ ہوا کہ ایک بار پھر اسلامی ہند میں سکون کی فضا پیدا ہو گئی اور وہ ہنگامہ جس نے شریفوں اور سنجیدہ طبائع کو لب کشائی سے محروم کر دیا تھا، ایک بار کچھ عرصہ کے لئے پھر فرو ہو گیا۔

خلافت کمیٹی کی مستعدی | اس عرصہ میں خلافت کمیٹی برابر اپنے پروگرام پر عامل رہی اور ابن سعود سے مفصل اور مسلسل اطلاعات حاصل کرتی رہی، اپنی مجلس مرکزیہ کے اجلاس منعقد کر کے اس نے ایک پورا لائحہ عمل تیار کر لیا۔ حجاز کی حکومت کے متعلق اپنی پالیسی متعین کر دی، اور بالاتفاق یہ طے ہو گیا کہ خلافت کمیٹی حجاز پر ملکیت اور شخصیت نہیں چاہتی ہے، نیز منہم شہدہ مقابر و قبب کی تعمیر کی حامی ہے، اور موقر اسلامی میں اس کی طرف سے اس پر زور

دیا جائے گا کہ ان کی از سر نو مرست کرائی جائے تاکہ اختلافات کا حقیقتہً خاتمہ ہو۔

خلافت کمیٹی کا یہ وہ بنیادی اصول تھا جس کی تائید اس کے ہر گروہ نے مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کی صدارت میں کی۔

ابن سعود کا اعلان ملکیت | کچھ عرصہ کے بعد خبر آئی کہ سلطان ابن سعود نے حجاز کے باشندوں کے ”مجید“ کرنے سے وہاں کی ”بادشاہت“ قبول کر لی ہے!

پھر رونے اس خبر کو سیاہ جدول میں شائع کیا اور محمد علی چونکہ فطرتاً اور عقیدۂ شخصیت اور ملکیت کے سخت دشمن تھے، اس لئے اب وہ ابن سعود کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

محمد علی کی مخالفت | اب محمد علی ابن سعود کے مخالف ہو چکے تھے، اور اس کے اعلان ملکیت سے بیزار و متنفر تھے!

لیکن غور فرمائے اس کی زندگی کن کن سخت ترین آزمائشوں میں پڑی ہو، اب تک خدام اکھر میں سے اختلاف تھا اور محمد علی اس کا مقابلہ کر رہا تھا۔

اب اپنے کیمپ میں پھوٹ پڑ گئی، اکل جن لوگوں کے ساتھ اس نے غنیم کا مورچہ فتح کیا تھا، آج وہی لوگ اس کا محاصرہ کئے ہوئے تھے، اب اسی شدت، اسی زور شور اور اسی نامعقولیت سے حامیان ابن سعود نے مخالفت شروع کی، پنجاب کی خلافت کمیٹی باغی ہو گئی اور اس نے ابن سعود کی حمایت اپنا مقصد بنالیا، صدر، کانفرنس نے ان تمام تجویزوں کو پس پشت ڈال دیا جو انہیں کی صدارت میں ملکیت اور قبور و قبب کے متعلق منظور ہو چکی تھیں اور سب نے بالا اعلان محمد علی کی مخالفت شروع کر دی۔

جس شخص کی زندگی عبارت ہو، مجاہدہ سے، حرب فی سبیل اللہ سے اس نے

ان مخالفتوں کو بھی برداشت کیا، ان دوستوں کی بدگوئی پر بھی خورند ہوا، اپنے مداحوں اور
معتقدوں کی بھی گالیاں خندہ پیشانی کے ساتھ سنیں! خدا شاہد ہے کہ اس ظرف اور اس
اس استقلال کے لوگ کم پیدا ہوئے!

باب ۳۰

موتمر عالم اسلام

اسی زمانہ یعنی سلسلہ ۶ میں سلطان ابن سعود نے ایک ”بلاغ عام“ کے ذریعہ سے ایک موتمر کے انعقاد کا اعلان کیا۔

محمد علی کی آمادگی | محمد علی نے اتمام حجت اور واقعات کے برائی بعین مشاہدہ کے لئے اپنے افلاس کے باوجود موتمر جانے پر آمادگی ظاہر کی اور اپنے مصارف سے تشریف لے گئے خلافت کمیٹی پر اپنے خرچ کا بار نہ ڈالا!

وفد | جب محمد علی آمادہ ہوئے تو تجویز یہ ہوئی کہ ایک وفد بھی خلافت کمیٹی کی طرف سے حجاز بھیجا جائے وہ موتمر عالم اسلام میں شرکت کرے اور خلافت کمیٹی کا نظریہ پیش کرے اور سلطان ابن سعود کو ان کے مواعید یاد دلائے۔

وفد کے ارکان | مولنا سید سلیمان ندوی صدر وفد مقرر ہوئے، مسٹر شعیب قریشی سکریٹری اور علی برادران ممیر، اس طرح یہ وفد موتمر کی شرکت کے لئے حجاز مقدس روانہ ہو گیا!

علائ | محمد علی کی صحت یہیں سے بہت خراب تھی وہاں پہنچے تو آب و ہوا کی نفقت کی وجہ سے علیل ہو گئے اور شاید بایں حصہ جسم پر خفیف سافالنج کا حملہ بھی ہوا، لیکن محمد علی ان چیزوں کو خاطر میں نہیں لائے اور اپنا کام برابر پورے استقلال سے جاری رکھا۔

موتمر میں شرکت | موتمر میں عالم اسلامی کے اکثر نمائندے شریک ہوئے تھے، خود سلطان ابن سعود نے موتمر کا افتتاح کیا تھا، اکثر نمائندے ”جلالہ الملک“ کے جلال و جبروت سے

متاثر و مرعوب تھے! لیکن محمد علی کا ایک حق گو وجود ایسا تھا جو سلطان کے خدم و حشم، جاہ و جلال، عظمت و مصروت، کسی چیز سے بھی متاثر نہیں ہوا اس نے وہیں موتمن سلطان ابن سعود سے پورے آزادانہ لہجہ میں مخاطب کیا۔

محمد علی کا نعرہ حق | کہ یہ ملوکیت کیسی؟ اسلام میں تو شخصیت کی بیخ کنی کی گئی ہے، شوریٰ اور جمہوریت کو تفوق حاصل ہے، تم کتاب و سنت کے تسک کے مدعی ہو، پھر یہ قیصر و کسریٰ کی پیروی کیوں؟ محمد علی کے اس آوازہ حق نے تمام لوگوں کو چوکا دیا اور یہ احساس پیدا کر دیا کہ ابھی عالم اسلام حق گو اور حق پرست شخصیتوں سے خالی نہیں ہے، گو کج صحابہ کرام کا وجود گرامی ہمارے درمیان نہیں لیکن پھر بھی ایسی ہستیاں ابھی موجود ہیں جو حق کے لئے سارے عالم سے دشمنی مول لے سکتی ہوں اور کسی شاہ و شہر یا ر کو خاطر میں نہ لائیں۔

محمد علی کی رائے میں تغیر کے اسباب | لیکن ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ہماہمی کے ساتھ جب انھوں نے ابن سعود کی حمایت کی تھی تو پھر اس زور شور سے اختلاف کیوں کیا؟

اس سلسلہ میں اسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ مقابر و قبب کی جتنی خبریں ہندوستان میں پہنچیں ان میں سے اکثر کو ابن سعود کی طرف سے ”مبالغہ آمیز“ قرار دیا گیا، پھر یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ موتمن عالم اسلام کے فیصلہ کے مطابق ان کا آئندہ انتظام کیا جائے گا۔ بالاعلان کجرات و مرات یہ کہا گیا کہ حجاز میں شخصی حکومت مقصود نہیں ہے۔ بلکہ جمہوری طرز پر وہاں خلفاء راشدین کا ساعد حکومت ایک دفعہ پھر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی، یہ مواعید حکومت ابن سعود کی طرف سے براہِ جمیعہ خلافت سو کے گئے، نیز محمد علی کے نام ذاتی مکاتیب و مراسلات میں بھی ان کا اعادہ کیا گیا۔

لیکن جب اس وفد کے ارکان رجسٹر شعیب قریشی، مولانا عرفان اور ظفر علی خاں

صاحبِ پشتل تھا اور شریعہ قریشی نے اپنے مشاہدات کی بنا پر مظالم سلطان کی توثیق کی اور مزید احتیاط کے لئے منہدم شدہ مقامات کی تصویریں بھی انھوں نے بھیجیں اور پھر بعد کو محمد علی نے بھی برائے العین ان مقامات کا معائنہ کیا اور معلوم کر لیا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ صحیح ہے اور سلطان تلافی پر آمادہ نہیں ہیں تو پھر مجبوراً ان کا جامِ صبر لبریز ہو گیا، وعدے یاد دلا کر ان کے ایذا کی کوشش کی اور ناکامیابی کی صورت میں علمِ مخالفت اب محمد علی کے ہاتھ میں تھا۔ سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ کہ خلافتِ کیشی کی پالیسی، ہدایات اور نصب العین سے جن لوگوں کو کامل اتفاق تھا جن کی صدارت اور جن کی تائید سے یہ چیزیں پاس ہوئی تھیں اور ابنِ سعود کو بھیجی گئی تھیں، انھیں نے نہایت شد و مد سے اختلاف کیا اور ملوکیت کی حمایت کی، وعدہ خلافیوں پر پردہ ڈالنا چاہا۔

یہ تھے محمد علی کے اسبابِ اختلاف اور ان کے زخما کا طرزِ عمل، ان تمام ہنگاموں میں ہیں اس کا صاف طور سے احساس ہوتا ہے کہ محمد علی کا طرزِ عمل یقیناً حق بجانب تھا، ایک مومن کی طرح ایک مومن کے پر خلوص مساعی استخلاصِ حجاز کا انھوں نے خیر مقدم کیا اور پھر ایک مسلم کی طرح تعلقات کی زنجیروں کو توڑ کر انھوں نے سب کی مخالفت کی پروانہ کی اور جو حق سمجھتے تھے اس کا اعلان کر دیا، اس جگہ نفسِ مسلہ کے صواب و عدم صواب پر گفتگو مقصود نہیں، صرف محمد علی کے طرزِ عمل اور نیت کا پر تبصرہ اور غیر جانبدارانہ اظہارِ رائے مقصود ہے۔

خواجہ حسن نظامی کا فیصلہ | محمد علی کے اس اتفاق و اختلاف کے متعلق خواجہ حسن نظامی صاحب نے نہایت بے لاگ رائے دی ہے، محمد علی جب موثر اسلامی کی شرکت کے بعد ہندوستان تشریف لائے تو جامع مسجد دہلی میں مسلمانانِ دہلی کی طرف سے خواجہ صاحب نے محمد علی اور ان کے رفقا کو ایک پاننامہ دیا تھا، جلسہ میں محمد علی نے تقریر بھی کی تھی، واپس جا کر اپنے ۲۲ اگست

ستلہ کے روزنامہ میں وہ اس جلسہ کے متعلق اور محمد علی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں
 ”بعد مغرب جلسہ شروع ہوا، جامع مسجد کے جلسوں میں اتنا مجمع میں نے کبھی نہیں
 دیکھا، پندرہ بیس ہزار آدمی تھے، مولانا محمد علی صاحب کی تقریر کا حاضرین پر
 بہت اچھا اثر ہوا، میرا اعتماد تو یہ ہے کہ علی برادران اسلام کے سچے عاشق ہیں،
 انھوں نے پہلے جب ابن سعود کی مخالفت شروع ہوئی تو محض اس وجہ سے
 ابن سعود کی حمایت کی کہ ان کو یقین تھا کہ ابن سعود برا آدمی نہیں ہے اور قبہ شکنی
 کی خبریں بالغلط آمیز اور غلط ہیں اور اس مقابلہ میں وہ اتنے ثابت قدم رہے
 کہ اپنے مرشد مولانا عبدالباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی موافقت پر راضی
 نہیں ہوئے، لیکن جب انھوں نے خود حجاز میں جا کر اپنی آنکھوں سے سب
 واقعات کو دیکھ لیا تو اب وہ ایمان داری کے ساتھ ابن سعود کی مخالفت کر رہے
 ہیں۔“

تہمت تراشیاں | اختلاف و مخالفت ہی پر اگر قناعت کی گئی ہوتی تو غنیمت تھا اور اگر
 اس پر بھی دل کا بنجار نہیں نکلتا تھا تو سب و شتم کی پوچھا اس غریب کی سرکوبی کے لئے کافی
 تھی۔

شتم یہ ہے کہ اس پر مہل سے مہل اور غلط سے غلط تہمتیں لگائی گئیں۔

مصری محل کا قضیہ | اسی زمانہ میں مصری محل کا قضیہ پیش آیا تھا اور ایک بار نجدیوں
 نے وفور وحشت سے مصر کے ایک گروہ پر گولی بھی چلا دی تھی، مگر مصری دستہ خاموش رہا
 اور اس نے کوئی انتقامی یا جوابی کارروائی نہیں کی، محمد علی کی شاید مصری کماندار سے
 شناسائی تھی وہ اس سے ملے، ملاقاتیں کیں، اگر نہ بھی شناسائی ہوتی تو بھی ایک مسلم حکو

کے مسلم عہدہ دار سے ملنا کوئی اخلاقی یا قانونی یا شرعی جرم نہیں تھا، مگر اس ملاقات کے طرح
طرح سے معنی پہناتے گئے اور ہندوستان میں یہ مشہور کیا گیا کہ محمد علی نے مصری کماندار کو غیب
دی کہ وہ ایک اسلامی فوج کے حصہ پر گولیاں چلائے۔

اس واقعہ کو کئی کئی سرخیاں لے کر شائع کیا گیا اور مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید
مولانا عرفان اور مولانا عبدالحلیم کو ”دھمکی“ دی گئی کہ تم شاہد ہو اپنا بیان دو، اگر بیان نہیں دیا
تو ہم سمجھیں گے کہ تم اس واقعہ سے واقف ہو اور ہماری تائید میں ہو۔

جب ان بزرگوں کی بجلت تردید شائع ہوئی اور ان لوگوں نے اس واقعہ سے
اپنی قطعاً علمی اور بے تعلقی اور نفیس واقعہ کے عدم وقوع پر بیان دیا تو ذرا ملاحظہ فرمادیں۔

باب

حدیث ”حسن“ صحیح

محمد علی کی سرکار آرائیوں میں ایک نہایت اہم اور معرکہ الہ راجنگ وہ تھی جو انہیں مشہور
افتخار پر داز خواجہ ”حسن“، نظامی صاحب سے کرنی پڑی۔
وقت اور مصلحت کا تقاضا ہو کہ اس قسم کے مسائل سے اجتناب کیا جائے اور اس مذموم
کو موقوفہ دیا جائے کہ وہ ایسے نزاعی مسائل پر بحث کرے۔
لیکن محمد علی کے سوانح نگار کے لئے واقعات سے قطع نظر بھی ممکن نہیں، محمد علی ایک جنگجو
زعیم تھے، اسلام کی خاطر قوم و ملت کی خاطر، استقلال وطن کی خاطر ”درا زوتی کو تہ آستینان“
کے ”کنف غنا“ کی خاطر، اپنے ”ازالہ انہما“ کی خاطر اور اپنے نظریات و اعتقادات کی خاطر
بارہا انہوں نے علم چاد بلند کیا، پھر ان سب چیزوں سے آنکھ کیونکر بند کیا سکتی ہو؟
ذوالفقار علی تو ہمیشہ باطل کے سر پر صاعقہ موت بن کر چکی، ایسا کب ہوا ہے کہ اس
نے مریم کا کام دیا ہو؟ محمد علی کی زبان و قلم بھی شمشیر آبدار بن کر اپنے نقطہ نظر کے مطابق اپنا
کام کرتی رہی۔

مہذب ڈاکو | باپوڑ کے ضیاء الحق صاحب کے نام خواجہ حسن نظامی صاحب نے یہ خط بھیجا۔

”۸۷“ از درگاہ شریف حضرت محبوب الہی دہلی ۱۲ اگست سنہ

کمری سلام علیکم

وخط پہنچے ابھی دو چار دن کی اور مصروفیت ہو، اس کے بعد کھنے کی کوشش

کروں گا، لکھائی کا حساب رجسٹر میں دکھوا کر مطلع کروں گا۔
 کیا عجب ہو کہ گورنمنٹ نے لکھا ہو، میں نے چیف کمنٹر صاحب ڈی سے مفصل
 حالات بیان کر دئے تھے اور نظام کو پان اسلامزم کے جو سبق دئے جلتے تھے
 ان کی باضابطہ اطلاع دیدی تھی اور مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے پنجاب گورنمنٹ
 کو اس خطرہ سے آگاہ بھی کیا تھا۔ (یہ خط بالکل خانگی ہے اس کو چاک کر دیجئے۔
 یعنی میرے اس کام کی خبر سوائے آپ کے کسی کو نہ ہو۔ حسن نظامی“
 ایک عرصہ دراز تک یہ خط ہاپوڑمی صاحب نے اپنے پاس محفوظ رکھا، اکتوبر ۱۹۷۷ء میں
 وہ یہ دہلی لائے اور مولانا محمد علی اور بشیر یار ان قوم کو یہ خط دکھا کر ”چارہ جوئی“ چاہی، اس
 کی اطلاع خواجہ صاحب کو بھی ہوئی، اور انھوں نے اپنے اخبار منادی میں ”ہندب ڈاکو“
 کے عنوان سے یہ نوٹ لکھا۔

”ہندب ڈاکو کو معلوم ہو کہ میں ان کی دھمکیوں سے رعب نہیں ہوں گا“
 محمد علی کے نام خط | ۱۶ نومبر ۱۹۷۷ء کو خواجہ صاحب نے محمد علی کو مکتوب ذیل لکھا۔

”آپ کی شخصیت اور آپ کی مصروفیت ان فضولیات سے بالاتر ہے جب
 آپ والے صاحب کی خصلت اور تمام زندگی سے خود ہی واقف ہیں
 تو پھر میں نہیں جانتا کہ آپ کو اس معاملہ سے اس قدر دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی
 ہے میری آرزو ہے کہ آپ صاحب کے قصہ سے علیحدہ
 رہیں تو مناسب ہو کیونکہ آپ کی عظمت ان ادنیٰ معاملات سے بہت اونچی
 ہے۔“

لیکن محمد علی اس خط سے متاثر نہیں ہوئے، انھوں نے منادی والے نوٹ کے بعد

اس خط کو ہمدرد میں شائع کر دیا، اس لئے کہ لارڈ ریڈنگ کے مراسلہ سے حضور نظام کی منزلت کو جو نقصان پہنچا تھا وہ محمد علی کے نقطہ نظر کے مطابق تہیہ تھا اسی قسم کی رشتہ دوانیوں کا۔
محمد علی کا جواب | چنانچہ محمد علی نے خواجہ صاحب کے مکتوب گرامی کا جواب یہ دیا۔
 ”میں ایک اخبار نویس ہوں اور اس پیشہ کے باعث چند فرائض میرے ذمہ
 عائد ہوتے ہیں، ان سے کس طرح سبکدوش ہو سکتا ہوں؟ رہی ان صاحب کی
 شخصیت سو یہ معاملہ ان صاحب کی شخصیت کا نہیں ہے بلکہ خود آپ کی شخصیت
 کا ہے اور جو کارروائی آپ خود اقبال فرماتے ہیں کہ آپ نے کی ہے وہ ان صاحب
 کی شخصیت سے بے نیاز ہے اور اس قدر اہم ہے کہ میں اس سے چشم پوشی
 نہیں کر سکتا۔“

مفاد عام | سوال پیدا ہوتا ہے کہ محمد علی نے یہ ”پردہ درسی“ کیوں کی؟ وہ خود کہتے ہیں۔
 ”خواجہ صاحب سے میرے تعلقات کچھ بھی ہوں، جہاں مفاد عام کا موقع ہو
 وہاں میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔“

خواجہ صاحب کی صفائی | اس مسئلہ کے متعلق خواجہ صاحب نے خود اپنی صفائی بھی ان الفاظ
 میں دی تھی۔

”مولانا ظفر علی خاں کا اخبار ”تارہ صبح“ نکل رہا تھا اور اس میں تصوف کے
 خلاف مضامین شائع ہوتے تھے، اس واسطے مجھے بھی مولانا ظفر علی خاں صاحب
 سے سخت اختلاف تھا، اسی زمانہ میں مولانا ظفر علی خاں حیدر آباد میں بلائے
 گئے تھے، اور اعلیٰ حضرت حضور نظام کی ان پر بہت مہربانیاں ہو رہی تھیں
 ان مہذب ڈاکو صاحب نے مجھے لکھا کہ مولانا ظفر علی خاں صاحب اعلیٰ حضرت کو

پان اسلامزم کے سبق پڑھا ہے میں اور اندیشہ ہو کہ اعلیٰ حضرت اس کی وجہ سے کسی بلا میں نہ مبتلا ہو جائیں، جب مجھے یہ خط ملا تو سلطنتِ آصفیہ اسلامیہ کی حمایت اور مولانا ظفر علی خاں صاحب کے اثر کے نقصانات سے اعلیٰ حضرت کو بچانے کے لئے میں نے دہلی کے چیف کمنشنر صاحب اس کا ذکر کیا اور انہوں نے مجھے کہا کہ میں پنجاب گورنمنٹ کو اس کی اطلاع دوں گا، اس کے بعد میں نے ایک خط ہندو ڈاکو صاحب کو ان کے خط کے جواب میں لکھا کہ میں نے چیف کمنشنر صاحب کو اطلاع دیدی ہے کہ حضور نظام کو پان اسلامزم کے سبق پڑھائے جا رہے ہیں اور انہوں نے غالباً پنجاب گورنمنٹ کو اطلاع دیدی ہوگی۔“

محمد علی کا اظہار رائے | خواجہ صاحب نے خط کی اشاعت سے پیشتر احتیاطاً جو صفائی دیدی تھی، محمد علی اس سے مطمئن نہیں ہوئے، ان کا خیال تھا کہ

”یاد رکھئے کہ یہ زمانہ جنگِ عظیم کا تھا۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ اس جنگِ عظیم میں بھی بڑے توڑ کا تھا جبکہ جرمن فوج جنرل گارف کی فوج (پانچویں فوج) کا سین کاتین کے موقف پر قلع قمع کر کے درانی ہوئی آگے بڑھ چکی تھی، پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ غریب ظفر علی خاں صاحب کو کرم آباد میں نظر بند رہتے ہوئے تین چار سال گزر چکے تھے کہ انھیں کتنے کاٹا اور یہ کسولی جانے کے بعد کسی طرح شملہ میں پہنچ گئے اور بہ ہزار وقت اوڈواڑ کو راضی کر کے رہا ہوئے اور حیدر آباد پہنچے، ترک جرنیوں کے حلیف اور برطانیہ سے برسرِ پیکار ہیں اور ٹائمر آف انڈیا کا ایڈیٹر سابق کوٹ فزیر انگلستان کے اخبار ڈیلی میل میں وہ مضمون شائع کرا چکا ہے جس میں

مشرقی دھکی کو واضح کرنے کے لئے دنیاے مشرق کا ایک نقشہ دیا گیا تھا کہ اس پر ایک سیدھا تیر مسطظنیہ سے لیکر دہلی تک پہنچ کر ظاہر کیا گیا تھا کہ ترکی کے پہے تخت سے لے کر ہندوستان کے پایہ تخت تک دور دوریہ نقطہ مسلمانوں ہی کی آبادی ہو یا مسلمانوں کی اکثریت ہو اور ہندوستان کے واسطے لارڈ جیمز اس اسی خوف سے ہلی میں زعمار ہند کا وہ اجتماع کر چکے ہیں جس میں نہ صرف ہما گاندھی جیسے اس وقت کے انگریز دوست شریک کے گئے تھے بلکہ ملک ہمارا کا ایک نائب بھی مدعو کیا جا چکا تھا تاکہ سب مل کر اور بالخصوص زعمار ہند وہ تدابیر سوچیں اور انہیں ختم کیا کرنے کا حتمی وعدہ کریں جن سے ترکوں کی اسلامی فوج افغانستان ہوتی ہوئی ہندوستان میں داخل اور یہاں فوجیاب نہ ہو سکے۔ سارے باوجود یہ مسز سنبت رائے کے دور تھا نظر بندی سے رہا کے جا چکے ہیں، علی براور ان کے متعلق کونسل میں صاف کہہ دیا جا چکا ہے کہ ان کی صورت مسز سنبت سے مختلف ہو ایسے وقت میں خواجہ صاحب چیف کمنٹر کے پاس جاتے ہیں کہ ”مولانا ظفر علیاں صاحب حیدر آباد بلائے گئے تھے“ اور اعلیٰ حضرت کی ان پر بہت ہر باتیاں ہو رہی تھیں ”چیف کمنٹر سے کہتے ہیں کہ ”مولانا ظفر علیاں صاحب اعلیٰ حضرت کو پان اسلامزم کے سبق پڑھا رہے ہیں۔“

دھکی کا جواب | بالوڑی صاحب نے ایک بار اور کسی موقع پر پان اسلامزم والے خط کی خواجہ صاحب کو یاد دہانی کرائی تو خواجہ صاحب نے یہ جواب دیا۔

دہلی - ۲ صفر ۱۳۳۵ھ

مکرمی - سلام علیکم

..... آپ نے آخری خط میں کسی تحریر کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق حضور نظام سے ہے، میں بالکل نہیں سمجھا کہ اس میں کیا ہے اور وہ کس کی تحریر ہے؟ خواجہ صاحب کے اس جواب کو محمد علی نے ”تجاہل عارفانہ“ سمجھا اور اصل خط اوپر یہ خط دونوں ہمدرد میں شائع کر دئے اور مزید تصدیق کے لئے خطوط کے بلاک بنا کر بھی ہمدرد میں شائع کرا دئے۔

خط چروانے کی کوشش | خط کی اشاعت سے پیشتر محمد علی کے بیان کے مطابق خواجہ صاحب نے اپنا یہ خط چروانے کی بھی کوشش کی، چنانچہ شیخ فضل حسین صاحب مالک ہلالی پریس سے عبدالسار بیگ تیموری کے مواجہ میں خواجہ صاحب نے کوشش کرائی، ان دونوں حضرات نے بجائے خط چروانے کے اصل حقیقت محمد علی پر ایک اور دوسرے بزرگ کے سامنے واضح کر دی تیموری صاحب کے بیان کا خلاصہ یہ ہے:-

”خواجہ صاحب نے غالباً ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت لیا اور اس تمام عرصہ میں وہ شیخ ضیاء الحق صاحب اور اپنے خط کے متعلق ذکر فرماتے رہے، اس وقت ان کی گفتگو کا لہجہ بہت عاجزانہ اور مسکین پن کا تھا، انھوں نے تین چار مرتبہ اصل خط کے اڑا دینے کے لئے فضل حسین صاحب سے کہا۔“

الزامات | یہ جنگ شروع ہوئی تو طرفین سے بڑے زبردست مضامین و مقالات لکھے گئے، فریق ثانی کی طرف سے ایک باقاعدہ روزانہ اخبار ”غریبوں کا اخبار“ جاری ہوا، جس میں محمد علی اور حامیان محمد علی پر بڑے دلچسپ مضامین شائع ہوئے، آخر میں محمد علی

پر رقابت کا الزام لگایا گیا کہ وہ ڈاکٹر انصاری حکیم جہاں ، مولانا ابوالکلام آزاد، غرض تمام لیڈروں سے حتیٰ کہ مولانا عبدالباری اپنے مرشد سے بھی ”رقابت“ رکھتے ہیں چنانچہ مولانا عبدالباری نے محمد علی کو آخر عمر میں ”مردودِ ظرافت“ کر کے ”حق“ کر دیا، اس کا جواب محمد علی نے جو دیا وہ بہت اہم ہے اس کا ایک خاص حصہ یہ ہے جس میں ضمناً دوسرے الزامات بھی آجائیں گے اور ان کی صفائی بھی۔

”خواجہ صاحب خود ہی اس کا فیصلہ کریں اور میں انکی عدالت میں ایک ایسا شاہ پیش کر دوں گا جسے وہ بھی شاہِ عادلان لیں اس شاہ کا نام باپ دادا اور بزرگوں کا رکھا ہوا تو ”علی“ ہو سکتا ہے لیکن وہ خود اپنے کو خواجہ حسن نظامی کہتا ہے، وہ مکیم تمبر کے روزنامہ اور شب نامہ میں تحریری شہادت پیش کرتا ہے کہ۔

”خلافت اور جمعیتہ العلماء کے وفود حج کر کے واپس آئے ہیں انکے استقبال کیلئے ہزار ہا مسلمان اسٹین پر جمع ہوئے ہیں نے اندازہ کیا تو سات آٹھ ہزار آدمی کا حجوم تھا، ہر طبقہ کے مسلمان آئے تھے... بجیروں کے نعروں سے اسٹین گھنجنے لگا، دیکھ کون کہتا تھا کہ محمد علی ایک آبرو ہاتھ سہارا تو مہراور اسکی ماں کے جنازہ میں ٹھائی سو سو زیادہ آدمی بھی جمع نہ ہو سکے، دیکھو صفحہ ۵ کا لم ایک غریبوں کا اخبار مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۳۷ء... علی برادران نے حجاز کے نہایت دردناک حالات سننے بے اختیار رونا آگیا، دیکھ کون کہتا ہے کہ سنو ملی کے غریب لکھو تھائے ہاں ایک سونے والا لیڈر آیا ہوا ہے جو بات بات میں روتا ہے، گلی گلی کہتے پھر دوہ آیا رویو والا لیڈر دیکھو صفحہ ۲ کا لم ۳ غریبوں کا اخبار مورخہ ۱۸ نومبر، بعد مغرب جلسہ شروع ہوا جامع مسجد کو جلسوں میں اتنا مجمع میں نے کبھی نہیں دیکھا، پندرہ بیس ہزار آدمی تھے... میں نے مسلمانانِ ہلی کی طرف جمعیتہ علماء جمعیتہ خلافت کے لیڈروں کو ایڈریس کرنا یا (وہ طوالت کے خیال سے حذف کر دیا گیا) اس میں

علی برادران کی کافی طرح و توصیف تھی مولف،

اس کے بعد اب پڑھو غریبوں کا اخبار ہر روز اور ہر تاریخ کا ہر صفحہ اور ہر کالم ہر فقرہ اور ہر لفظ اور پھر دیکھو کہ یہ سب کچھ وہی شخص کہہ رہا ہے جو ۲۷ اگست کو خانہ خلا میں یہ کہہ رہا تھا (اشارہ ہے اس پسانامہ کی طرف جو خواجہ صاحب نے جامع مسجد میں دیا تھا، مولف) ... بحث کی نماز کے بعد مولنا شوکت علی اور مولنا محمد علی صاحب کی شاندار تقریریں بارہ بج تک ہوئیں مولنا محمد علی کی تقریر کا حاضرین پر بہت اچھا اثر ہوا میرا اعتقاد تو یہ ہے کہ علی برادران سلام کے سچے عاشق ہیں انھوں نے پہلے جب ابن سعود کی مخالفت شروع ہوئی تو محض اس وجہ سے ابن سعود کی حمایت کی کہ ان کو یقین تھا کہ ابن سعود برا آدمی نہیں ہے اور قریب لگنی کی خبر یہ مخالطہ آمیز اور غلط ہیں اس معاملہ میں ہوتے ثابت قدم رہو کہ اپنی مرشد حضرت مولنا عبدالباری صاحب سے بھی موافقت پُرانی نہیں ہوئے لیکن جب انھوں نے خود حجاز میں جا کر اپنی آنکھوں سے سب امتعات کو دیکھ لیا تو اب وہ ایمان داری کے ساتھ ابن سعود کی مخالفت کر رہے ہیں اب انھوں نے بڑا اختلاف ابن سعود کی ملکیت اور ابن سعود کی قبیلگی اور مزار شعلنی سے ہے اور اس معاملہ میں تمام دنیا کے مسلمان ان کے ساتھ ہیں ... کیا فرماتے ہیں شیخ المشائخ و قطب الاقطاب فاضل القضاۃ مرشدی و مولائی حضرت خواجہ حسن نظامی طول زلف پنج اس مسئلہ کے کو ناسن نظامی سچا ہے اور کو ناسن نظامی جھوٹا ہے وہ جو کہتا ہے کہ ”حضرت مولنا محمد علی کو مذہب پیارا نہیں ہے محض سیاست پیاری ہے“ غریبوں کا اخبار، ۲ نومبر صفحہ اکالم ۲، یادہ جو اپنے کوچی کا دلی والا سمجھ کر لٹے بٹے مجمع میں جو جامع مسجد میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا ”اس آبرو بانہ“ لیڈر کو بانہ پڑھ کر سنا تا ہے اور اسکی بے انتہا تعریف و توصیف کرتا ہے اور جامع مسجد سے واپس آکر اپنے

شب بچہ میں لکھا ہے کہ میرا تو اعتقاد ہے کہ علی برادران اسلام کے سچے عاشق ہیں مینود توجروا۔
 کس حسن نظامی پر خدا کی رحمت اور کس حسن نظامی پر خدا کی لعنت اس پر جو کہتا ہے ”علی برادران
 اتنے ثابت قدم ہے کہ اپنے مرشد حضرت مولانا عبد الباری صاحبؒ کی موافقت
 پر راضی نہیں ہوئے یا اس پر جو کہتا ہے کہ مولانا محمد علی اپنے پیرو مرشد حضرت مولانا عبد الباری
 صاحبؒ کے بڑھتے ہوئے رسوخ کو بھی نہ دیکھ سکے، کو حسن نظامی جھوٹا؟
 مینود توجروا“

اسی قبیل کے مینود بلکہ سیکڑوں الزامات محمد علی پر لگائے گئے اور انھوں نے انکے جوابات بھی دیے۔
لب دلچہ کی شکایت | اسطور بالائے اپنے اندازہ لگایا ہوگا کہ محمد علی کا لب دلچہ بہت سخت ہے اس کا
 ایک جواب تو غریبوں کا اخبار، کا ایک ایک حرف ہے اور دوسرا جواب خود محمد علی کے الفاظ میں یہ ہے۔
 ”مخاص“ مجھے معاف فرمائیں اگر انکے نزدیک طرز تحریر میں ہر وقت مہمانت و سنجیدگی نہیں
 نظر آتی جس کے وہ عادی ہیں، وہ ”عوام“ کی کمزوریوں کو نہیں جانتے اگر عوام کو خواہ
 صاحب کفر کا دہونے سے نہیں بچانا ہو تو اس تلخ کونین کی گولی پر شکر کی ایک ترہ چڑھانی
 پڑگی یا یوں کہئے کہ باوجود چٹھائے ”کی خود شکایت کر نیکی مجھے ان مریضوں کو ابلی ٹھہری
 کے ساتھ کم از کم آلو بجائے اور سیاہ مچ کی چٹنی دینا ہوگی، اور اس غذا کو خلق سوتا نہ لکھیا
 منہ تک نہ لیجائیں گے۔“

طوالت کلام | اس صنوع پر سلسل مضمون دیکھ کر لوگ گھبراٹھے تھے، کچھ انسانی فطرت ہی ایسی ہے کہ
 ایک ہی صنوع پر سلسل نہ تقریر بند کرتی ہے نہ تحریر اس کا جواب بھی محمد علی کے الفاظ میں یہ ہے۔
 ”ایک دفعہ مین لکھ دینے سے کام نہیں چلیگا، مسلمانوں کی خود فراموشی اور غفلت سے آپ
 بیخبر ہیں، حضرت ہے کہ یہ مسئلہ برابر لکھتے ہیں نظر ہے، یہاں تک کہ ان کو اس کی اہمیت

کا پورا پورا احساس ہو جائے، اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

می شود ہر مودر ازے خرقة پوش آہ زیر سوداگران دیں فروش
با مریداں روز و شب اندر سفر از ضرورت ہائے ملت بے خبر
ویدہ ہائے نور مثل زگس اند سینہ با از دولت دل غفلت اند
واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست اعتبار ملت بیضا شکست
واعظاں چشم بر بت خانہ دوخت مفتی دین متین فتویٰ فروخت
حصیت یا راں بعد ازیں تدبیر ما رُخ سوئے میخانہ دار و پیر ما

ایک اور حقیقت | بابوڑی صاحب نے ایک کتاب "پولیکل گرگٹ" لکھی تھی جس کا دیباچہ غلام نظام الدین صاحب نظامی پری کے نام سے شائع ہوا تھا، محمد علی نے انکشاف کیا کہ وہ خواجہ صاحب کا ہوا اور سبب ثبوت بہتر میں شائع بھی کیا، چنانچہ ایک مقام پر وہ تحریر فرماتے ہیں۔

”پولیکل گرگٹ نامی مینٹ کا دیباچہ غلام نظام الدین صاحب ظاہر کیا گیا ہے مگر یہ وہ
”از جناب خواجہ زادہ حضرت نظام الدین اولیا مصوفی فطرت سابق مجاور و ساری گو
درگاہ شریف مصنف مجھ کا اعلان جنگ پسو کا پیغام صلح و ہزاران ازیں قبیل خانات
از فرام قبلہ ٹوشملہ تاکم ٹوموت وغیرہ وغیرہ و شریک لوٹ کھسوٹ نظام المشاخ جوتہ
رعیت، مرشد پریہانی، اگر دیوک، پیشوا، مولوی، درویش، فقیر، قلندر، مداری، ساہو
جوگی وغیرہ وغیرہ حال حاضر میں کے خواجہ جھوٹی تبلیغ کے راجہ سیدی، مرشدی، مولائی
پیدائشی علی حسن، خود ساختہ حسن نظامی، تعویبوں کے اخبار ولے وغیرہ نواز ثانی جہاد
گیموراز ثانی، پوسٹریازی و پریگنڈے میں لاشانی وغیرہ کتر آمد حقہ و قتل اللہ باطلہ
ساکن عیث پور حال واردین سیر اور دیش خانہ حسین خانہ ایمان خانہ وغیرہ وغیرہ ولی

والے بڑے متوالے، سب سے نزلے، خدا ان کے پیچھے کسی کو نہ ڈالے۔“

آپس کی گالیاں | غریبوں کے اخبار کا جس صاحبِ ذوق سلیم نے ایک صفحہ بھی دیکھ لیا، اس نے اخبار دیکھنے سے قسم کھالی، طرفین سے قسم کے الفاظ کا تبادلہ ہوا، اب اگر ان نمونہ آپ کے سامنے پیش کیا جائے تو یہ کونسی علمی ادبی یا سیاسی خدمت ہوگی، مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری کے سلسلہ میں ان چند باتوں کا پیش کرنا ناگزیر تھا، اس لئے صرف اتنا مواد پیش کر دیا گیا کہ حقیقت حال واضح ہو جائے، اصل مسئلہ سمجھ میں آجائے، صورت مسئلہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔

دور نہ محمد علی پر جو تہمت تراشیاں کی گئیں، انھیں جس طرح ہدفِ مطاع بنایا گیا، طرح طرح کے بے بنیاد واقعات ان کے متعلق مشہور کئے گئے اور ہر طرح سے انھیں ذلیل و رسوا کرنے کی کوششیں کی گئیں، کس کا دل ہو کہ انھیں پڑھے اور کس کا قلم ہو کہ انھیں لکھے، فیصلہ کیا ہوا؟ اسے ان مضامین میں نہ تلاش کیجئے بلکہ زبانِ خلق سے پوچھئے، جسے تقارہ خدا کہتے آئے ہیں۔

اب یہ عنوان ختم کیا جاتا ہے لیکن خاتمہ سے پیشتر یہ گزارش ضروری ہو کہ حتی الامکان پوری کوشش کی گئی ہو کہ نفسِ مسئلہ کے متعلق مواد فراہم کیا جائے اور ذاتیات پر جو خاصہ فرسائیاں کی گئی ہیں، نیز غیر متعلق مباحث پر جو زبردست پروپیگنڈا کیا گیا ہو اسے قطعاً نظر انداز کر دیا جائے اور صرف نفسِ مسئلہ کو پیش کیا جائے۔

مزید تفصیل آئندہ مورخ کے لئے چھوڑے۔

باب ۳

اسپیشل خلافت کانفرنس

مئی ۱۹۳۱ء میں اسپیشل خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جس نے ہندوؤں کو محمد علی سے بہت برا لکھتے کر دیا تھا، اور یہ خیال ظاہر کیا جانے لگا تھا کہ اب خلافت کمیٹی اور محمد علی میں بھی فرقہ وارانہ جراثیم سرایت کر گئے ہیں، ان کے پیش نظر اب ملکی آزادی نہیں ہو بلکہ ہندوستان میں بافریق و اختلاف کی خلیج کو زیادہ سے زیادہ وسیع کر دینا ہے!

اس کانفرنس کے بعد ان پر اور حکیم اجل خاں مرحوم پر جس جس طرح کے رکیک حملے کئے گئے ہیں، اور جس جس طرح سے انہیں ذلیل و بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ ایک دردناک داستان ہے، اور ایک ایسا آئینہ ہے جس میں بہت سے نام نہاد قوم پرستوں اور وطن پرستوں کی ”قومیت“ اور ”وطنیت“ کا چہرہ بے نقاب دکھایا جاسکتا ہے اور حقیقت معلوم کر لی جاسکتی ہے

ملک کی فضا | پچھلے صفحات میں اس پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے کہ محمد علی کی گرفتاری کے بعد ملک میں کیا حالات و انقلابات رونما ہوئے تھے؟ ملک کے امن و امان کو شدید گھٹن کی تحریکوں سے کس طرح تاراج کیا گیا، اور ہندو مسلمانوں کے اس عنصر کو جو صلح و سلام، اتحاد و اتفاق اور خلوص و محبت کا داعی تھا کس طرح گوشہ عزلت اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا؟ نیز ہندوستان کے بڑے بڑے زعماء نے عافیت اس میں سمجھی کہ وہ اس وقت ایک تاشائی کی حیثیت سے ملک و قوم کی اس دردناک کشمکش کا معائنہ کریں، اور جب حالات سازگار

ہو جائیں تو پھر پلک انگی ہے، پلیٹ فارم اٹکا ہے ایٹج ان کا ہے۔
محمد علی کارویہ | لیکن محمد علی نے گوشہ غزلت نہیں اختیار کیا، اوتھوں نے اپنے آپ پر
 قوت نہیں طاری کیا، اور نہ اپنے تئیں بے بس اور مغلوب ثابت کیا!

وہ مردانہ وار میدان عمل میں آئے، اوتھوں نے اپنی قوم میں ایک محاذ جنگ
 قائم کر دیا، اور مسلمانوں میں جن لوگوں نے اتحاد کش اور امن سوز سرگرمیوں کا بازار گرم
 کر رکھا تھا، اُن سے وہ برسر پیکار ہو گئے، اپنے اقتدار، اپنی وجاہت، اور اپنی لمبت
 پوزیشن "کا اوتھوں نے بالکل خیال نہیں کیا وہ ہر اس شخص سے لڑے جس نے ہندو مسلم
 اتحاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جس نے تبلیغ کا راجہ "بکر قوم کو تباہ و برباد کرنا چاہا
 اور جس نے تنظیم کے داعی کی حیثیت سے مسلمانوں کو آزادی کی منزل مقصود پر دوڑ کرنا چاہا
مشکلات | محمد علی کو اپنی کوششوں میں سخت حوصلہ شکن مشکلات سے دوچار ہونا
 پڑا، خود مسلمانوں میں انھیں ذلیل ہونا پڑا، اور جن لوگوں سے وہ اپنی قیادت کی داد لے
 رہے تھے انھیں کے خلاف میدان جنگ میں اترنا پڑا۔

حالانکہ اگر وہ چاہتا تو خاموشی سے اپنی قیادت کو برقرار رکھ سکتے تھے لیکن ان کے سامنے ایک لاکھ
 عمل تھا، ایک طرح نظر تھا، اور وہ قوم کو اسپرگام فرما کرنا چاہتے تھے، اس لئے اُن سے
 خاموش نہیں بٹھایا گیا، اور جو بھی سنگ راہ بکر میدان میں آیا اُسکے اوتھوں نے پیرزے
 پیرزے کر ڈالے،

کامیابی | سخت جدوجہد، مسلسل کوشش، اور پیہم مبارز طلبیوں کے بعد محمد علی کو
 اتنی کامیابی ہوئی کہ اب اٹکا حریف راہ کوئی باقی نہیں رہ گیا، اوتھوں نے مسلمانوں کے
 دلوں میں یہ بات راسخ کر دی کہ آزادی حاصل کرنا، ہر مسلمان کا فرض ہے، غلامی سے

تشریف ہر مومن کا امتیازی نشان ہے، یہ انھیں کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں ان لوگوں کا اثر پھیل گیا، جو قیادت کی عبا پہنکر لوگوں کو گمراہ کرنے آئے تھے، لیکن جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ قوم کو قعرِ ملاکت میں گرائیں، اور ذاتی و شخصی منافع حاصل کریں قوم کے سرتاج بھی رہیں اور گورنمنٹ کے منظور نظر بھی۔

تصویر کا دوسرا رخ | لیکن یہ تو تھا، تصویر کا ایک رخ، جو خدا کے فضل سے جاذبِ نظر معلوم ہو رہا ہے۔

لیکن دوسرا رخ، تاریک تھا، اور اس کی تاریکی میں اضافہ ہی ہو رہا تھا، محمد علی نے تبلیغ و تنظیم کے مقابلہ میں جس سرگرمی اور خلوص کا مظاہرہ کیا تھا وہ چاہتے تھے کہ اس سرگرمی اور خلوص کا مظاہرہ ہندو زعماء کی طرف سے بھی ہو جس طرح انھوں نے میدانِ عمل میں آکر مسلمانوں کی مخالفت کی، اور جمہور کو غلط رہنمائی سے بچایا، اسی طرح برادرانِ وطن کے بنجیدہ رہنما یعنی کانگریسی قائدین بھی میدانِ عمل میں آئیں، اور ہندو جمہور کی مخالفت کریں، ان کو غلط رہنمائی سے محفوظ رکھیں اور کوشش کریں کہ افتراق کی خلیج پٹ سکے۔

جواب | لیکن انکی طرف سے جو عملی جواب دیا گیا وہ بہت زیادہ عجیب و غریب اور حد درجہ افسوس ناک تھا، ہندو زعماء کانگریس نے شدید و سنگٹھن کے خلاف ایک محاذِ جنگ تیار کرنے سے انکار کر دیا، اکثر نے ان لوگوں کی کوئی مخالفت نہیں کی جو امن و امان کے دشمن ثابت ہوئے تھے، انھوں نے سوامی شرودھانند، لالہ ہریال، بھائی پرانند، پٹیل مالویہ اور لالہ لاجپت رائے کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جو چاہیں کریں، اور خود خاموشی کی قسم کھالی۔

سنگٹھنی جماعت نے آل پارٹیز کانفرنسوں کو ناکام کرایا، یونٹی کا نفرنیوں کو ملتوی کرایا، اتحاد و اتفاق کی کوششوں سے اعراض کیا پھر بھی ان کے خلاف کانگریسی حلقہ سے

کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔

کانگریسی زعماء اکثر زعماء کانگریس کا یہ عالم تھا کہ وہ اس تخیل سے لرزتے تھے کہ وہ ہندو بھیا یا اُس کے محترم کارکنوں کی مخالفت کریں، بلکہ اپنے طرز عمل سے ان کی بیچ و تباہی اور تعریف و توصیف اور تائید و اشتراک عمل کا ثبوت دیتے دیتے تھے۔

گاندھی جی کی روش گاندھی جی اگرچہ گوشہ تنہائی اختیار کر چکے تھے اور کسی طرح میدان عمل میں آنے پر رضا مند نہیں ہوتے تھے، لیکن پھر بھی سوامی شر دھانند کا ان سے بڑھ کر معروف کوئی نہیں تھا، وہ برابر سوامی جی کے خلوص اور ان کی ملکی خدمات کا اعتراف کرتے تھے اور انھیں ہندو مسلمانوں کا سچا بھدر ثابت کرتے تھے۔

مالوی جی کے تقدس کے وہ ہمیشہ قائل رہے، انھیں اپنا بزرگ اور ہندوستان کا قائد اعظم انھوں نے ہمیشہ سمجھا۔

امرتسر پراونشل کانگریس امرتسر پراونشل کانگریس کے موقع پر جب مولانا ظفر علی خاں نے مالوی جی کی اسلام آزار، اور اتحاد سوز مساعی پر بیچ و فاسوس کا اظہار کیا تو گاندھی جی نے ان سے کہا کہ تم نے تو آج میرے سینہ پر گھونسا مار دیا! مالوی اور یہ سنگین الزامات بالعب تم العجب!

موتی لال کارویہ پنڈت موتی لال نہرو سے محمد علی کو یہ شکایت تھی کہ وہ ہندو بھاسجا سے مرعوب ہو گئے اور اس کا اثر کانگریس کے طرز عمل پر پڑ رہا ہے۔

یہ ہندو بھاسجا کا اثر ہی تھا جس نے موتی لال اور ان کی سوراہ پارٹی کو مجبور کر دیا کہ وہ صوبہ سرحد کو مساوی اصلاحات دے جانے کے خلاف ملک میں آواز اٹھائیں اور اسلی ہال میں ہاتھ!

کانگریس کے بعض ہندو لیڈروں نے حکیم اہل خاں کی تنبیہ و سرزنش کے باوجود اس سے صاف انکار کر دیا کہ ہندو مہا سبھا کے خلاف ایک حرف بھی کہیں گے، اس لئے انتخابات کا زمانہ قریب آ رہا تھا، اور انھیں ”ووٹ“ حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنی تھی اور پھر وہ یہی لوگ تھے جنہیں لاجپت رائے اور مالوی جی نے اس وقت سخت شکست دی تھی جب اسمبلی کی ممبری کے لئے انھوں نے کانگریس کے ٹکٹ پر مسٹر آصف علی کو دہلی کی طرف سے کھڑا کیا، باوجود منت سماجت کے ایک مہا سبھائی کو مالوی جی نے ان کے مقابلہ میں کھڑا کیا اور آصف علی کو شکست دلوائی!

ان حضرات میں یہ جرات نہیں تھی کہ وہ مہا سبھا کے خلاف کچھ کہہ سکتے یا ہندو مہا سبھا کے کارکنوں میں سے کسی سے اختلاف کرتے۔

محمد علی اور کوشش ”صلح“ | محمد علی نے ان حالات کے برعکس اپنی قوم میں سب کی مخالفت مول لے کر فضا کو ہموار کیا بہت سی یونٹی کا نفر نیس منعقد کرائیں، زیادہ سے زیادہ اپنے درجہ سے گرے ہوئے الفاظ میں ہندوؤں کی منت کی کہ خدا کے لئے راہ راست اختیار کرو، اور اسی پر اپنی قوم کو چلانے کی کوشش کرو۔

کاندھی جی کے گفتگو | آخر مجبور ہو کر انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے بزرگوں کی معیت میں کانپور کانگریس کے موقع پر ایجا کی کہ اب وہ اپنا قتل خاموشی توڑیں، اور اس مخالف فضا کا مقابلہ کر کے نسبتاً اچھی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں، اسی طرح محمد علی نے دوسرے زعماء سے بھی گفتگو کی، اور انھیں آمادہ کرنا چاہا کہ وہ مہا سبھا کے خلاف کچھ کارروائی کریں تاکہ پھر وہی فضا قائم کیجاسکے جس کے وہ متنبی ہیں اور جو آزادی

کی طرف پہنچانے والی ہے۔

لیکن یہ تمام کوششیں بے نتیجہ رہیں پرائیویٹ گفتگوؤں میں مہاسبھائیوں کو برا کہنے میں تو شاید ہی کسی کانگریسی لیڈر کو تامل ہو، لیکن پبلک میں! زبان یاری نہیں دیتی تھی، اور دل کے خلاف زبان سے کام لیا جاتا تھا۔

محمد علی کا فیصلہ | اب محمد علی نے یہ فیصلہ کیا! ذرا اس دل گردہ، اور اس غم کو ملاحظہ فرمائے کہ وہ خود ہندو لیڈروں کا مقابلہ بھی کرینگے اور ان کی امن سوز جدوجہد کی مدافعت پوری طاقت سے کرینگے، اور بالآخر انہیں بھی اسی طرح بے نقاب کر کے چھوڑیں گے، جس طرح مسلمانوں کے بعض ”لیڈروں“ کے ساتھ وہ کرچکے تھے،

۱۔ چنانچہ انھوں نے ڈاکٹر موبخے، پنڈت مالوی، اور دوسرے بزرگوں کے نفاق انگریز رویہ پر سخت نکتہ چینی کی، اور انکی نقصان سناں اور مضرت دہ پالیسی کا پردہ چاک کیا اور جن مقاصد کیساتھ یہ حضرات مصروف عمل تھے، انھیں پبلک سرورٹھناس کرایا، محمد علی کے یہ مضامین نکلے! اور ہندو پریس میں آگ لگ گئی، اتنا وسیع، اتنا مستقل، اور اتنا سلسل ”پروپیگنڈا“، محمد علی کے خلاف کیا گیا کہ حد بیان سے باہر ہے!

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پر لطف بات یہ ہو کہ جب تک محمد علی مسلمان لیڈروں کی پردہ دری کرتے رہے اور گمراہ رہنماؤں کی مخالفت کرتے رہے، اس وقت تک تو وہ کانگریس کی آنکھ کا تارا بنے رہے، اور حزب دھنوں نے مالوی اور لاجپت رائے، ہرنال اور موبخے کی پردہ دری کی، تو مہاسبھا تو مہاسبھا، خود کانگریسی حلقوں کی چین پشانی چھپائے نہ چھپ سکی،

اسپیشل خلافت کانفرنس | ان تمام باتوں کے بعد مجبور ہو کر انھوں نے اسپیشل خلافت

کانفرنس کا مئی سسٹم میں دہلی میں اجلاس منعقد کرانا چاہا، اور اس کے انتظامات شروع کر کے مقصد یہ تھا کہ آخر مسلمانوں کو برا بھلا کہنے کی کوئی حد ہے، فسادات کم نہیں ہوتے، اختلاف کم نہیں ہوتا، ہندو، ہابھیائیوں کی مخالفت کرتے نہیں، پھر اسی زمانہ میں کلکتہ میں مسلسل فسادات ہوئے تھے، جن سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا تھا، تو مجبور ہو کر انہوں نے ایک اجلاس منعقد کرانا چاہا، جس میں مسلمانوں کے آئندہ طرز عمل کا فیصلہ کیا جائے اور غور کیا جائے کہ وہ کیا تدابیر ہیں جن سے پھر ہندو مسلمانوں میں امن قائم کرایا جاسکتا ہے اور انکی حفاظت ہو سکتی ہے،

محمد علی کا بیان | چنانچہ محمد علی کانفرنس کے انعقاد کی غرض غایت یوں بیان کرتے ہیں۔

”جب پنڈت موتی لال نے ہابھیائیوں کو ایک حرف بھی کہنے سے انکار کیا تو حکیم اجل خاں صاحب مرحوم نے مجبور ہو کر ان سے صاف کہہ دیا کہ اب وہ مسلمانوں سے کچھ توقع نہ رکھیں !

جب ہماری سعی لا حاصل رہی، اور ایک ہندو لیڈر بھی ہندو ہابھیائیوں کے خلاف کچھ نہ بولا تو ہم نے دہلی میں اپیشل خلافت کانفرنس کا اجلاس طلب کیا، اس کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کی صدارت حکیم اجل خاں رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی اور کانفرنس کی صدارت مولانا سید سلیمان ندوی نے“

کانفرنس کا اجلاس | بالآخر دہلی میں اپیشل خلافت کانفرنس کا اجلاس حکیم اجل خاں کی تحریک اور مولانا ابوالکلام دشتوکت علی کی زبردست تائید سے مولانا سید سلیمان کی صدارت میں منعقد ہوا،

خلافت کانفرنس کا خطبہ صدارت ہندو جہا بھاکا "ایڈریس" نہیں تھا بلکہ اس میں نہایت متانت و سنجیدگی سے ملک کی حالت زار کا نقشہ کھینچا گیا تھا، اور اتفاق و اتحاد کی تناظر ہر کی گئی تھی، اور صاف صاف یہ بھی کہہ دیا گیا تھا، کہ اب ہم میدان عمل میں اتر چکے ہیں، اور اپنے ہندو دوستوں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا رہے ہیں، اب یہ انھیں اختیار ہے کہ وہ اس ہاتھ کو وہ ہاتھ سمجھیں جو ایک دوست دوسرے دوست کو مصافحہ کیلئے بڑھا رہا ہے یا وہ جو ایک پہلوان دوسرے پہلوان کی طرف اکھاڑہ میں بڑھا رہا ہے!

کانفرنس کی تجاویز | کانفرنس میں کئی اہم تجاویز منظور ہوئیں لیکن ایک تجویز بھی ایسی نہیں تھی، جس سے تفاق کی بوائی ہو، جس سے مقابلہ کی تناظر ہر ہوتی ہو، جس سے کانگریس اور ہندوؤں سے بیزاری کا اظہار ہوتا ہو، جس میں اعلان جنگ ہو۔!

ہر تجویز نہایت معتدل، نہایت معقول، اور اس تناظر سے لبریز کہ ملک میں پھر ملتان قائم ہو، اور ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں کہ فسادات کی یہ گرم بازاری ختم ہو جائے، اور نہایت شرافت و اطمینان کے ساتھ ہندو مسلمان دونوں اپنے اپنے فرائض بجالائیں، انہیں کوئی مانع نہ ہو، اور نہ کوئی ان کا رد و ایسوں میں خلل انداز ہو!

محمد علی کی تقریر | اس کانفرنس کے بعد ہی محمد علی وفد حجاز کے ساتھ دہلی سے روانہ ہوئے اسٹیشن پر جو مسلمان الوداع کہنے کے لئے آئے تھے، ان سے محمد علی نے فرمایا: "یہ ملک کے لئے سخت ترین ابتلا و آزمائش کا زمانہ ہے نہ آپ مشتعل ہوں نہ اپنے کسی لفظ سے یا عمل سے اہل ہندو کو مشتعل ہونے کا موقع دیں میں درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ تمھاری اوپر ہاتھ اٹھائیں تو سر جھکا دو، اگر چھری دکھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو،"

یہ الفاظ محمد علی کی زبان سے اسوقت ادا ہوئے ہیں جب ہما بھائی کیپ سے انہیں غدار وطن کا خطاب مل چکا ہے، اور کانگریس حلقہ بھی انہیں چڑھے ہوئے تھیں تو رو سے دیکھ رہا ہے،

ہمیں نہیں معلوم کہ اس سے زیادہ کشادہ دلی اور رواداری کا اظہار کبھی کسی نے کیا ہو!

ہندوؤں کی مخالفت | اس من پرور بیان اور ان صلح جو تجاویز کے باوجود، اسپیشل فٹ کانفرنس کو طح طح سے بدنام کیا گیا، اور حکیم اجل خاں، اور محمد علی کو ہندو پرہس نے ایسے ایسے الفاظ سے یاد کیا کہ انکا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے، بہر حال یہ تھی وہ اسپیشل کانفرنس جس نے کانگریس کو خلافت سے بدول اور بدن کرنا شروع کیا،

باب

قانون حج

اس سے پیشتر اجمالی طور سے اسکا ذکر آچکا ہے کہ گورنمنٹ نے ایک باریب ٹرنز مارین کمپنی کو حجاز کی جہاز رانی کا ٹھیکہ دینا چاہئے، تو حاجیوں پر واپسی ٹکٹ کی شرط بھی لازم کر دینا چاہی تھی، مگر محمد علی کی بروقت مخالفت لارڈ ہارڈنگ سے تحریک، اور خود لارڈ موصوف کے تدبیر کی بدولت، حکومت بمبئی کی یہ ”سفارش“ وائسرائے بہادر منظور نہیں کر سکے اور یہ تجویز معرض التوا میں ٹپ گئی، اور ایک عرصہ تک کسی کو اسکا خیال بھی نہیں آیا، لیکن جس قانون سے گورنمنٹ کو بالواسطہ بھی فائدہ پہنچتا ہو، اور انگریز تاجروں کو نفع ہو رہا ہو، وہ زیادہ عرصہ تک وقف طاق نسیان نہیں رہتا، کبھی نہ کبھی اسے منظر عام پر آنا ہی پڑتا ہے،

قانون حج کا مسودہ | چنانچہ گورنمنٹ کی طرف سے سلسلہ عین پھر یہ تحریک پیش ہوئی کہ ایک ایسا قانون وضع کر دیا جائے، جسکی رو سے حج کو جانے والے زائرین مجبور ہوں کہ وہ اپنی ٹکٹ لیکر جایا کریں، اور کم از کم اتنی رقم جمع کرایا کریں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ ”سرمایہ آڑیں“ مفلس و فلاش نہیں،

اس طرح گورنمنٹ کو بھی اپنے نظم و انتظام میں سہولت ہوگی، اور حجاج کو بھی طہر سرح کی آسانی ہوگی، موجودہ صورت میں دونوں کو سخت نقصان اور اس سے زیادہ تکلیف کا سامنا ہوتا ہے،

دلائل | دلیل پیش کی گئی کہ اکثر حجاج نادار ہوتے ہیں اپنے مذہبی جوش میں ہندوستان

سے روانہ تو ہو جاتے ہیں، لیکن چونکہ بہت کم رقم لیکر چلتے ہیں اسلئے راستہ ہی میں مفلس ہو جاتے ہیں اور دوسروں کی مدد پر ان کی گدازان ہوتی ہے اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس کرایہ تک کے دام نہیں بڑھتے ہیں اور وہ فاقہ مستی کے عالم میں ادھر ادھر گھومتے ہیں، تب مجبور ہو کر گورنمنٹ ان کو وطن پہنچانے کا انتظام کرتی ہے اسلئے اصولاً ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں کہ وہی لوگ حج کا قصد کریں جو حیب میں دام بھی رکھتے ہوں،

محمد علی کی مخالفت | محمد علی نے اس قانون کی سخت مخالفت کی، اور اسکے معائب بتلائے، حاجیوں کی ناقابل برداشت دقتوں کا ذکر کیا، اور گورنمنٹ کو مجبور کیا کہ وہ اس قسم کا ایک طرفہ قانون نہ بنائے جس سے صرف حاجیوں کو تکلیف تو پہنچ سکتی ہو، لیکن جو انکی اس تکلیف اور فاقہ مستی کے اسباب ہیں انکا انسداد نہ کیا جائے،

انکا خیال تھا کہ حاجیوں کے افلاس اور عسرت کی اصل علت خود گورنمنٹ کا قافل اور جہاز ان کمپنیوں کا حاجیوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا اور تباہ کرنا ہے،

مضامین | اس موضوع پر محمد علی نے ہمدرد و کمرڈ میں مسلسل اور پیہم مقالات و مضامین کے ذریعہ سے گورنمنٹ کو خبردار کیا، چنانچہ ایک مضمون میں وہ ارشاد فرماتے ہیں،

”ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کے حاجی سب حجاج سے زیادہ نادار ہوتے ہیں، لیکن اسکی ذمہ داری ہندوستان کی حکومت پر ہے، اول تو ہندوستان کے لوگ مفلس ہیں، دوسرے حکومت ان کا خاطر خواہ انتظام نہیں کرتی“

مصر میں حج کا طریقہ | مصر میں حج کا طریقہ یہ ہے، وہاں کی حکومت حجاج کی تعداد تخمیناً معلوم کر لیتی ہے، پھر جہاز ان کمپنیوں سے ٹنڈر طلب کرتی ہے، اس طرح جو جہاز کم کرایہ

برا اور بہترین طریقہ پر لیجانا منظور کریں، ان میں مصر کے حجاج جاتے ہیں،
ہندوستان کی حالت | یہاں یہ حالت ہے کہ ہزاران کمپنیاں جنکے زیادہ تر انگریز مالک
ہیں پہلے کم کرایہ کا اعلان کرتی ہیں، حجاج اعلان سے کچھ زیادہ روپیہ لیکر بنگال اور سندھ
وغیرہ دور دراز مقامات سے بھی آتے ہیں جہاز کی روانگی کا وقت مقرر نہیں ہوتا اس لئے
ان کو عرصہ تک بمبئی میں رہنا پڑتا ہے جہازران کمپنیاں یہ کھ کر کہ حاجیوں کی بھی کافی تعداد
نہیں آئی ہے، ان غریبوں کو انتظار کراتی ہیں اور پھر جب حاجی کافی تعداد میں بہت زیادہ
آ جاتے ہیں اور زیادہ کرایہ دیکر روانہ ہونا چاہتے ہیں تو کمپنیاں جہاز کا کرایہ بڑھا دیتی ہیں،
اس طرح بہت سا روپیہ بمبئی ہی پر خرچ ہو جاتا ہے اور (حجاج) واپسی کے وقت بھکاری اور نادار
بن جاتے ہیں،

اگر گورنمنٹ کو واقعی حجاج کی سہولت مقصود ہے تو اس کا علاج بمبئی میں ہونا چاہئے،
جہاں انکار روپیہ نا واجب طریقہ سے لوٹ لیا جاتا ہے۔“

اسی طرح بہت پر زور دلائل کے ساتھ محمد علی نے اس لغو قانون کی مخالفت کی مگر
(غالباً) نتیجہ کچھ نہیں نکلا، اور وہ قانون حاجیوں کی مشکلات میں اضافہ کرنے کے لئے
اتک موجود ہے اور جب تک گورنمنٹ موجود ہے وہ بھی موجود رہے گا۔

باب ۳۴

مولیہ نچوں کی عیدی

تحریک خلافت کے زمانہ میں اور اس کے بعد مولیہ قوم پرہیز آفات و مصائب کا جو پہاڑ ٹوٹا، اور جس طرح اس بہادر اور شجاع قوم کو صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹانے کی کوشش کی گئی، وہ سب کو معلوم ہے، لیکن بہادر لوگ سخت جان بھی ہوتے ہیں، انکا مٹانا اور برباد کر دینا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا سمجھا جاتا ہے، وہ تلواروں کے زخم اور سنگینوں کے چر کے کھا کر بھی زندہ رہتے ہیں اور اپنی شجاعت کا ثبوت دیتے ہیں، تحریک کے بعد پھر جب ان کا قتل عام شروع ہوا، اور انکی جائیدادیں ضبط کی گئیں، انکی املاک سے انہیں محروم کیا گیا، تو کوئی نہیں تھا، جو انکی دستگیری کرتا، کوئی نہیں تھا جو ان جلاوطن، غریب و لیڈار، لیکن اسلام کے جانباز و سرفروش سپاہیوں کی اعانت کرتا، اور کوشش کرتا کہ ان کے مصائب و آلام میں کچھ تخفیف ہو جائے،

زعماء کا تغافل اجاڑے آتے تھے لوگ نفیس نفیس لحافوں میں آرام کرتے تھے، اور وہ ٹھٹھڑ کر اپنی زندگی کے دن کاٹتے تھے، گرمیاں آتی تھیں، اور لوگ خس پوش کردوں میں، یا پہاڑوں کی بلندیوں پر موسم بہار کا لطف اٹھاتے تھے، مگر وہ غریب اپنے گلخن میں سلگتے تھے، ہریات آتی تھی، لوگ موسم برشکال سے شاعرانہ کیف حاصل کرتے تھے، برآمدوں اور سائبانوں میں تعاطر اور ترشح، کامزا اٹھاتے تھے، لیکن وہ بیچارہ بھیگ بھیگ کر نزلہ اور زکام کو دعوت دیتے تھے، عید آتی تھی، لوگ زرق برق کپڑے پہنتے تھے، اچھے اچھے کھانے

کھاتے تھے، دوست احباب کی دعوت کرتے تھے، سیر و تماشہ سے لطف اندوز ہوتے تھے، میلہ ٹھیلہ کی سیر کرتے تھے، بال بچوں کو طح طح کے کھلونے لاکر دیتے تھے، مگر ایک قوم کی تو ایسی تھی، جہاں عید ماہ محرم کا حکم رکھتی تھی، نہ ستر پوشی کے لئے ان کے پاس کپڑے تھے، نہ گرمی کے علاج و دافع کے لئے ان کے پاس خوشذائقہ اور لذیذ کھانے، خود تو بیچا پے اس موسم ابتلا کو برداشت بھی کر لیتے تھے، لیکن بچے ہلک کر، تڑپ تڑپ کر، ہلک کر، ہلک کر ماں باپ کو مجبور کر دیتے تھے کہ وہ ان کے لئے اچھے کپڑوں کا انتظام کریں، عمدہ کھانے ہیا کریں، میلہ اور تفریح کے لئے کچھ دام دیں، تو ان ماتا کے مائے فاقہ مست لوگوں پر کیا کچھ گزر جاتی ہوگی؟ مگر کون تھا، جو اپنے عیش و آرام کو منہض کر کے ان تباہ حال اور افلاس پیشہ لوگوں پر ایک نظر بھی ڈالتا، مدد کرنا تو خیر بعد کی چیز ہے۔

ایک درد مند دل | لیکن ایک سہی تھی، جو اپنے عیش و آرام کو منہض کر کے ان دکھ کے ماروں پر ترس کھاتی تھی، اس کے سامنے جب کھانا آتا تھا، تو مولہ قوم کے بھوکے بچے یاد آجاتے تھے، اسکے سامنے جب کپڑے آتے تھے، تو مولہ قوم کے برہنہ اور عریاں لوگوں کی تصویر اسکے سامنے پھر جاتی تھی، وہ جب افطار کرنے کا ارادہ کرتا تھا، تو وہ صائم الدہر سے بقیار کر دیتے تھے، جن کی افطاری آشوب چشم، جبکا کھانا غم دل اور جنگی سحری، فغان نیم شب تھی، جب عید کی نشاط افزا فضا میں لوگ مست ہو ہو کر عید گاہ کا رخ کرتے تھے، اور نماز کے بعد جب دھوپ کی تابش، اور گرمی کی شدت سے بیقرار ہو ہو کر جلد سے جلد نکلنا چاہتے تھے، تو ایک ذات تھی، جو عید گاہ کے دروازہ پر، ذیابطیس اور دوسرے امراض کے باوجود، دھوپ کی تابش میں اور لوگوں کی سرد مہری میں بھی چٹان کی طرح عید گاہ کے دروازہ پر شکول گدائی لئے کھڑی ہوتی تھی، عام خاص، جاہل عالم، امیر

غریب ہر شخص کو وہ مخاطب کرتی تھی اور ایک ایک پیسہ، دو پیسہ بڑی خوشی سے لیکر اپنے
چنبیل میں ڈالتی جاتی تھی،

تقابل | نماز پڑھنے، دوسرے لیڈر بھی آتے تھے، لیکن وہ موٹر میں آئے، اور موٹر
میں واپس چلے گئے، ایک فرض تھا، جو اونھوں نے ادا کیا، اور پھر اپنے اپنے ”دولتکدہ“
پر واپس تشریف لے گئے !

لیکن یہ ایسا ”لیڈر“ تھا، جو خود بھی فاقہ مست تھا، اور دوسرے فاقہ مستوں کی بھی فکر
رکھتا تھا، خود بھی تباہ حال تھا، اور دوسرے تباہ حال افراد کا درد بھی اپنے دل میں رکھتا تھا
خود بھی نادار تھا، اور دوسروں کی ناداری پر دل میں رحم و محبت کی ایک خلش بھی محسوس کرتا تھا،
اس طرح کئی گھنٹے، دھوپ میں کھڑے ہو کر اور ہر شخص سے بے تکلفی کے ساتھ
تقاضا کر کے انے اپنے کشلول میں کچھ رقم جمع کر لی، کچھ رمضان کی دعوتوں میں وہ اپنے
میزبانوں اور دوستوں سے وصول کر چکا تھا،

ایک عرصہ کے بعد لو کی لپٹ میں تھکا ماندہ جھلسا اور تپتا یا واپس ہوا، اور گیارہ
کی ایک قسم جب تک ان مصیبت زدہ لوگوں کو نہ بھیج لی چار پائی پر پیٹھی نہیں لگا سکا،

باب ۳۵

خلافت کمیٹی کا غبن

جب محمد علی کی عام مخالفت شروع ہوئی تو ان کے تمام عیوب و نقائص جن کا ذہن کے سوا اجارج میں بہت کم وجود تھا، پبلک میں لائے گئے اور انھیں ایک عیاش، فضول خرچ، سرف اور سب بڑھ کر چندہ کا ہضم کر لینے والا ثابت کیا گیا۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پر لطف بات یہ ہو کہ اس غریب پر یہ الزام بھی عاید کیا گیا کہ خلافت کمیٹی کے مشہور غبن کے ذمہ دار نم ہوا اور کیا عجب کہ تمھارا ہاتھ بھی اس میں کار فرما ہو۔

حقیقت واقعہ | واقعہ کی حقیقت صرف اتنی ہو کہ محمد علی جب جیل میں ایسے تھے اُس وقت یہ

”غبن“ ظاہر ہوا اور یہ بھی واقعہ ہو کہ یہ غبن اتفاقی طور پر ہوا، یعنی بالارادہ نہیں بلکہ ارادہ!

اجال کی تفصیل | اس اجال کی تفصیل یہ ہو کہ چونکہ جمعیت مرکزی خلافت ایک باغی اور قانون شکن

جماعت تھی اس لئے وہ ”رجسٹرڈ باڈی“ نہیں تھی، دوسرے اس وقت کے مصالح کے اعتبار

اسے بھی یہی مناسب معلوم ہوا کہ خلافت کا روپیہ بینک میں نہ رکھا جائے، بیٹھ چھوٹانی صاحب چونکہ

نہایت بہت واستقلال اور نہایت اخلاص و انیسار سے تحریک کے ایک بہت بڑے علمبرار ثابت

ہوئے تھے اس لئے انھیں خلافت کمیٹی کا خزانچی مقرر کر دیا گیا، سائے ملک کو ان پر اعتماد تھا

اس لئے عوام یا خواص کسی میں سے بھی کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا، سب مطمئن رہے۔

غبن | تحریک پورے زور شور سے جاری تھی اور تمام رہنما و حوٹا و حوٹا گرفتار ہو رہے تھے لیکن

جس سرعت سے گرفتاریاں ہو رہی تھیں اسی سرعت سے چندہ بھی وصول ہو رہا تھا تا آنکہ وہ

وقت آیا کہ تمام قابل ذکر افراد و اشخاص جیل میں تھے صرف دو ایک آدمی باہر تھے
سیٹھ چھوٹانی صاحب کو پورا موقعہ حاصل تھا اگر وہ چاہتے تو اس روپیہ کو صحیح مصرف میں خرچ
کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اس روپیہ کو اپنے کاروبار میں لگا دیا اور خلاف توقع اس میں سخت نقصان
اٹھایا اس لئے وہ روپیہ حسب اطلب مجلس خلافت کو ادا نہ کر سکے۔

لیکن انھوں نے اپنے چند کارخانے جو ان کے بیان کے مطابق سترہ اٹھارہ لاکھ کی ملکیت
کے تھے، مجلس خلافت کو بجائے نقد روپیہ کے حوالہ کر دیے۔

نتیجہ | اس سازد سامان کی جب جانچ کی گئی تو وہ مطلوبہ رقم سے بہت کم نکلا لیکن اب ہو گیا
سکتا تھا اسے واپس تو کیا نہیں جاسکتا تھا اور نہ خلافت کمیٹی اپنے مسلک کے اعتبار سے کوئی قانونی
کارروائی کر سکتی تھی اور نہ دران ریسٹریڈ باڈی ”ہونے کی وجہ سے غالباً مقدمہ چل سکتا۔

درگزر | علی برادران جیل ہی میں تھے کہ ان کی اس حرکت کا راز فاش ہو گیا اور جو کچھ ان
مل سکا وہ وصول کر لیا گیا۔

علی برادران اس کے کہاں تک ذمہ دار ہیں اس کے متعلق خود محمد علی کا بیان ملاحظہ
فرمائے۔

محمد علی کا بیان | جب تیسری ستمبر ۱۹۲۱ء میں والیٹر اسٹیشن پر خلاف توقع محمد علی کی گرفتاری وقوع
میں آئی اور بعد کو بھڑوہ کراچی اور یحیٰ پور جیل میں تبدیل ہوتے رہے تو محمد علی کا بیان ہر کہ۔

”میری بیوی نے کہا تم کو ہماری فکر نہ کرنا، خدا پہلے بھی رزاق تھا اور وہی اب بھی
رزاق ہے، ہماری والدہ نے اور میری بیوی نے ہماری دوبرس کی قید میں
تقریباً چالیس پینتالیس لاکھ روپیہ وصول کیا جس کی ایک ایک پائی کا حساب دفتر
خلافت میں آڈٹ کیا ہوا موجود ہے، یہ تو چندہ جمع کرنے کا حال ہے، لیکن خرچ کا حال

وہ بتائیں جو اپنے گھروں میں اپنے اہل و عیال کے پاس سوتے تھے اور ہماری طرح
 قید اور بالخصوص میری طرح خلاف قاعدہ و قانون قید تہائی میں مبتلا تھے یہ سچ
 کتنا روپیہ چھوڑا تھا | ہے کہ ہم نے خلافت کے خزانہ میں فقط تین لاکھ چھوڑے تھے اور ہمارے
 پیچھے ۴۰ یا ۴۵ لاکھ روپیہ ہماری والدہ اور میری اہلیہ اور ہم سے محبت رکھنے
 والے بھائی بہنوں نے جمع کیا تھا لیکن اگر یہ بڑی اور محیر العقول رقم ہم نے جمع
 نہ کی تھی۔

ذمہ دار کون ہے؟ | تو اس کی ایک پائی ہم نے خرچ بھی نہ کی سیٹھ چھوٹانی نے جو کچھ
 کیا اس کے جوابدہ پہلے وہ خود ہیں اور پھر وہ حضرات جو قید و بند سے آزاد رہے
 تھے نہ کہ ہم جنہیں خود اپنے ایک پیسہ پر بھی تصرف کی اجازت نہ تھی اگر ہماری پائی
 پر ہیں خلافت کا خزانہ خالی ملا اور چھوٹانی سیٹھ کے سوا اس کے تمام کارکنوں کی
 پوری دیانت داری اور سخت محنت و کوشش کے باوجود خلافت کی سطح
 بگڑی ہوئی ملی تو اس کی جواب دہی ہم پر نہیں ہے بلکہ سکساران سہل پر ہے
 یہ بصیرت افروز زبان ان لوگوں کے لئے پوری تسلی کا باعث ہو سکتا ہے جو علی برادران
 اور بالخصوص محمد علی پر اس قسم کے مکروہ، ناپاک اور رکیک الزامات لگاتے ہیں۔
 لیکن ونا تو اسی کا ہے کہ قوم کی قدر شناسی گھٹ گئی ہے، اور شاید اسی تناسب قوت
 تنقید میں اضافہ ہو گیا ہے!

باب ۳۶

کتابِ اچال

راجپال کی وہ رسوائی عالم کتاب جب شائع ہوئی جس میں سرکارِ دو عالم پر نہایت کڑی اور ذلیل خیالات کا اظہار کیا گیا تھا، اور حضور کی حیاتِ قدسی پر نہایت ناپاک اور غلط الزامات لگائے گئے تھے تو سارا اسلامی ہند آتش زیرِ پا ہو گیا اور جولائی ۱۹۲۷ء میں اتنا زیادہ ہنگامہ برپا ہوا کہ حد بیان سے خارج ہے، وہ کتاب بھی درحقیقت اس ہنگامہ کی مستحق تھی کہ ساری اسلامی آبادی اس کے مطالعہ کے بعد یا خلاصہ کتاب معلوم ہونے کے بعد آرزوئے شہادت اور تمنائے جہنم سے لبریز ہو گئی۔

زعما اسلام کی حالت | مسلمانوں کو سرورِ عالم سے جو محبت والفت ہے اس سے مسلمانِ نعماء میں سے اکثر کے دل اگرچہ خالی ہوں لیکن جانتے سب ہیں۔

پھر مسلمانوں نے جس جوش و خروش کا مظاہرہ کیا، جلسے کئے، جلوس نکالے، قانون شکنی کی، توہینِ عدالت کی، جسٹس ڈیپ سنگھ کو مستعفی ہو جانے پر مجبور کیا اور گورنمنٹ کے تشدد کا جس طرح مقابلہ کیا وہ منظر بھی قارئینِ ملت سے یہاں نہیں تھا۔

گرفتاریاں ہو رہی تھیں، سزایابیاں ہو رہی تھیں اور مسلمان پروانہ دارا پوتیس قید و بند کے لئے پیش کر رہے تھے مگر مسلمانوں کے یہ ”نقیذ الشرق“ اور ”زعیم ملت“ سب کے سب خاموش تھے۔

ان مسلمان لیڈروں میں جو کانگریسی کہے جاتے ہیں اور جو ”آل انڈیا“ سمجھے جاتے ہیں

ایک تنفس بھی ایسا نہیں تھا جس نے اس ناپاک کتاب کے مصنف کو بیزاری ہی کا اعلان کیا ہو تا اس گندہ کتاب کے متعلق اپنے تاثرات قلب ہی بیان کر دے ہوتے یا کم از کم مسلمانوں کے جوش و خروش کو صحیح راستہ پر لانے کی کوشش ہی کی ہوتی، مگر یہ کچھ نہیں ہوا، یہ حضرات اس طرح خاموش رہے گویا ہندوستان میں کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہوا ہی نہیں۔

ہندو زعماء کی کیفیت | ہندوستان میں جو جماعت ہابھیائی کہلاتی ہے، اس کے متعلق کسی قسم کی امید ہی فضول تھی، ہاں جو طبقہ کانگریسی، وطن پرور اور غیر متعصب کہا جاتا ہو، اسکے متعلق یقیناً امید تھی کہ وہ اس کتاب اور اس کے طابع و تاثر کے خلاف کم از کم ”ملاست“ ہی کا اظہار کر دے گا، مگر یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا، ہابھیائی عنصر نے تو دلیپ سنگھ کے فیصلہ رہائی راجپال پر گھی کے چراغ جلائے، اور کانگریسی عنصر جو تھادہ بالکل خاموش ہو گیا، گویا گاندھی جی کی طرح اس نے بھی ”مون برت“ رکھ چھوڑا ہے۔

گاندھی جی اور موتی لال کی خاموشی | گاندھی جی نے ضرور اس کتاب کی اشاعت کے وقت اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا، لیکن مقدمہ و فیصلہ رہائی راجپال کے بعد وہ بھی خاموش تھے دوسرے زعماء جو تھے وہ بھی ایک حرف نہیں کہنا چاہتے تھے، سو اتفاق سے ایسوسی ایٹ پریس کا نمائندہ پنڈت موتی لال سے ملے گیا اور اس کتاب کے متعلق اس نے ان سے ایک بیان لینا چاہا، انھوں نے فرمایا کہ اس مسئلہ پر میں بیان دینا نہیں چاہتا! یہ سکوت کس لئے تھا؟ | حیرت ہوتی ہو گی کہ یہ سکوت کس لئے تھا؟ لیکن تھوڑے غور و فکر سے یہ حقیقت بھی عیاں ہو جاتی ہے۔

آزاد خیال حضرات اپنی ”رواداری“ کے خلاف سمجھتے تھے کہ اس کتاب کے خلاف اظہار رائے کریں، نیز اس سے ان کی ہردلعزیزی کا آگینہ بھی چور چور ہو رہا تھا، عرض

یہ اسباب تھے جنہوں نے ہر خاموشی لگا رکھی تھی۔

بعض زعماء اس لئے خاموش تھے کہ ان کو یقین تھا کہ یہ ہنگامہ تو ختم ہو ہی جائے گا،
زعماء کانگریس بھی جب خاموش ہیں تو خواہ مخواہ ہندو ہما سبھا سے ٹکڑ لیتا کہاں کی دانشمندی ہو
اس لئے وہ اس اضطراب کا جواب خاموشی سے دے رہے تھے

محمد علی کی رہنمائی | لیکن محمد علی جیسا پل حلیل اس نازک موقع پر خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا، اپنی
ملت اور اپنے مذہب کو وہ ”رواداری“ کے نذر کرنا نہیں چاہتا تھا، اسے ہنگاموں والوں
کی خوشنودی کا تمغہ لینا تھا، نہ ہما سبھا والوں کی رضا جوئی اس کا مقصود حیات تھی، اس کا فخر
ایک کام تھا اور وہ اپنے خالق اور اپنے مبعوث کی رضا جوئی تھی اور بس۔

اس لئے ان مصالح میں سے کوئی مصلحت بھی اس کی غمان گیر نہیں ہوئی، نہ اس
نے ان تعلقات کی زنجیروں کو اتار کر انبار بنالیا تھا کہ وہ ٹوٹ نہ سکیں، اس نے جب اس ہنگامہ
کو دیکھا نفس کتاب کے مضامین سے واقفیت حاصل کی تو اس عاشق رسول اور شیدائے اسلام
کی رگ حریت جوش میں آئی اور وہ دیوانہ وار میدان عمل میں کود پڑا !

نظریہ | کانگریس اور ہما سبھا یہاں تک کہ خود اپنے زقاسے بے نیاز ہو کر جب میدان
عمل میں اترے تو کوئی اس کی پیشوائی کے لئے موجود نہیں تھا سب اس کی مخالفت پر آمادہ تھے
اس لئے کہ وہ ”جمہور“ کے نظریہ کا قائل نہیں تھا بلکہ مخالفت تھا۔

”پبلک“ کہتی تھی، ولیپ شکہ مستغنی ہو جاؤ ”پبلک کا قائد“ کہتا تھا قانون بدلو اور قصود
قانونی کا نہیں ہو، قانون کا ہے۔“

جو لوگ ”نفیات اجتماعیات“ سے واقف ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ عقیدہ عالم کی مخالفت
کرنا اور وہ بھی علی الاعلان کس قدر مصائب اور شدا ید کا پیش خیمہ ہوتا ہے، محمد علی اس حقیقت

سے نا آشنا نہیں تھے وہ اس مخالفت اور اس کے نتائج سے پورے طور سے باخبر تھے اور مقابلے کے لئے تیار۔

پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصے میں ”توہین عدالت“ کے الزام میں گرفتار یا شروع ہو چکی تھیں اور سارے ہندوستان میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ گئی تھی اس حالت میں عقیدہ عالم کی مخالفت کرنا محمد علی ہی کا کام تھا۔

اثرات | جس وقت لوگوں نے یہ معلوم کیا کہ محمد علی اس نازک موقع پر اپنی رہنمائی سے قوم کی ہدایت کریں گے تو سب خوش ہوئے تھے لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ وہ رہنمائی تو کریں گے لیکن جمہور کے نظریے سے اتفاق نہیں کریں گے تو سب کے دل رنج و افسوس سے لرزے ہو گئے اہل پنجاب نے انکی مخالفت میں حصہ لیا اور محمد علی کو ان کے عقائد سے پھیر دینا چاہا، لیکن وہ ایک کوہ استقامت تھا جمہور سے وہ رہنمائی کا متمنی نہیں تھا نہ جمہور کی حمایت کے بل پر اس کی قیادت قائم تھی، بلکہ وہ زعیم تھا اور یہ اس کا کام تھا کہ لوگوں کے خیالات کا رخ بدل دے۔

ایک دلچسپ خط | اسی زمانہ میں محمد علی کے ایک دیرینہ دوست، قوم کے مخلص خد متگذار اور انبالہ کے مشہور شاعر اور وکیل نے محمد علی کو ایک نہایت تند و تیز خط لکھا جس میں محمد علی کی روش سے اپنی سخت بیزاری کا اظہار کیا اس مکتوب کا ایک حصہ یہ ہے :-

تھو کے واسطے اب مقدمہ اچال کی بحث کو اور ہر ایسے مضمون کو جو اس بحث سے لفظاً یا معنیاً ظاہراً یا باطناً، صراحتاً یا اشارتاً یا کنایتاً، بالواسطہ یا بلا واسطہ، کوئی تعلق قریب یا بعید، حقیقی یا فرضی، واقعی یا وہمی، اصل یا مصنوعی رکھتا ہو تب اور قطعاً بند کر دیجئے، آپ کے تمام راسخ العقیدت نیاز مند پڑھتے پڑھتے اور سنتے سنتے تھک گئے کہ سٹر دلیپ سنگھ نے بددیانتی نہیں کی۔“

جواب لا جواب | محمد علی نے اپنے ان عزیز دوست کو جو اس وقت جذبہ اسلام سے بیابان ہو کر اس قدر برہم تھے، ایک نہایت دلچسپ جواب دیا اور اپنی پوزیشن صاف کی، جواب کے اہم اجزاء یہ ہیں۔

”آپ سر محمد شفیع کا واسطہ دیتے، کا واسطہ دیتے، ”رواہ البخاری“ کا واسطہ دیتے، ”ڈاکٹر سر علامہ کا واسطہ دیتے، تو میں ہر ایسے مضمون کو جو توہین رسول اکرم کے اندر کی تدابیر سے لفظاً یا معنیاً ظاہراً یا باطناً، صراحتاً یا اشارۃً یا کنایتاً، بلا واسطہ یا بالواسطہ، قریبی یا بعیدی، حقیقی یا فرضی، واقعی یا دہمی، اصل یا مصنوعی، پنجابی یا دہلی، تعاونی یا عدم تعاونی، ہندو یا سبھائی یا مسلم لیگی، شہسوی یا بلیسی، سنگھنی یا ٹھٹھیسی، سولاجی یا جواجی، تعاونی، منفی یا مثبت، انڈیا یا یورپی، مشرقی یا مغربی، حامی یا سامی غرض کسی قسم نوع، بھارت وضع طریقہ، انداز کا تعلق رکھتا اس کو بند اور قطعاً بند“ کر دیتا۔

پنجاب کے لیڈر، غریب پنجابی مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں اور آپ خدا کا واسطہ دیتے ہیں کہ ”ان کو گمراہ کرنے دو“

یہ خط تو خیر ایک مخلص دوست کی طرف سے تھا لیکن اس کے علاوہ اور نہایت غیر مذہب خطوط جو گالیوں سے لبریز تھے، وہ آئے اور انھیں ”در جمع“ کرنے پر مجبور کیا گیا، مگر کسی مخالفت کسی ہنگامہ کسی دل آزار حرکت سے محمد علی کو جنبش نہیں ہوئی!

سرگرمیاں | محمد علی کا نظریہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ جیس ڈیپ سنگھ کو بے تصور سمجھتے تھے البتہ تعزیرات ہند کو تصور وار سمجھتے تھے کہ اس میں ایک صاف، واضح اور غیر مشتبہ دفعہ ”افسادِ دھرم“ انبیاء و زکات دین کے لئے کیوں نہیں جب کہ توہینِ عدالت اور توہینِ ملک معظم کے لئے ہر طرح

کی قانونی آسانیاں موجود ہیں؟ اسی مقصد کی خاطر انھوں نے سائے ہندوستان کا بالعموم اور پنجاب کا بالخصوص دورہ کیا، اور اپنا نقطہ نظر سمجھا سمجھا کر لوگوں کو راہ راست پر لائے اور ان کے مسائل کو ایک سیدھے راستہ پر ڈال دیا۔

لکھنؤ کا ایک جلسہ | جولائی ۱۸۵۷ء کے زمانہ شورش میں بہ مقام لکھنؤ ایک نہایت عظیم الشان جلسہ ہوا، مسلمانوں کی اتنی زبردست تعداد ورفاء عام کے میدان میں شکل ہی سے کبھی نظر آئی ہوگی۔ محمد علی کو خاص طور سے اس جلسہ کی صدارت کے لئے مدعو کیا گیا تھا، جلسہ میں ہمارا جہ محمود آباد اٹھا کر نواب علی اور دوسرے تعلقداران اودھ، دکھن، بیرسٹر، مغزین، غرض ہر طبقہ ہر نوع، ہر بھانت کے لوگ موجود تھے۔

محمد علی نے اپنی صدارتی تقریر کی جس کا حاضرین پر بہت اچھا اثر ہوا، مغرب کی ناز کے بعد پھر نشست ہوئی اور اب دوسرے مقررین کو تقریر کا موقع ملا اور تجویز کی تائید ہونے لگی۔
مولانا ظفر الملک کی تقریر | اتنے میں حاضرین میں سے بعض حضرات کے پیہم اصرار سے مولانا ظفر الملک نے ایک نہایت پر جوش تقریر کی، اتنی دلولہ انگیز کہ اس وقت تک جلسہ میں ایسی کوئی تقریر نہیں ہوئی تھی، محمد علی اپنی صدارتی تقریر میں غیر ضروری جوش اٹھانے کے لوگوں کو ہموار کر چکے تھے کہ مولانا کی اس تقریر نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا، اللہ اکبر کے فلک فرسانے اور بیتاب ہو ہو کر بار بار مجمع میں تلاطم، کسی خطرناک جوش کا اظہار کر رہا تھا۔

محمد علی کا تدبیر | لیکن یہ محمد علی کا تدبیر تھا کہ انھوں نے آدمیوں کے اس سمندر کے اتنے بڑے طوفان کو اپنے قابو میں رکھا اور پھر ایک نہایت پر جوش تقریر کی اور اس سلسلہ میں اپنی جان تک قربان کر دینے کا عہد کیا تب جا کے مجمع ذرا ٹھنڈا ہوا، اور مولانا ظفر الملک نے بھی اعلان فرما دیا کہ وہ محمد علی کی اس تقریر کے بعد اب پورے طور سے مطمئن ہیں۔

یہاں سے واپس جا کر محمد علی نے اپنی پوری قوت ایک قانون کے بنانے اور اسے پاس کرانے میں صرف کر دی، اچھا ہوا، اگر وہ قانون بھی ایک نفعہ نظر سے گزر جائے، جو محمد علی نے خود تیار کیا تھا، اور اسمبلی میں پیش کر دیا، حالانکہ وہ نہ وکیل تھے، نہ بیرسٹر، اور پنجاب کے ایک بیرسٹر کے قول کے مطابق ”محض عطائی“ بہر حال قانون یہ ہو۔

قانون | مسودہ دفعہ ۲۰۷ الف تعزیرات ہند جو فوراً نافذ ہونا چاہئے۔
 ”جو کوئی شخص“ ”کسی کا دل دکھانے یا“ ”کسی شخص کے مذہب کی توہین کرنے کی نیت سے یا“ ”اس امر کے احتمال کے علم سے کہ اس کے ذریعے کسی شخص کا دل دکھے گا یا“ ”کسی شخص کے مذہب کی توہین ہوگی۔“
 ”ایسی باتوں کے ذریعے جو مطلقاً سے ادا کی جائیں، یا لکھی جائیں، یا اشاروں کے ذریعے یا نقوش مرتبہ کے ذریعے یا اور طرح سے“
 ”کسی نبی، یا دلی یا اور شخص کی جے لوگوں کا کوئی فرقہ اسی طرح مقدس سمجھا ہو“
 ”توہین کرے یا“ ”اس کی نسبت ایسا اتہام لگائے یا شتہ کرے، جس سے اور لوگوں میں اس کی ملکات کی خفت ہو“ ”تو اس کو دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی قید کی سزا دی جائے گی جس کی میعاد تین برس تک ہو سکتی ہو یا جرمانہ کی سزا یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔“
تشریح | ”ایسے شخص کی سیرۃ اور ملکات کی سنجیدہ تنقید اور وہ مکتہ چینیاں جن سے اس کی آرا یا افعال کی ناپسندیدگی کا اظہار ہو“

”اگر وہ شخص ایسی تنقید یا مکتہ چینیاں کرے یا انھیں شتہ کرے، ثابت کرے کہ اس نے یہ کام بغیر اس نیت یا علم کے کیا تھا جس کا بیان اس دفعہ میں کیا گیا ہے“

”بلکہ نیک نیتی سے کیا ہے“ اور اس ایمانداری کی نظر سے ”کہ تاہنجی یا

مذہبی حقیقت متیقن ہو سکے“ ”حسب نشتائے دفعہ ہذا جرم نہیں“

یہ عہدہ قانون جے محمد علی نے تغزیرات ہند کی ورق گردانی کے بعد تیار کیا تھا اور کمال یہ کیا تھا کہ مختلف دفعات سے الفاظ، فقرے، جملے لے کر اس قانون کو باطل مکمل کر دیا، اگر اپنی طرف سے بنایا جاتا تو احتمال تھا کہ جدید ہونے کی وجہ سے غور و فکر اور اصلاح و تغیر میں ایک عرصہ دراز لگ جاتا، مگر انھوں نے تغزیرات ہند کے مختلف دفعات کو سامنے رکھ کر حسب نشتا ایک قانون کا مسودہ تیار کر لیا جس کی ہر طرف سے خوب داد ملی اور بے انتہا تعریف کی گئی۔

اسمبلی میں | اسمبلی میں یہ قانون نواب سر ذوالفقار علی خاں نے پیش کیا، اور شکر ہے کہ وہاں اس کی پورے طور سے تائید کی گئی اور تائید کرنے والے لوگوں میں ہندو بھی کافی تھے، مگر انہوں نے کہ یہ قانون بعینہ اس صورت میں پاس نہ ہو سکا اور اس میں جو ترمیمات کی گئیں، انھوں نے اس کے اثر کو کہیں محدود و کمزور کر دیا پھر بھی کسی نہ کسی حد تک تو موثر رہی ہے۔

خصوصیت مینرہ | اس ہنگامہ کے متعلق ضروری اور اہم مواد پیش کر دیا گیا، کچھ اس سے قبل دوسرے عنوانات کے سلسلہ میں گزر چکا ہے، اب غور کیا جاسکتا ہے کہ محمد علی نے اپنی قیادت کے جوہر کو کس طرح جلادی جس بات کو حق سمجھ لیا اس کے لئے تن من و جن سب کچھ قربان کر دیا۔ اس سلسلہ میں محمد علی کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن انھوں نے نہایت اطمینان سے ان تمام باتوں کا مقابلہ کیا اور اپنے خیالات و عقائد کی تبلیغ جاری رکھی اور چونکہ وہ نیک نیتی خلوص اور لہجہ پرہیزی تھی اس لئے آخر میں پوری کامیابی محمد علی ہی کو ہوئی اور شروع میں جو بڑھ بڑھ کے مخالفت کر رہے تھے، سب ختم کر رہے تھے، دست و گریبان ہونے کے لئے تیار تھے وہی اب شریک کار تھے، دلیپ سنگھ کو مستغنی کرانے کے بجائے قانون کو بدلوانے کی فکر میں تھے۔

یہ ہوتی ہے اصل قیادت اور کمال پہنائی جس کا سودا ہر سر میں ہوتا ہے، لیکن اہلیت
بہت کم ہیں؛

یہ اُس کی دین ہے بے پروردگار دے!

باب ۳۷

آل پارٹیز کا نفرنس

”ٹاپ کانفرنس“ کی سرگزشت بیان ہو چکی ہے کہ کس طرح ”سبکداریاں“ نے قوم کی اس کشتی کو غرق ہوتے دیکھا مگر خاموش ہو رہے!

یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ محمد علی نے اپنی حالات، اپنی خانگی پریشانیوں اور ہندو مسلمانوں کے حوصلہ شکن طرز عمل کے باوجود، پے در پے اس کی کوشش کی کہ کوئی صورت ایسی نکل آئے جس سے ہندو مسلمان دونوں متفق ہو جائیں اور اختلاف و افتراق سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی غلامی میں جو غیر محدود اضافہ ہو رہا ہے، اسے کم کیا جائے اور جلد سے جلد پھر کوس ریل بکے اور یہ قافلہ، اپنی منزل مقصود کی طرف کوچ کر سکے،

یہ بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اس قسم کی کانفرنسیں برخاست کبھی نہیں ہوئیں بلکہ ”ملتوی“ ہوئیں اور مناسب موقعے اور وقت کا انتظار کیا گیا کہ جب حالات سازگار ہوں گے تو پھر یہ کوششیں کی جائیں گی اور کامیاب ہونے کی سعی کی جائے گی!

شملہ یوٹی کانفرنس جب ملتوی ہوئی تو اس وقت ہندو مسلمان لیڈروں کی اور بالخصوص ہندو زعماء کی ذہنیت قطعاً صلح جو یا نہ نہیں تھی بلکہ مجادلانہ تھی، انہیں حضرات کی بدولت بغیر کسی نتیجے پہنچے ہوئے وہ کانفرنس مجبوراً ملتوی کی گئی

محمد علی کی نگاہوں پر رادم | لیکن محمد علی کی کوششیں ختم نہیں ہوئیں اور وہ برابر ہندو مسلمان زعماء سے تقاضا کرتے رہے کہ جلد سے جلد کوئی صورت ایسی نکلنی چاہئے کہ جس پر اتفاق ہو سکے

ورنہ دفتری اقتدار بڑھتا جائے گا اور ہندوستانیوں کی قوت عمل اور جذبہ آزادی میں انحطاط ہوتا جائے گا۔

آل پارٹیز کانفرنس | سیمینار میں آل پارٹیز کانفرنس کے نام سے پھر کوششیں شروع ہوئیں اور تمام قابل ذکر انجمنوں کے نمائندوں کو دعوت شرکت دی گئی، اور چاہا گیا کہ مختلف فیہ مسائل پر کوئی ایسا درمیانی راستہ نکالا جائے جس کے بعد پھر کسی کو یا اسے اختلاف نہ رہے اور یہ صلیح و محبت کی اسپرٹ میں ہونا چاہئے، اصولی اور آئینی طور سے نہیں یہ سمجھ کر ٹینا چاہئے کہ ہم اپنے گھر کے چند اہم مسائل پر غور و فکر کے لئے مجتمع ہوئے ہیں اور اس وقت تک نہیں اٹھیں گے جب تک اس قضیہ نامرضیہ کا تصفیہ نہ کر لیں۔

پہلے اجلاس | ابتدائی جلسوں میں تو ہندو مسلم زعماء کی کافی تعداد شریک ہوئی اور جب تفریح و تبادلہ آب و ہوا، اور تنقید و مانع کا مقصد پورا ہو گیا تو اب پھر گھر جانی کی کوششیں شروع ہوئی، کوئی روٹھ کر واپس گیا، کوئی اپنی انجمن کی رائے حاصل کر کے آنے کا وعدہ کر گیا، کسی نے شرکت سے ”معذوری“ ظاہر کی، کوئی اپنی انجمن کی ”ہدایات“ سے مجبور نظر آیا اور کسی کے گھر سے کسی کی علالت کا تاثر آ گیا، اس طرح رفتہ رفتہ تمام ہندو جماعتوں کے نمائندے رخصت ہو گئے، مسلمان جماعتوں میں سے بھی مسلم لیگ کا رویہ اسی قسم کا رہا، انھوں نے بھی غصہ کا جواب غصہ سے دیا، تعصب کا جواب تعصب دیا، بہر حال پوری ”جوانی کا رروائی“ جاری رکھی، لیکن ایک خلافت کمیٹی اور ایک محمد علی یہ دو چیزیں ایسی تھیں جو آل پارٹیز کانفرنس میں جمی رہیں اور جنھوں نے اپنے اشتراک عمل اور خلوص نیت کا پورا پورا ثبوت دیا۔

محمد علی پرچہ | آل پارٹیز کانفرنس کے اکثر حصے دہلی میں ڈاکٹر انصاری صاحب کے دولتکدہ پر منعقد ہوتے تھے، وہاں ایک بار کانگریس کے ایک ممبر نے چوٹ کی کہ بعض ایسے کانگریس کے

ممبر بھی ہیں جو یہاں تو ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو جائے، کوئی ایسا دستور وضع ہو جائے جس میں سب لوگ متفق ہو سکیں اور پھر جب وہ جامع مسجد یا مندر میں جاتے ہیں تو وہی سب سے زیادہ ہندو مسلم اتحاد کے خلاف کوششیں کرتے ہیں اور اپنی جماعت کو دوسری جماعت کے خلاف بھڑکاتے ہیں، ظاہر ہے یہ حملہ محمد علی ہی پر تھا، کانگریس کے اکثر ممبر مندر کی طرف رخ بھی نہیں کرتے، کوئی مسلمان لیڈر شاید ہی کبھی جامع مسجد میں جاتا ہو تو جاتا ہو، ایک محمد علی تھے جو داعی صلح و امن بھی تھے اور اپنے مذہب کے پرستار بھی وہی وہاں تقریریں بھی کرتے تھے اور یہاں صلح کی کوششیں بھی۔

محمد علی کا جواب | محمد علی کو یہ حملہ ناگوار ہوا، اور انھوں نے وہیں جلسہ میں ان صاحب کو ایک ڈانٹ بتائی اور اس پر بھی ایک مختصر سا اشارہ کیا کہ صلح و امن کی کوششوں کا حقیقتہ کون دشمن ہے اور کس کی طرف سے "التوا" کی تحریک موقع بے موقع ہوا کرتی ہے!

طرز عمل | بہر حال اس قسم کے دل شکن اور جوصلہ فرسا واقعات کے بعد بھی محمد علی کی روش میں کوئی تغیر نہیں ہوا، وہ برابر آل پارٹیز کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے اور مسلمانوں کا نقطہ نظر پیش کرتے رہے، اپنی ان مساعی سے انھیں اس درجہ شغف تھا کہ سخت علالت اور مرض کی حالت میں بھی طبی مشیر کے مشورہ کے خلاف وہ جلسوں میں شریک ہوئے ہیں اور ان پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی کی۔

گانڈھی جی | یہ یاد رکھنا چاہئے کہ گانڈھی جی اب تک اپنے آشرم میں معتکف ہیں، اور انھوں نے سوائی نیٹھی کانفرنس دہلی کے نہ شملہ میں اور نہ پھر دہلی کی آل پارٹیز کانفرنسوں میں باوجود وہیم اور مسلسل التباؤں کے شرکت کی، اس وقت ان پر یاس و قنوط کے جذبات طاری تھے اور وہ اس قسم کی کوششوں کو لا حاصل اور بے نتیجہ خیال فرماتے تھے

لیکن چند شوریدہ سرسلمان تھے جنہیں نہ اعتکاف میں لطف آتا تھا، نہ بابوسی سے اپنے دل کو تسکین دے سکتے تھے، ان کے دل آرزوؤں اور تمناؤں سے بھر پور تھے اور ان کی کوششیں فلاح قوم کے لئے صرف ہو رہی تھیں۔

پھر التوا | لیکن محمد علی کی اس انتھک کوشش کے باوجود، اور خلافت کے اس قابل و اور اشتراک عمل کے باوجود یہ آل پارٹیز کانفرنس پھر ملتوی ہوئی اور طے پایا کہ چونکہ ”یہ وقت مناسب اور موزوں نہیں ہے، اس لئے ایک باپھر التوا“

یہ بھی طے ہوا کہ مئی سلسلہ کی (غالباً، آخری تاریخوں میں یہ پھر بمبئی میں منعقد کیجائے اور وہاں کوئی فرقہ دارانہ حل تلاش کیا جائے، اس لئے کہ دہلی اور شملہ میں تو چرچہ رخِ زیبا لیکر لاکھ لاکھ اس عرصہ تنا کی جستجو کی گئی، مگر ایسا من اتفاق کبھی بھی پیش نہیں آیا کہ مقصد میں کامیابی ہوئی ہوتی۔ فی اللہ سب۔

اس التوا کے حالات دوسرے موقعہ پر آئیں گے!

باب ۳۸

چودہ نکات!

جب محمد علی کوشش کرتے کرتے تھک گئے مگر مفاہمت اور سمجھوتہ کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو مجبوراً انھوں نے یہ چاہا کہ ہم مسلمان چند باتوں پر متفق ہو جائیں اور اس کے بعد انھیں کانگریس سے منوانے کی کوشش کریں، کانگریس اگر منظور کرے تو پھر ہم مطمئن ہو کر اپنا کام جاری رکھ سکیں گے۔ اس لئے کہ ان کا یہ عقیدہ تھا، اور واقعہ بھی یہی تھا کہ اگر مسلمان اور کانگریس متفق ہو کر میدان عمل میں اتر آئیں، اور کانگریس ہمارے ساتھ بیٹھ جائے، مسلمان تبلیغی جماعتوں کی پروا نہ کریں تو بھی یقیناً ملک کا قابل اعتماد حصہ ہمارے ساتھ ہو گا اور گورنمنٹ بھی ہمارے متفقہ آواز کا اثر قبول کرے پر مجبور ہوگی۔

دہلی پریوزل | چنانچہ دہلی میں انبلی کے اجلاس سے فائدہ اٹھا کر محمد علی نے کوششیں صرف کرنی شروع کیں، خود شریک ہوئے، مٹرجناح کو شریک کیا اور دوسرے بااثر حضرات کو دعوت دی اور مفتوں کی مسلسل نشست کے بعد بالآخر چودہ نکات ایسے منظور ہوئے، جن پر مسلمانوں کی رائے عامہ نے اتفاق کر لیا، اور یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمان جو مخلوط انتخاب کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے، اس پر بھی راضی ہو گئے، گو چند شرائط کے ساتھ اور وہ سب شرائط ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ تھے کہ سب سے مل کر ایک تجویز کی صورت اختیار کی تھی۔

خلاصہ | یہ چودہ اصول کیاتھے، انھیں مختصر ایوں سمجھئے کہ اکثریت کو کسی جگہ اقلیت میں تبدیل نہ کیا جائے، پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت حقیقی نہیں ہے بلکہ ”عدوی“ ہے اس لئے ان

دونوں صوبوں میں ان کی نشستیں محفوظ رکھی جائیں، پنجاب و بنگال میں ان کی اکثریت کو نقصان نہ پہنچایا جائے، دوسرے صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں انہیں عایتیں دی جائیں، جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے وہ ہندو اقلیت کو اسی طرح کی مراعات سے مستفید کریں گے ہرگز یہ یحیٰ چتر میں ان کی ۳۳ فیصدی نمائندگی ہو، اکثریت کو برسر رکھے گا مطالبہ اس لئے تھا کہ توازن قائم رہے۔

اس کے علاوہ صوبہ سرحد کو سادی اصلاحات دے جائیں اور صوبہ سندھ کو ایک مستقل اور جداگانہ صوبہ تسلیم کر لیا جائے، بلوچستان کو الگ صوبہ بنا دیا جائے!

محمد علی کی کوششیں | محمد علی نے دہلی تجاویز کو مقبول عام بنانے میں جدوجہد کی اتہا کر دی

کانگریس کی تصدیق | محمد علی نے اسے کانگریس سے منظور کرایا، اور کانگریس نے اسے منظور کر لیا

پھر کلکتہ کانگریس نے ان تجویزوں کو منظور کیا، اس کے بعد محمد علی نے ہندو ہما سجا کے حضرات کو اس نقطہ نظر پر لانے کی اور اپنا ہمنوا کرنے کی کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے، اس جدوجہد کی داستان انہیں کی زبان سے سنئے۔

محمد علی کا اظہار خیال | ایک موقع پر وہ اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”اگر برادران ہندو اور حکومت اس پر راضی ہوں کہ پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور اس اکثریت پر ہندو اقلیت قانع اور مطمئن ہو کر رہنے کو آمادہ ہو، تیار ہو تو مسلمان بھی اس پر راضی ہیں کہ نو صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہو، اس اکثریت کے انصاف اور رواداری پر مسلم اقلیت بھی قانع اور مطمئن ہو کر رہنے کو آمادہ اور تیار ہے۔“

الحمد للہ کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اسے گزشتہ مئی میں قبول کر لیا، جس میں ڈاکٹر

مونجے اور مسٹر کیلکر بھی شریک تھے بالآخر جیکر نے بہت کچھ گفت و شنید اور لفظی بحث کر کے دہلی کی تجویز کو قبول ہی کر لیا، ڈاکٹر مونجے نے فرمایا کہ میں ہندو تھا میں صوبہ سرحد کو اصلاحات دے جانے کے خلاف رائے دے جانے کے خلاف رائے دے چکا ہوں اس لئے صرف اس مد کے خلاف ہوں باقی ہر شے قبول ہے، ہندو کے بعض متعصب ہندو ہندوستان ان کے سابق ایڈیٹر جے رام داس و دولت رام کی سرکردگی میں کانگریس کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہے تھے۔

ہندوؤں کی مخالفت | کانگریس کی تصدیق و توثیق کے باوجود ہندو بڑی شدت سے ان اصول کی مخالفت کر رہے تھے، ان پر یہ بہت گراں تھا کہ سندھ ایک آزاد صوبہ قرار دیا جائے سرحد کو دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات مل جائیں، پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور مرکزی لیجلیس میں مسلمانوں کی ۳۳ فیصدی نمائندگی ہو۔
علی گڑھ کا ایک جلسہ | علی گڑھ پرنسپل کانگریس کے جلسہ کے حالات ایک دوسرے عنوان کے ماتحت گزر چکے ہیں، اور اس کی کارگزاریاں اور مسلم آزاریاں اور ہندو نوازیاں بھی آپ کے سامنے آچکی ہیں۔

کانگریس کے جلسہ میں محمد علی نے منظر دیکھ کر بہت متاثر ہوئے، مسٹر شعیب قریشی اور ڈاکٹر انصاری بھی حدود درجہ ملول و غمگین تھے کہ کانگریس کے جلسہ کی ذہنیت اس قدر خراب ہو رہی تھی کہ اس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے طے شدہ اور پاس شدہ چودہ اصول جو مسٹر جناح نے مرتب کئے تھے منظور نہیں ہو سکتے تھے اور طرح طرح کی مخالفت ہو رہی تھی۔
محمد علی کی تقریر | بہت زیادہ اصرار و التجا کے بعد محمد علی اس جلسہ میں شریک ہوئے تھے، ورنہ

اس دلدور کیفیت کو دیکھ کر نہ شریک ہونے کا انھوں نے عہد مسم کر لیا تھا۔

تقریر انھوں نے انھیں چودہ اصول پر کی، اور ثابت کرنا چاہا کہ اس معاملہ میں تم لوگوں کی مخالفت ہندوستان اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنی ہے، تمھاری رواداری عہدیم نظیر ہونی چاہئے تھی، نہ کہ تمھاری تنگ دلی کا چرچا ہو؛ بہر حال انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا۔

”حقیقت یہ مچلے اور رضامتیں جو آج ہم ایک دوسرے کو ملے ہوئے ہیں وہ مچلے اور رضامتیں

نہیں ہیں جو ہمارے اجنبی حکمران ہم کو مجرم سمجھ کر ہم سے طلب کیا کرتے ہیں، بلکہ یہ وہی

مچلے اور رضامتیں ہیں جن کی طرف ہر سچے مذہب کے اس سہرے قاعدے اشارہ کیا کہ

کہ دوسروں کے ساتھ وہی کرو جو تم چاہتے ہو کہ دوسرے تمھارے ساتھ کریں“

مالوی جی کی تائید | پھر جب صدر اس کانگریس میں ان اصولوں کی توفیق اور تصدیق ہوئی اور

مالوی جی نے بھی تائید کے بعد ایک موثر اور دل نشیں تقریر کی تو فوراً تھر سے محمد علی نے مالوی

جی کے قدم لے لئے، اور کہہ دیا کہ تم اگر ایسے ہی ثابت ہوئے جیسا کہ ہے ہو تو ہم تمھیں اقلیتوں

کا امین بناتے ہیں۔

پھر بھی مخالفت | لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہندوؤں کی مخالفت میں کسی طرح کمی نہ ہوئی

اور وہ برابر اختلاف کرتے رہے کہ مسلمانوں کو صوبہ سرحد میں مساوی حقوق نہ ملیں، سندھ کو آزاد

صوبہ نہ بنایا جائے اور مرکزی مجلس قانون ساز میں انھیں ۲۴ فیصدی نیابت نہ حاصل ہو۔

محمد علی نے ان مخالفتوں کا بھی مقابلہ کیا اور اپنی ساری قوت تقریر، اور سارا زور مسلم

دلائل و براہین کے ساتھ صرف کر دیا کہ براہِ امان وطن بھی کسی طرح اس حقیقت کو سمجھ جائیں اور اختلاف

ختم کر دیں مگر ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

دلائل | ایک مضمون میں اسی موضوع پر اظہارِ خیالات کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”آج تک ہندوستان میں اکثریت کی حکومت نہیں ہوئی، نہ شوکا کے وقت میں نہ
بکر مجیت کے عہد میں، نہ محمود غزنوی کے زمانہ میں نہ غوری کے دور میں نہ پٹھانی
راج کی سلطنت اکثریت کی تھی نہ اکیڑ کی نہ اورنگ زیب کی، نہ سیوا جی کی نہ نجیت
نگلہ کی نہ آج لارڈ دارون کی ہے۔“

آج پہلی بار وہ دستور اساسی بن رہا ہے جس پر نہ سرٹیفکیشن کا کسی کو اختیار ہوگا
نہ ووٹوں کا، بلکہ ہر فیصلہ اکثریت ہی کے مطابق ہوگا، پھر اس بدعت حسد کی ابتدا
وقت اگر ایک جاتی جسے برطانوی ہند میں بھی ۲۲ فیصدی اکثریت حاصل ہے، اس
دستور اساسی پر پوری پوری طرح مطمئن ہو لیکن ایک اور ملت جو باوجود اس سے
بھی حقیر تر اقلیت کے ہندوستان پر صدیوں تک حکومت کر چکی ہو اور وہ فیصلہ
کی اقلیت میں ہو اس پر پوری طرح مطمئن نہ ہو تو تعجب کی کوئی بات ہے؟
ایک اور مضمون | اس کے علاوہ ایک دوسرے موقع پر وہ فرماتے ہیں۔ گویہ یاد رہے کہ اس
زبان میں وہ بچے کا لنگر سی ہیں لیکن زبان سے کلمہ حق بلا کسی موعوبیت کے نکلتا ہی ہے۔
فرماتے ہیں۔

”یقیناً ہندو جاتی سارے عالم میں اپنی تنگ نظری میں نمایاں ہے، دنیا بھر میں کسی
ملت نے خود اس تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا ہے کہ خود اپنے ہی فرقوں کو اچھوت
سمجھا ہو کہ صدیوں سے سب ہندو نہ ایک دوسرے کو بیٹھے سٹے سکتے ہیں نہ ایک
دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھا سکتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ سب ہندو ایک مندر
تک میں کجا نہیں ہو سکتے نہ سب جگہ سب کے لئے عام سڑکیں ہی کھلی ہوئی ہیں جو
جاتی اس درجہ خود غرضی کی شکار ہو، اس پر دوسری ملتیں کس طرح اعتماد کرتی

ہیں؟ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب، اس قدر فرقہ بندی کا سبب نہیں بنے

جس قدر کہ ہندو کی فرقہ بندی خود اس کا سبب بنی ہے

مسلمانوں کو انہماق تقسیم | یہ تو بھی ہندوؤں سے ان کی معرکہ آرائی لیکن مسلمانوں سے بھی انہیں کم مقابلے نہیں کرنا پڑے، یہ انہیں کا دم تھا جس نے ہر ہر مقام پر جا کر ان تجویزوں کو منظور کر لیا اور مسلمانوں کو راضی کیا کہ وہ ان تجاویز کی حمایت کریں۔

مسلم لیگ | مسلم لیگ سے اگرچہ وہ اس وقت بنی رہتے لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اس میں بھی شریک ہوئے اور منوایا، میرٹھ میں جب مسلم لیگ پراڈنشل کالج صاحب سلیم پور کی صدارت میں منعقد ہوا تو محمد علی اس میں بھی پہنچے، اگرچہ وہ اس کے ممبر بھی نہیں تھے، مگر وہیں ممبر ہوئے اور اس کے بعد باقاعدہ اس کے مباحثوں میں حصہ لیا اور بالآخر وہاں سے بھی ہر تصدیق گواہی لی اور کامیاب ہی واپس آئے!

ایک لمحہ فکر یہ | محمد علی نے چودہ اصول کی تجویز میں تائید میں، تحریک میں حصہ لیا وہ معلوم ہو چکا، یہ ظاہر ہو چکا کہ انھوں نے اپنی سحر کار شخصیت سے فائدہ اٹھا کر کس طرح مسلمانوں کو راضی کیا؟ بعض مسلمان اب تک جداگانہ انتخاب کو رحمت اور مخلوط انتخاب کو لعنت سمجھتے ہیں اور بے دلائل سمجھتے ہیں لیکن محمد علی اپنے نقطہ نظر سے مخلوط انتخاب ہندوؤں کے لئے باعث فلاح سمجھتے تھے، لیکن یہ انہیں کی جاؤب توجہ شخصیت تھی جس نے ہندوؤں کو بالآخر مخلوط انتخاب کو ماننے پر راضی ہی کر دیا۔

مخالفت کا اثر | ایک عرصہ دراز کے غور و فکر، تلاش و جستجو اور سعی و کوشش کے بعد انہیں ایک حل پایا ملا تھا جس پر انھوں نے مسلمانوں کو متفق کر لیا تھا اور کانگریس سے بھی اسے منظور کر لیا تھا اور یہ منظور ہی اس کی مجلس عامہ ہی میں نہیں ہوئی بلکہ مجلس عامہ میں ہوئی، آل انڈیا کانگریس

کمیٹی کے جلسے میں ہوئی اور پھر ہزاروں کی تعداد کے سالانہ جلسہ منعقدہ مدراس میں ہوئی مسلمانوں نے بھی گو شروع شروع میں مخالفت کی، مگر آخر میں وہ بھی ہموار ہو گئے اور انھیں ماننا ہی پڑا کہ ہمارے درود کی دوا یہی ہے۔

لیکن اسے انھوں نے نہایت شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ اس توثیق و تصدیق کے بعد بھی نیت کا فتور کم نہیں ہوا تھا مالوی جی، سٹرکچر، سٹرکلیکر اور ڈاکٹر مونجے کی رضامندی کے باوجود عام ہندوؤں نے ان سب کے اشارہ چشم سے جس طرح مخالفت کی وہ اظہر من الشمس ہر جیلپور میں مہاسبھا کے اجلاس میں ڈاکٹر مونجے نے جو کچھ فرمایا تھا اس کی آواز بہت سے مسلمانوں کے کانوں میں آج بھی گونج رہی ہوگی۔

اور پھر اس روش سے متاثر ہو کر، ڈر کر، مریعوب ہو کر قوم پرستی کا دم بھرنے والوں نے وقت و بخت لیکن نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنی روش میں تبدیلی کی، ہندو مہاسبھا کو ہاتھ میں لیا اس کی تائید و حمایت حاصل کی اور مسلمانوں کو خود بلا کسی وجہ کے اپنے ہاتھ سے کھویا، ان کی مانی ہوئی اور طے شدہ باتوں کو قبول کیا، پھر ”سیاست“ سے کام لیکر ٹھکرا دیا اور اس کی توقع رکھی کہ مسلمان ہاں ہیں ہاں ملائے ہی جائیں گے۔

بہر حال ~~ہندوستان کے~~ باوجود محمد علی اپنی زندگی کے آخری لمحات تک چودہ اصولوں پر قائم رہے، بعض حالات کی ~~تعلیل~~ نہرو رپورٹ کے ضمن میں ملاحظہ فرمائیے۔

باب ۳۹ سائنس کمیشن

ہندو مسلمانوں کے اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لیبر گورنمنٹ نے حسب اصول مسئلہ میں ایک کمیشن کا تقرر کر دیا جس کے احاطہ تحقیق میں یہ بات داخل تھی کہ وہ اس کی تفتیش کرے کہ گزشتہ اصلاحات سے اس وقت تک ہندوستان نے کتنی ترقی کر لی ہے تاکہ اسی کے مطابق جدید اصلاحات کا خاکہ تیار کیا جائے اور ہندوستان کو پھر

مجلس آئین و اصلاح و رعایات حقوق

کا شیریں گھر خواب آور، شربت پلا دیا جائے تاکہ پھر ایک عرصہ دراز تک یہ مرغ زریں بال اسیر دام ہے۔

سائنس کمیشن کی ہیئت ترکیبی | کانگریس نے اس کمیشن سے اپنی پوری بے تعلقی کا اعلان کر دیا، لیکن لیبرل حضرات ابھی تک تذبذب میں تھے مگر گورنمنٹ کی مسلسل بے مہربانی نے اس تذبذب کو عرصہ تک قائم رہنے دیا اور کمیشن کی ہیئت ترکیبی اس قسم کی رکھی کہ اس میں ہندوستان کے معتدین تک کو نہیں رکھا، سر تیج بہادر سپرو اور سٹرجن جیے اشخاص بھی انتخاب میں نہ آ سکے اور زبانا حال سے کہہ دیا گیا کہ ہندوستان کی قسمت کے فیصلہ میں ہندوستانیوں کو کچھ دخل نہیں ہو سکتا طوفان اختلاف | جب علی الاعلان گورنمنٹ نے اپنا یہ رویہ ظاہر کر دیا تو ہندوستان کے معتدین بھی چیخ اٹھے اور سب نے بالاتفاق کمیشن کے بائیکاٹ کی صدا بلند کی جن میں سر تیج بہادر اور سٹرجن جیے پیش پیش تھے لالہ لاجپت رائے بھی نہایت برہمی کے ساتھ مالوی جی کی مصیبت میں اس کی نصیحت

کر رہے تھے اس لئے کہ یورپ کی مسلسل سیرو سیاحت کے بعد اور سٹر میکڈونلڈ اور ان کی لیبر پارٹی سے ناامیدی کے بعد پھر لالہ جی بھی مخالفین کی صف میں نظر آنے لگے۔

مجلس قانون ساز میں | یہ رنگ دیکھ کر گورنمنٹ کے خلاف ہندوستان کے ہر طبقہ نے اظہارِ خیال کرتا شروع کیا، سب سے پہلے لالہ لاجپت رائے نے اسمبلی میں سائن کمیشن کے تقرر اور تعاون کے خلاف ایک زبردست تجویز پیش کی جو پنڈت موتی لال کی تائید اور راجہ ہاؤس کے دوسرے ”آزہیل ممبروں“ کی تائید مزید کے بعد منظور ہو گئی، پھر ہندوستان کی ہر صوبہ کونسل میں یہی تجویز پیش ہوئی معتدلیں کے علاوہ تعلقداروں کا طبقہ بھی اس کمیشن کے تقرر سے ناخوش تھا، چنانچہ ہمارے صاحب محمود آباد اور راجہ صاحب کالا لاکھ تعلقداروں کی جماعت سے اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

تالیف قلب | یہ رنگ دیکھ کر گورنمنٹ نے تالیف قلب کے خیال سے ہندوستانیوں کو پھر ایک تھکی دی اور اسمبلی کونسل آف اسٹیٹ اور ہر صوبہ کی طرف سے ایک دوسرا ”سائن کمیشن“ بنادیا جس کے صدر سر سکرن نار تجویز ہوئے، امید تھی کہ اس ”فراخدی“ سے لبرل حضرات پھر ”معتدل“ ہو جائیں گے، اور اگر کانگریس کی نہیں تو کم از کم انھیں کی ہمدردی حاصل ہو جائیگی مگر اس کا بھی کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا، اور ہندوستان کے معتدلیں کی طرف سے بھی اس کی اسی شدت سے مخالفت ہوتی رہی جس طرح کانگریس کی طرف سے، لیکن ان کی مخالفت بھی ”معتدل“ تھی، یہ تو قریباً تحریک محدود اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا تھا وہ ان کے سنجیدہ طلباء کے خلاف مسلمانوں کی روئے | یہ تو تھیں ہندوؤں کے عام طبقات کی حالت، لیکن مسلمانوں کی حالت اس کے برعکس تھی وہ تقریباً سب قوم کمیشن سے تعاون کرنے کے لئے آمادہ تھے، بھٹے خطاب اور ارکان کونسل تھے وہ سب تو کمیشن کے حامی تھے ہی مگر وہ لوگ جن کی عمر گورنمنٹ کی مخالفت

میں گزری تھی وہ بھی ہندوؤں کی ذہنیت سے اتنے بدول ہو چکے تھے کہ کمیشن سے تعاون میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے، مثلاً مولانا حسرت موہانی، مسٹر خلیج اگرچہ بہت مخالف تھے، لیکن وہ بھی حیران تھے کہ اس وقت مسلمانوں کی رہنمائی کس طرح کی جائے، اور کیوں کر ان کے جذبہ تعاون کو ختم کیا جائے؟

محمد علی کی رائے | محمد علی بھی سائن کمیشن کے تقرر کے سخت مخالف تھے، وہ گورنمنٹ، مسٹر میکڈونلڈ اور ان کی ساری پارٹی سے خوب واقف تھے، یہ بھی جانتے تھے کہ اس کمیشن سے ہم مسلمانوں کو کیا مل جائے گا، اور اگر تعاون نہ کیا گیا تو نقصان کیا ہوگا؟ بہر حال وہ پوری استقامت کے ساتھ میدان عمل میں آئے اور سائن کمیشن کی مخالفت انھوں نے نہایت شدت کے ساتھ شروع کر دی۔

اس سلسلہ میں پھر انھیں بڑے بڑے لوگوں سے ٹکرائی پڑی، لیکن جس چیز کو وہ مسلمانوں کے لئے باعث ذلت سمجھ رہے تھے، اسے قبول کرنے کی حیات کیے کر سکتے تھے؟ اس لئے اس کی مخالفت میں انھوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

سرسنٹیفک کا ”پیام“ | سرسنٹیفک مروجہ کمیشن کے بڑے سخت حامی تھے اور انھوں نے تعاون کے تمام سامان مکمل کر لئے تھے، اسی زمانہ میں مسلم لیگ کی صدارت کے لئے اکا انتخاب ہو چکا تھا۔ لیگ کی کونسل کے صدر مسٹر خلیج تھے اور اجلاس کے صدر سرسنٹیفک منتخب ہوئے، دونوں کے افکار و آراء میں سخت تضاد تھا، ایک کمیشن کا نہایت شدت کے ساتھ حامی تھا اور دوسرا اسی انداز میں اس کی مخالفت کر رہا تھا سرسنٹیفک سے درخواست بھی کی گئی کہ وہ صدارت سے مستعفی ہو جائیں، لیکن انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا، صدارت اور مسلمانوں کی ”رہنمائی“ پر پوری آمادگی ظاہر کی، مقام اجلاس کلکتہ طے ہوا تھا، لیکن سرسنٹیفک پارٹی لاہور کے

لئے مصرتھی، بالآخر یہ کشمکش ختم نہیں ہوئی، مسٹر خلیج نے حسب قرار داد کلکتہ ہی میں اجلاس منعقد
لیگ کے دوکمرے | کرنا چاہا اور سر شفیق نے حسب مرضی خود لاہور میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سر شفیق نے
لاہور میں اپنا جلسہ کیا اور آل انڈیا مسلم لیگ، نام رکھا اور خود صدارت کی، مسٹر خلیج نے کلکتہ
میں کیا اور سر محمد نعیم نے اس کی صدارت کی۔

مسٹر خلیج اس وقت سخت پریشان ہو رہے تھے انہیں سخت فکر تھی کہ اجلاس کامیاب
کیسے ہوگا، موصوف کو عام مخالفت کا سخت اندیشہ تھا اور پھر اس جدید تفریق نے بھی ان کو اور
زیادہ پریشان و مضطرب کر رکھا تھا، بہر حال اسی کشمکش میں اجلاس کی معینہ تاریخ آگئی۔
محمد علی کی جدوجہد | محمد علی مسٹر خلیج کے پورے طور سے حامی تھے اور کمیشن کو وہ زیادہ سے زیادہ
ناکام بنانا چاہتے تھے، چنانچہ مدراس کانگریس کا اجلاس نامکمل چھوڑ کر وہ کلکتہ روانہ ہوئے اور اگرچہ
حکیم اہل خاں مرحوم کے انتقال کی خبر نے انہیں دیوانہ بنا رکھا تھا مگر پھر بھی وہ سیدھے کلکتہ روانہ ہوئے
دوسرے یا تیسرے روز ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی ”لمک“ کے لئے پہنچ گئے۔
محمد علی نے اجلاس میں پہنچتے ہی اپنے اثرات سے کامیابی حاصل کرنا شروع کی، انہوں نے
سائنس کمیشن کے بائیکاٹ کی تجویز منظور کرائی اور پھر ”تجاذیر دہلی“ کے سلسلہ میں وہ چیز جس سے مسلمان
بہت بڑک رہے تھے اور جس سے ابھی مسٹر خلیج بھی مانوس نہیں ہوئے تھے یعنی (بشرائط) مخلوط
انتخاب کی حمایت۔

مسٹر خلیج کی مخالفت | مسٹر خلیج نے محمد علی کو یہ کہہ بھجایا کہ وہ اس ”نازک“ موقع پر ایسی تجویز
نہ پیش کریں جس سے اختلاف کا اندیشہ ہو اس لئے کہ اس انتشار سے وہ حد درجہ پریشان تھے، مگر
محمد علی نے انہیں بہت ڈھارس دی اور بتلایا کہ جو تجویز مسلمانوں کی فلاح و بہبود سے تعلق رکھتی ہو
اور جسے ہم نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے خاص خاص بقعات میں اتنی جدوجہد کے بعد منظور کرایا

ہے، اب مسلمانوں کے ایک جلسہ عام میں کیوں نمیش کریں؟ اگر کوئی مخالفت کرے گا تو دیکھا جائے گا، اچھا ہے مخالفت کرے تو سمجھ کر لے لے گا۔

کامیابی | آخر محمد علی نے مٹرجناح کو بھی بہت زیادہ تذبذب اور تامل کے بعد رضی ہی کر لیا اور لیگ کے کھلے اجلاس میں اپنی تجویز بھی پیش کی، اپنے خیالات بھی نہایت بے قیود و تفصیل سے ظاہر کئے اور اس فضا میں جس میں ناکامی کے اندیشہ سے دوسروں کے اور سامان خطا ہوئے جاتے تھے۔ محمد علی نے نہایت کامیابی سے اپنے خیالات کی پذیرائی کرائی اور وہاں سے کامیاب کھڑا یلغار کرتے ہوئے اپنے دار السلطنت ہلی میں داخل ہوئے اور یہاں پہنچ کر پھر تبلیغ و اشاعت میں نہہک ہو گئے اور اس وقت تک چین نہیں لیا جب تک اس مقصد میں پورے طور سے کامیابی نہیں حاصل ہو گئی

سرفیض کو چیلنج | اگرچہ پنجاب میں اتنے زعماء ہیں جتنے ہندوستان بھر میں مجموعی حیثیت سے ملیں گے اور ان بزرگوں میں سے ہر محترم شخصیت کا یہ خیال ہے کہ پنجاب میں اس کا طوطی بول رہا ہے اور اس گردہ عوام سے وہ جو چاہے کر اسکتا ہے، عوام ان کے اشارہ کے منتظر ہیں، اُدھر گوشہ چشم التفات نے کچھ اشارہ کیا اور ان کی مدد پبلک سرفیض نے فرسٹ ۱۷ ہو ہو کر ان کا استقبال شروع کیا اور ان کے ارشادات عالیہ کی تعمیل۔

لیکن اس ادعا کی جب تحلیل کیے تو حقیقت دوسری نظر آئے گی۔

ہمیشہ یہ دیکھا گیا ہے کہ ان زعماء کے سامعی جیلہ کے باوجود سائے مسلم پرس کا ان کے قبضہ اقتدار میں ہونیکے باوجود اور ان کے مسلمہ اعتراف قیادت کے باوجود، کامیابی پنجاب میں ہمیشہ فریق مخالف ہی کے حصہ میں آئی! حیرت جس قدر بھی ہو واقعہ یہی ہے!

سائمن کمیشن کا تقریباً سائے ہندوستان نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ بائیکاٹ ۱

کیا لیکن پنجاب کی آغوش تناس کے لئے کھلی ہوئی تھی، وہاں کے دفنا داروں نے بغیر سیاہ جھنڈیوں کے، بغیر کسی منظر ہرے کے جو چاہا کیا، اخبارات کے صفحات ان ”ٹوڈیوں“ کی ہجو سے برز تھے لیکن وہ اپنی کوٹھیوں میں سائنس صاحب اور ان کے رفقا کو عین رمضان کے مہینہ میں ان کے وقت ”ڈز“ مے ہے تھے۔

سرفیج کی مسلم لیگ سے سارے پنجاب کے مسلمانوں کو اختلاف تھا اور اسی خیال سے ان زعماء میں سے کلکتہ کے اجلاس میں کوئی نہیں شریک ہوا کہ لاہور کی خدمت مقدم ہے، یہاں رہ کر وہ سرفیج کی لیگ کو ناکام بنانے کی پوری کوشش کریں گے اور ان کو ان مقاصد دشمنی میں ہرگز کامیاب نہ ہونے دیں گے، سارا ہندوستان منتظر تھا کہ دیکھے یہ حضرات وہاں کیا کرتے ہیں، مگر اخبار میں صرف یہ آیا کہ سرفیج نے نہایت اطمینان سے لاہور میں اجلاس کیا، خود صدارت کی اور جو چاہا پاس کرایا، جس میں سائنس کمیشن سے تعاون بھی تھا، اور کوئی بھی اس ”کامیاب“ اجلاس کو ”ناکام“ نہ کر سکا۔ یہ ضرور ہوا کہ بعض حضرات نے کچھ بولنا چاہا مگر بعد کو صدر کا ”ہتبلہ“ اور اپنی ”اقلیت“ دیکھ کر وہ ”واک آؤٹ“ یعنی اعلان شکست کر کے چلے آئے۔

اسی طرح ابن سعود کا سارا پنجاب حامی بتایا جاتا تھا لیکن جو گروہ اپنی ”صوفیت“ اور ”حنفیت“ کا بلند بانگ مدعی تھا اس نے حامیان ابن سعود پر عرصہ حیات تنگ کر دیا اور یہ کچھ نہ کر سکے، حالانکہ سب ان کے ”ہم خیال“ تھے۔

ان تمام مواقع پر سید محمد علی سے استمداد کی گئی اور ٹیلیفون پر ایک خاص حلقہ کی جانب سے بار بار ”عم محترم“ کو بلایا گیا۔

پھر طلبی | چنانچہ سائنس کمیشن کے زمانہ میں جب پھر پنجاب میں سرفیج اور ان کے ”ہم خیال حضرات“

دوسرے لیڈروں اور ان کے ”منجیال“ حضرات پر غالب آئے اور اپنی من مانی کارروائی کرنے لگے۔

تو محمد علی کو پھر طلب کیا گیا اور پھر ان کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کی تسکا اظہار کیا گیا۔ محمد علی نے یہ دعوت قبول کی اور سر شفیق کو چیلنج دیا کہ جس طرح چاہو تم سائن کمیشن کے تعاون کی کوششیں کر کے دیکھ لو، میں بھی لاہور آتا ہوں، میں بھی تقریر کروں گا، اپنے خیالات و مقصدات پبلک کے سامنے پیش کروں گا آپ بھی ایسا ہی کیجئے گا اور پھر فیصلہ پبلک پر چھوڑ دیجئے گا، غرض انھوں نے پنجاب کے اکثر مقامات کا دورہ کیا اور ہر جگہ کامیابی حاصل کی اور پھر وہاں جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔

لکھنؤ میں جلسہ | ہمارا جہ صاحب محمود آباد نے لکھنؤ میں بھی محمد علی کو دعوت دی تھی کہ وہ تشریف لائیں اور وہاں سائن کمیشن کی مخالفت میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

چنانچہ محمد علی گئے، گو وہاں کے مسلمان اس زمانہ میں امین آباد کے قضیہ میلاد کے سبب ہندوؤں سے سخت بیزارتھے اور وہاں کا مقامی حلقہ جس کا خاصہ اثر تھا، مسلمانوں کو بہت متاثر کر چکا تھا، مگر محمد علی گئے اور انھوں نے ”امر بالمعروف“ کا فرض وہاں بھی ادا کیا۔

مخالفت | مسلمان چونکہ زخم خوردہ تھے اور وہاں کے ہندوؤں سے سخت شاکہ اس لئے محمد علی سے مطالبہ کیا گیا کہ ہم اس وقت آپ کا ساتھ اس معاملہ میں دیں گے جب آپ یہ قضیہ ہمارے موافق فیصلہ کرادیجئے۔

جلسہ میں جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، سبھی تھے، جلسہ کو درہم برہم کرنے کی بعض مسلمانوں کی طرف سے پوری کوششیں کی گئیں، لیکن الحمد للہ کہ مخالفین کو کامیابی نہیں ہوئی اور محمد علی نے اس خوبی سے یہ مسئلہ سمجھایا کہ مقامی لوگوں کی حالت کو پوری

قوم اور ملک کے معاملہ میں حائل نہیں کر دینا چاہئے! پھر سارا مجمع محمد علی کے ساتھ تھا اور اس کے بعد دوسرے روز پھر انھوں نے امین آباد پارک میں ایک زبردست تقریر کی، وہ تقریر محمد علی کی تاریخی تقریروں میں شمار کی جاتی ہے، اس میں انھوں نے ہندو مسلم تعلقات پر اظہار خیال کیا تھا اور دونوں کو ان کے فرائض یاد دلانے تھے اور بتایا تھا کہ کیا کرنا چاہئے اور کیا کر رہے ہو؟

پھر دوسرا جلسہ دوسرے روز منعقد ہوا یہ لکھنؤ کے سکھوں نے سردار نگل سنگھ اور سردار کھر سنگھ کے اعزاز میں کیا تھا، محمد علی بھی اس میں مدعو تھے اور یہاں بھی انھوں نے ایک معرکہ آلا تقریر فرمائی!

مضامین | مسلسل تقریروں کے علاوہ اس سلسلہ پر انھوں نے مضامین کا بھی ایک مستقل سلسلہ شروع کر دیا تھا اور اس سلسلہ پر اتنی وضاحت کے ساتھ اظہار خیال کیا تھا کہ بڑے بڑے مخالفین بھی واوے بغیر نہ رہ سکے۔

ایک مضمون | چنانچہ ایک موقع پر وہ سائنس کونشن پر اظہار خیالات کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”حقیقتہً برطانوی پارلیمنٹ کو نواز روئے اخلاق ہماری قیمت کے خلاف فیصلہ نہ کرنا حق ہونا چاہئے، نہ وہ صحیح فیصلہ کرنے کے قابل ہے، یہ جماعت ہندوستان کے متعلق محض جاہلوں کی ایک جماعت ہے، ان تقریبات سودا مبران پارلیمنٹ (برطانویوں میں سے ستر بھی شکل سے اپنے نکلیں گے جو ہندوستان کے متعلق کچھ بھی جانتے ہوں گے“

نتیجہ | محمد علی کی مسلسل اور قابل رشک اور غیر فانی جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی بار جب سائنس کونشن کے قدم ہندوستان میں آئے تو ہندو مسلمان دونوں نے نہایت ہم آہنگی سے بائیکاٹ کیا تھا جس کی یاد غالباً آج تک سائنس صاحب اور ان کے حامیوں کے دل سے محو نہ ہوئی ہوگی۔ حالانکہ مسلمانوں کے جذبات اس وقت ہندوؤں کے سخت خلاف تھے اور وہ ایسی تجویز!

مفتابھی پسند نہیں کرتے تھے جس سے ہندوؤں سے اشتراک عمل کا ذرا بھی پہلو نکلتا ہو۔ مگر وہ محمد علی کی ساحراۓ شخصیت تھی جس نے ہنسنا کر، رُلا رُلا کر لوگوں کو ہموار کیا اور بتایا کہ یہ اختلافات کس قدر نقصان رساں ثابت ہوں گے، یہ وقت اشیار کا ہے، اس وقت اگر ہم نے اپنے اتفاق و اتحاد سے سائنس کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا تو ہمیشہ ہمیشہ ہندوستان کی تاریخ میں ہمارا نام زرین حروف سے لکھا جائے گا۔

اور پھر دوسری دفعہ جب سائنس کمیشن آیا تو ہندوستان میں نہرو رپورٹ تیار ہو چکی تھی، ہندو مسلمانوں میں پھر اختلافات شروع ہو گئے تھے اور جودل محمد علی نے جوڑے تھے وہ پھر برادران وطن کی مسلم آزار روش سے ٹوٹنے لگے تھے، جو تعلقات استوار ہو گئے تھے وہ پھر شکست ہونے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ دوبارہ آمد کے موقع پر سائنس کمیشن کا بائیکاٹ اس شان کے ساتھ نہیں ہوا۔ جس کے خود سائنس صاحب متوقع تھے!

باب

سفر یورپ

ملکی دلی مشاغل نے محمد علی کی صحت پر بہت بُرا اثر ڈالا تھا، رفتہ رفتہ انکی صحت انہیں جواب دینے لگی، ڈاکٹروں کے پیہم مشوروں اور ہاتھوں کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو نہ آرام دے سکتے تھے، اور نہ مشاغل ملکی دلی سے بے فکر ہو کر مٹھ سکتے تھے،

کئی بار انھوں نے بھی نہایت خلوص کے ساتھ یہ چاہا کہ کچھ عرصہ کے لئے قوم سے "رخصت" لے لیں، اور ذرا یکسوئی کے ساتھ اپنے کچھ دن آرام سے گزاریں تاکہ تازہ دم ہو کر، ملک و قوم کی خدمت اور زیادہ ہمت و طاقت سے کر سکیں، لیکن یہ موقعہ انھیں کبھی نہیں حاصل ہوا، جب فراغ طبع اور سکون خاطر حاصل کرنے کے لئے انھوں نے گوشہ تنہائی اختیار کرنا چاہا، کوئی نہ کوئی ایسا حادثہ ملی واقع ہو گیا کہ انکا سارا سکون درہم برہم ہو گیا،

کچھ ان اسباب اور کچھ اسلئے کہ ہندوستان میں اتنے مسلسل علاج کے باوجود ذیابیطس میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا تھا، بلکہ وہ بڑھتا ہی جاتا تھا، اور یہ صورت حدِ بڑھ تشویناک تھی انھیں اپنی صحت کا احساس ہوا،

اب ایک صورت تھی کہ بغرض علاج و تبادُلہ آب و ہوا وہ یورپ جائیں، لیکن اسکے لئے ضروری تھا کہ جیب میں دام ہوں، ناداری اور افلاس کا یہ عالم تھا کہ دہلی میں قیام تھا نہ کہ یورپ کے مغزاروں کی سیر و تفریح، یہ تو قطعاً ناممکن تھا،

"مردے از غیب" | محمد علی انہی ناخوشگوار حالات میں گھرے ہوئے تھے، اور صبر و

خاموشی سے اپنے یہ دن،

شاد باید زیتن ناشاد باید زیستن

لھکر گزار رہے تھے کہ مسبب الاسباب نے ایک دوسری صورت پیدا کر دی، یعنی ہمارا جہ صنا
الور نے خود ہی بغیر کسی تحریک کے، بغیر کسی سابقہ شناسائی کے، بغیر کسی خاص واقفیت کے
محمد علی سے ایک ڈر کے موقع پر عقیدت مندانہ طور سے نیاز حاصل کیا، اور چند روز کے بعد وہ
محمد علی کی سحر کار شخصیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ محمد علی ہی محمد علی انکی نظروں میں رہ گئے،
ہمارا جہ نے محمد علی کی صحت کا یہ زوال و انحطاط دیکھا تو بہت پریشان ہوئے اور
فوراً محمد علی کو مشورہ دیا کہ وہ تبادلہ آب دہوا اور علاج معالجہ کے لئے یورپ چلے جائیں، اور
چونکہ انکی تنگدستی سے واقف تھے اسلئے تمام مصارف سفر و قیام اپنے ذمہ لئے،

غرم روانگی | اس اصرار اور مخلصانہ اصرار کے بعد بھی محمد علی نے ابتداءً انکار کیا اور محترم
مدیر سچ کے بیان کے مطابق انھوں نے ڈاکٹر انصاری اور مولانا شوکت علی سے پہلے مشورہ
کیا، جب ان دونوں بزرگوں نے بھی اصرار کیا، تو محمد علی راضی ہو گئے اور ضروری انتظامات
کر کے یکم جون ۱۹۳۸ء کو رخت سفر باندھ چل کھڑے ہوئے۔

ردانگی سے پیشتر، وہ اجیر شریف کے آستانہ پر حاضر ہوئے، پھر احمد آباد گاندھی جی
سے ملنے گئے، پھر آبوپہاڑ پر، ہمارا جہ صاحب الور سے کچھ ضروری باتیں طے کرنے کیلئے
روانہ ہوئے، وہاں سے بمبئی آئے، وہاں دو ایک روزہ کر، عازم یورپ ہوئے،

پیرس | پہلے وہ پیرس پہنچے، وہاں ضروری معلومات ڈاکٹر دول اور طریقہ علاج
کے متعلق حاصل کئے، اور چونکہ ابھی تک علاج شروع نہیں کیا تھا، اسلئے خوب جی کھول کر
بہرہ گیری بھی کی،

آخر ایک ڈاکٹر پر رائے جمی، بعض دوستوں کے مشورہ کے مطابق اس ڈاکٹر سے انھوں نے رجوع کیا، پہلے خیال تھا کہ علاج میں فاقے بہت زیادہ کرائے جائینگے اور اُسکے علاوہ دوسری مشقتیں اور ریاضتیں بھی کرائی جائیں گی، مگر ایسا نہیں ہوا، اندازہ سے فاقے کم کرائے گئے، لیکن غذا میں یہ تغیر کیا گیا کہ کچی ہوئی غذا کی ممانعت کر دی گئی، اور کچی غذا کی ہدایت کی گئی،

بستر عیالات | یہاں کچھ روز واقعی محمد علی نے نہایت استقلال سے اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف بستر عیالات پر گرائے، چند روز کے بعد انکی طبیعت سخت خراب ہو گئی تھی، ایک دن بالہ بھی نکل آیا تھا، ذیابیطس میں ذرا سے پھوڑے یا پھنسی کا نکلنا بھی پیام ہلاکت ہوتا ہے، اسلئے کہ زخم پھر بھرتا نہیں ہے اور رفتہ رفتہ وہ زخم سارے بدن پر جاؤں ہو جاتا ہے، اور تھوڑے ہی عرصہ میں مرض اور مریض دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن محمد علی کو خدا نے بچا لیا اور وہ صحتیاب ہو گئے،

مایوسی | لیکن اپنی اس عیالات سے وہ بہت مایوس ہو گئے تھے، اسلئے اور کلان کی طبیعت نے مطابقت بھی پیدا کر لی تھی، یعنی اس عمر، اسی مرض اور اسی حالت میں اُنکے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علیخاں صاحب کا انتقال ہوا تھا، اسلئے محمد علی سمجھے کہ میرا بھی بوقت آخری ہے، چنانچہ انھوں نے یکم صاحبہ، اور مولانا شوکت علی کو بلایا بھی کہ اگر وہ لوگ وہاں پہنچ جائیں تو آخری وقت یاد رہے تو ہوجائے گا، لیکن اپنی طلبی کے اسباب میں اپنی اتنی سخت اور نازک عیالات کا ذکر نہیں کیا کہ مبادیہ لوگ بہت زیادہ پریشان ہو جائیں اور انکی پریشانی محمد علی نہیں دیکھ سکتے تھے،

نماز جنازہ کا طریقہ | وہ اپنی زلیست سے اتنے مایوس ہو چکے تھے کہ مظفر صاحب اور

دوسرے ہندوستانی عزیزوں کو جو وہاں پہنچ گئے تھے، انھوں نے نماز جنازہ بھی سکھلا دی، کہ اس کفرستان میں کون ہے جو ایک مومن کی نماز جنازہ اسکے مذہب کے اصول کے مطابق ادا کریگا، ان نوجوانوں کو نماز ہی شکل سے آتی ہوگی نہ کہ نماز جنازہ، اس کا تو بہت کم اتفاق پڑتا ہے اسلئے یہ اکثر لوگوں کو نہیں آتی ہے،

بہر حال انھوں نے ان لوگوں کو نماز جنازہ پڑھنے کا طریقہ، غسل میت دینے کا طریقہ ادعیہ ماثورہ، دفن کرنے کا طریقہ، مٹی دینے کا طریقہ سب کچھ بتا دیا، اور اطمینان دینے کے لئے تیار ہو گئے،

صحت | لیکن خدا کو ابھی یہ منظور نہ تھا اسلئے کچھ عرصہ کے بعد وہ صحتیاب ہونے لگے انکی شکایتیں بڑی حد تک رفع ہو گئیں، صرف چند شکایتیں باقی رہ گئی تھیں، اگرچہ روز اور جم کے علاج کیا جاتا، تو یقیناً ان میں بھی غیر معمولی فائدہ محسوس ہوتا،

مگر جس شخص نے درد قوم کے لئے اپنی صحت، اپنی عمر، اپنا وقت سب کچھ وقف کر رکھا ہو، وہ خود کیسے چین سے بسترِ علالت ہی سہی اپرا آرام کر سکتا ہے، اسکو تو ہر وقت قوم کی فکر اسکا غم، اور اس کی تباہی و بربادی پر کڑھتے گزرتی ہے یہ سچ ہے کہ وہ اپنے تنیس بالکل فراموش کر دیتا ہے یہی محمد علی نے کیا۔

ہندوستان میں تلاطم | مولانا کے اسی سفرِ یورپ کے دوران میں ہندوستان میں نہرو رپورٹ شائع ہو چکی تھی اور جانبین میں سخت پرکار شروع ہو گئی تھی، محمد علی کو وہاں بسترِ علالت پر لیٹے لیٹے سب خبریں مل رہی تھیں بعد کو مٹر شیب قریشی بھی وہاں ”ضروری کاغذات“ لیکر پہنچ گئے، اور ہندوستان اور مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ انکے سامنے کھینچ کر انسے مدد اطلب کیا، انکے پاس ہجر اسکے اور مدد اکیا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی صحت

کی فکر نہ کریں، ڈاکٹروں کے مشورہ کے علی الرغم اٹھیں اور ہندوستان پہنچ جائیں اور اپنی ایسی
جدوجہد کا آغاز کر دیں جسے تسخیر کرنا آسان ہے، عمل کرنا مشکل،

انگلستان اپنے زمانہ علات میں بھی وہ دو ایک بار انگلستان گئے، ایک بار
مشر سکلٹ والہ نے وہاں جلسہ کے انتظامات کئے اسمیں محمد علی نے اپنی نقاہت اور
علالت کے باوجود سائن کمیشن پر ایک زبردست تقریر کی، اور وہاں اسکی مخالفت میں جو
لیگ قائم ہو رہی تھی، اسمیں اپنے افلاس کے باوجود چندہ دیا اور ہر طرح سے امداد و اعانت
پر آمادگی ظاہر کی۔

روانگی بالآخر محمد علی نے ابھی پورے طور سے صحت نہ حاصل کی تھی کہ وطن کی زار و
نزار حالت نے انھیں اپنی طرف کھینچ لیا، اور وہ بہ غم ہندوستان روانہ ہو گئے
مالک اسلامی راستہ وہ اختیار کیا جس سے مالک اسلامی پر بھی ایک نظرے خوش گرد
پڑ سکے، چنانچہ واپسی میں، قسطنطنیہ، بیت المقدس، بغداد، عراق، اور دوسرے قابل
ذکر مقامات کی زیارت کرتے ہوئے، وہ کراچی پہنچ گئے!

باب

نہرورپورٹ

آل پارٹیز کے بعد! آل پارٹیز کے سلسلہ میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ کس طرح مسلسل اور پیہم اسکے اجلاس طلب کئے گئے، اور کس طرح برادران وطن کی ہٹ اور ضد سے وہ برابر ملتوی ہوتے رہے، اور کام بگڑتا رہا،

دہلی میں جب آل پارٹیز کانفرنس ملتوی ہوئی تھی تو طے پایا تھا کہ مئی کے آخری عشرہ میں بمبئی میں ایک بار پھر اسے مدعو کیا جائے، چنانچہ جناب صدر کی طرف سے تمام انجمنوں کے نمائندوں کو شرکت دعوت اور وقت و مقام کی اطلاع دیدی گئی، بمبئی میں جلسہ چنانچہ وقت مقررہ پر جلسہ منعقد کیا گیا، لیکن ہندوستان کی کسی انجمن نے اس میں اپنا نمائندہ نہیں بھیجا، اور نہ اس کی کارروائی جاری رکھنے پر آمادگی ظاہر کی، مسلمانوں میں، مسلم لیگ، مسلم فیڈریشن، اور دوسری جماعتوں نے قطعاً اپنے نمائندے بھیجنے سے انکار کر دیا، ان جماعتوں کے ممبروں نے شخصی طور سے شرکت کرنے پر بھی آمادگی نہیں ظاہر کی،

اسی طرح ہندوؤں میں ہندو مہا بھما، اور دوسری انجمنوں نے قطعاً انکار کر دیا کہ وہ اس میں کوئی علی حصہ لینے سے قاصر ہیں، شخصی طور پر بھی مالوی جی، لاجپت رائے، ڈاکٹر موہنجے، مٹرجیکر، کسی نے بھی نہ شرکت کی، نہ شرکت پر آمادگی ظاہر کی، کانگریس کا وہ طبقہ جو حقیقتہً مہا بھائی ظاہر ہو چکا تھا، اور شربے رام داس دولت رام

کی سرکردگی میں اپنے اختلاف کا اظہار برابر یوان کانگریس میں کیا کرتا تھا، وہ بھی نہ شریک ہوا، کل شرکا کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی،

قابل ذکر لوگوں میں، گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مولانا شوکت علی، اور سرائی بسنٹ! یہ تھی ”آل پارٹیز کانفرنس“ جسکا ”اجلاس“ ہو رہا تھا، گاندھی جی کی تجویز ایہ صورت دیکھ کر گاندھی جی نے پھر تجویز ”التوا“ پیش کی، کہ چونکہ حاضرین اور شرکار اور مندوبین کی تعداد اتنی کم ہے، لہذا اسے پھر ملتوی کر دیا جائے، بعض لوگوں نے بدل ہو کر برخاست کر دینے کی رائے پیش کی مگر اسے اسلئے نہیں مانا گیا کہ اس سے ملک میں مایوسی پیدا ہو جائیگی، گاندھی جی نے کہا کہ آل پارٹیز کانفرنس ملتوی کر دی جائے، اور ایک کمیٹی بنا دی جائے جو لارڈ برکن ہیڈ کے چیلنج کا جواب تیار کرے یعنی ایک دستور اساسی وضع کرے جس پر سارے طبقہ متحد و متفق ہو سکیں، اور جب وہ اپنی رپورٹ تیار کر لے تو پھر آل پارٹیز کانفرنس کا ملتوی شدہ اجلاس طلب کیا جائے، شوکت کی تائید شوکت صاحب موجود تھے، انھوں نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ اس تجویز کی تائید کی، اور امید ظاہر کی کہ کمیٹی ہماری تمام مشکلات کو رفع کر دیگی، ہم برکن ہیڈ کے چیلنج کا جواب بھی تیار کر لینگے، اور ہمارے پاس خود ہمارا وضع کردہ دستور اساسی بھی موجود ہوگا، جس میں ہم سب کے حقوق و مراعات کا تعین ہوگا، اور یہ حقوق حقوق جو نعرے لگ رہے ہیں، وہ ختم ہو جائیں گے اسلئے کہ جب سب کو مناسب اور معقول حقوق وہ دستور اساسی ملے گا، تو پھر اختلاف کے باقی رہنے کا امکان ہی نہیں ہے اور اس طرح ہم پھر اپنے کام میں لگ سکیں گے،

تشکیل اپنا پنچہ ایک کمیٹی بنا دی گئی، جسکے صدر پنڈت موتی لال نہرو، اور ارکان

میں مشرعیب قریشی، مشرانے، مشرجیکر، سوباش چندربوس، سردارنگل سنگھ شامل تھے، کمیٹی کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ حسب ضرورت اپنے ارکان کی تعداد میں اضافہ کر سکتی ہے۔

کمیٹی کے چلے ”انڈیون“ میں منعقد ہوتے ہے اور ارکان کے اضافہ کی جو اسے رعایت دی گئی تھی، اس نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا، اور حسب ضرورت نہیں تو حسب مقصد کمیٹی کے ممبروں میں اضافہ ہوا اور بالآخر ایک ”رپورٹ“ تیار ہو گئی جس نے برکن ہیڈ کے چیلنج کا قابل یادگار جواب دیا!

آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ | جب رپورٹ تیار ہو گئی تو جناب صدر کی خدمت میں پیش ہوئی اور جناب صدر نے لکھنؤ میں غالباً ۲۸-۲۹-۳۰ اگست ۱۹۲۵ء کو اجلاس طلب فرمایا۔

رپورٹ کا خلاصہ اخبارات میں اس سے پیشتر شائع ہو چکا تھا، اور شاہر ملک نے اس پر اظہار رائے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، جب اجلاس شروع ہوا تو خلاف توقع ہندوستان کی اکثر انجمنوں کے مندوبین موجود تھے! جن میں ہندو مہاسبھا کے قائم مقام لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالوی اور ڈاکٹر موہنجے بھی تھے۔

کانفرنس کا اجلاس | کانفرنس کا اجلاس ڈاکٹر انصاری صدر کانگریس کی صدارت میں شروع ہوا، قیصر باغ کی بارہ دری کھینچ بھری ہوئی تھی، تلے کھٹے کوٹھل سے جگہ مل رہی تھی، پہلے اجلاس میں تو دو ضمیمین دستور کی محنت و کوشش، تلاش و جستجو کا بروقت شکریہ ادا کیا گیا تھا جن میں مولانا شوکت علی بھی شامل تھے، سوائے مولانا حسرت موہانی کے کسی نے مخالفت نہیں کی، سو حسرت غریب کی مخالفت ہنسی مذاق میں اڑادی گئی، اس

کے بعد کانفرنس میں نہرورپورٹ منظور کی غرض سے پیش ہوئی۔
یہ وقت وہ تھا کہ ہر کارگر اور کارکن جماعت کو یا مندوب کو موقعہ ہونا چاہئے تھا
اور نہایت فراخ دلی سے سہولت ہم پہنچانی چاہئے تھی کہ اگر اختلاف کا اظہار ہو تو اسے اگر
جواب کے ذریعہ دفع کیا جاسکتا ہو تو ایسا کیا جائے اور اگر ترمیم و اصلاح کے ذریعہ سے ممکن
ہو تو ایسا کیا جائے!

رپورٹ میں کیا تھا | رپورٹ پر نکتہ چینی اور دوسرے حالات پر گفتگو ہائے وارہ بحث
سے خارج ہے، محمد علی کے کارناموں کے سلسلہ میں اتنی تفصیل ناگزیر تھی، مخالفین کا
خیال تھا کہ رپورٹ میں سب کچھ تھا! مگر کلکتہ بمبئی میں جو فیصلے کانگریس نے کئے تھے
وہ نہیں تھے، مسلمانوں نے چودہ نکات جو پیش کئے تھے ان میں سے اکثر رد کر دئے
گئے تھے، خلافت کانفرنس اور مسلمانوں کے متفقہ و متحدہ مطالبات نام منظور ہو گئے تھے
سندھ کی آزادی مشروط کر دی گئی تھی، مسلمانوں کی نشستیں محفوظ نہیں رکھی گئی تھیں،
بقول سوامی شنکر اچاریہ کے صوبوں کو وہ آزادی بھی نہیں دی گئی تھی جو اب
حاصل ہے اور مرکز کو تمام اختیارات عطا فرما دئے گئے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آزادی
کامل کے بجائے ”ڈومنین ایٹس“ کا مطالبہ ”درمیان فی راستہ کے طور پر“ منظور کیا
گیا تھا۔

یہ چیزیں جواب منظور کی گئی تھیں اور مسلمانوں کی متعدد جماعتوں کے علی الرغم منظور
کی گئی تھیں خواہ کتنی ہی مبارک و مستحسن ہوں مگر یہ واقعہ ہے کہ کانگریس اور مسلمانوں کے
گزشتہ فیصلوں کے قطعاً مخالف تھیں! اس لئے دیانند محمد علی اور ان کے رفقا کو پورا حق
پہنچتا تھا کہ وہ اس کی مخالفت کریں اور انھیں مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ اس محضر پر دستخط

کریں جسے وہ اپنی قوم کے لئے ”مختصر قتل“ سمجھ رہے تھے۔

علی برادران کا اختلاف | چنانچہ آل پارٹیز کانفرنس میں شوکت صاحب نے خلافت اور کانگریس کے گزشتہ فیصلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان تجاویز سے اختلاف شدید ظاہر کیا اور ان کے ماننے سے انکار کر دیا۔

دباؤ | راقم الحروف کا یہ چشم دید واقعہ ہے کہ جس وقت شوکت صاحب نے مخالفت کا ارادہ کیا، اُس وقت مٹرسین گپتا، اور سوباش چندربوس نے انتہائی لجاجت اور حسرت سے شوکت صاحب کو اس سے باز رکھنا چاہا، لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ میں مسلمانوں کو قتل ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا ہوں، چنانچہ شوکت صاحب ایچ پریشر لائے، اور انھوں نے ان تجاویز کے ماننے سے حسب فیصلہ جات ماسبق انکار کر دیا۔

پھر محمد علی حبیب یورپ سے اپنے علاج کو مکمل چھوڑ کر ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے بھی پوری شدت کے ساتھ نہرو رپورٹ اور اس کی سفارشات سے اختلاف کیا، اور اس طرح ایک بار پھر ہندوستان معرکہ کارزار میں گیا، اور صلح و سلام کے خوش آئند خواب اپنی تعمیر بد کے ساتھ رونا ہوئے۔

طوفان افتراق | آل پارٹیز کانفرنس کے برخاست ہو جانے کے بعد پھر ہندو مسلم زعماء میں سخت اختلاف رونما ہوا!

بلا استثناء تمام ہندوؤں نے نہرو رپورٹ کی تائید کی، ہاں سبائیوں نے بھی اور کانگریس نے بھی، لالہ لاجپت رائے، پنڈت مالویہ، ڈاکٹر مونجے، سب ہی حمایت کے جوش میں سرگرم کا نظر آئے تھے، مگر مسلمانوں میں اشارۃ اللہ نا اتفاقی کا مرض

پھیلا ہوا تھا، ان میں فوراً اسی آل پارٹیز کے اندر دو ٹکڑے ہو گئے اور اختلافات کا بازار گرم ہو گیا، مزے لے لے کر ایک لیڈر دوسرے لیڈر کی ذات پر، نیت پر اور اخلاق و عادات پر حملے کر رہا تھا، اور اسے شعرا اسلامی اور معیار تہذیب سمجھ رہا تھا، اکبر نے شاید اسی موقع کے لئے فرمایا تھا۔

آپس میں گالیاں ہیں غیر میں تالیاں ہیں،
چنانچہ ہم میں گالیوں کا تبادلہ ہوتا رہا اور اغیار تالیاں بجا بجا کر ہمارے اس افتراق و اختلاف کا تماشہ دیکھتے رہے۔

صفائی | ان اختلافات کے بعد نہرو رپورٹ کے ہندو حامی تو تقریباً سب خاموش ہو گئے، مگر اکثر مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود اس کے منظور ہو جانے سے مسلمانوں میں ایک زبردست اختلاف ہو گیا۔

ان مسلمانوں نے جو نہرو رپورٹ کے وضعین میں تھے، یا حامی تھے اپنی زبان و قلم کو اس کی حمایت کے لئے وقف کر دیا۔

نہرو رپورٹ کی حمایت میں ہمیشہ دیل یہ پیش کی جاتی تھی کہ وہ کوئی صحیفہ آسمانی نہیں ہے جس میں تغیر و تبدل نہ ہو سکے وہ انسانوں کا بنایا ہوا ایک دستور اساسی ہے جو تقاضا مساوی سے پاک نہیں ہو سکتا، اس میں یقیناً غلطیاں ہوں گی، آپ کا یہ فرض ہے کہ ہمیں بتائیں اور ہم سے ان غلطیوں کی تلافی کرائیں۔

اتحاد و اتفاق کی یہی صورت ہے کہ ایک دوسرے کی غلطیوں کو نظر ہر کرے اور اصلاح چاہے۔

لیکن | لیکن جب مخالفت گروہ کہتا تھا کہ نہرو رپورٹ میں یہ تقاضا مساوی

ہیں، ان ان دفعات کے باعث مسلمانوں کے حقوق کو نقصان پہنچا ہے، اور ان اصولوں کے ذریعہ ان کی اکثریت کو ہمیشہ کے لئے اقلیت میں تبدیل کر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ انہیں بدلوائے، تو رپورٹ کے حامی ان دعوؤں کو کسی طرح تسلیم نہیں کرتے تھے اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ رپورٹ میں ترمیم کی کوئی صورت نہ نکلتی تھی۔

نتیجہ | بہر حال اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان زعماء اور ہندو زعماء میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا، اور مسلمانوں میں بھی ایک جنگ شروع ہو گئی۔

نہرو رپورٹ کی حمایت پر کانگریس تھی، لیکن حضرات تھے، ہندو ہمسایہ تھے، مسلمانوں کی ایک جماعت تھی۔

مخالفین میں مسلمانوں کی اکثریت نہیں تھی اور کچھ بھی اپنے فتنے کی اغراض کی بنا پر شدت سے مخالفت کر رہے تھے۔

مقابلہ | اب جو شدید جنگ چھڑی وہ ملک کے لئے عموماً، ہر فرقے، ہر جماعت، اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً نہایت مضرت ثابت ہوئی، ہر لیڈر مسلمانوں کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ جتنے جملے، جتنی تفسیریں، اور جتنے مضامین کا اس زمانے میں غلغلہ ہوا، کم کسی اور زمانے میں ایسا دیکھا گیا۔ اس معاملہ میں جو افسوسناک اختلافات پیدا ہو گئے تھے وہ آج تک نہیں ملے۔

گاندھی جی کی حیات | اس وقت تک گاندھی جی خاموش تھے، حتیٰ کہ وہ لکھنؤ کی آل پارٹیز کانفرنس تک میں شریک نہیں ہوئے، اس لئے کہ وہ اپنی آواز کو بے اثر، اور اپنے آپ کو معذور سمجھ رہے تھے، یہی وجہ تھی جو دہلی کی پہلی یونٹی کانفرنس کے بعد پھر کسی ”ملاپ کانفرنس“ اور ”آل پارٹیز کانفرنس“ میں باوجود منت سماجت کے بھی

نہیں شریک ہوئے، لیکن نہر رپورٹ کے منظور ہونے کے بعد انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور میدان عمل میں اس رپورٹ کے حامی کی حیثیت سے آگئے۔

ہندوؤں کا سکوت | اس کا سب کو احساس تھا کہ مسلمان من حیث القوم نہر رپورٹ کے ماننے کو تیار نہیں ہیں، اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جس نے کانگریس میں شریک ہو کر اسے بہت قوت پہنچائی اور جس نے اس خلیج کو جو ہندو مسلمانوں میں غدر کے بعد سے چلی آرہی تھی، کم کیا، اور رفتہ رفتہ بالکل ختم کر دیا، علیحدہ ہو گیا ہے، اور اس کی علیحدگی کانگریس کے مقاصد کے لئے بھی کسی طرح سودمند نہیں۔

باوجود اس احساس کے کوئی موثر تدبیر ایسی اختیار نہیں کی گئی کہ عام مسلمانوں کو جو بدظنی اور بے اعتمادی کانگریس کی طرف سے پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو جائے اور ہندو مہاسبھا نے تو قوم پرستی کی آڑ میں مسلمان لیڈروں کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔

محمد علی کا اختلاف | ان حالات کو دیکھ کر، اگر محمد علی کی مخالفت میں کوئی کمی نہیں ہوئی تو کوئی تعجب کی بات ہے؟ اُس نے بار بار صلح و امن کی خاطر بے قصور مسلمانوں کو ڈانٹا، فسادات کے موقع پر خواہ ان کی خطا ہو یا نہ ہو مسلمانوں کو اُس نے ملامت کی نازک سے نازک مواقع پر ریب کانگریس کا اثر ہندو مہاسبھا اور تبلیغ نے زائل کر دیا تھا، اور بڑے بڑے لیڈر گوشہ نشین ہو کر بیٹھ رہے تھے، اس وقت اُس نے کانگریس سے وفاداری کی، اپنوں کی گالیاں کھائیں لیکن کانگریس سے بگاڑ نہیں کیا، تو کیا اس شخص کے ساتھ اخلاقاً کم از کم اگر کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا تو یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ محض دکھانے کے لئے، جھوٹ موٹ، پالیسی کے طور پر دو ایک ہندو اُس کے ساتھ ہو جاتے، تو اس

۳۷۴

غریب کا دل تو نہ ٹوٹتا، لیکن ایسا کب ممکن تھا۔

واں وہ غرور عز و نازیاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں وہ ملے کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں؟

باب ۴۲ کلکتہ کانگریس

آل پارٹیز کانفرنس کے برخواست ہونے کے بعد نہرو رپورٹ قبول کرانے کی پوری کوششیں کی گئیں، پھر کانگریس کے سالانہ جلسہ کا وقت آیا، اور اس کے انتظامات شروع ہو گئے۔

کلکتہ کا انتخاب | کانگریس کے سالانہ جلسے کے لئے کلکتہ منتخب کیا گیا، اور صدارت کے لئے پنڈت موتی لال نہرو کا انتخاب ہوا، اور طے پایا کہ اس اجلاس میں آزادی یا بالفاظ دیگر ”ڈومینین سٹیشن“ کا سنگ بنیاد رکھا جائے گا، اور اگر اس معاملہ میں گورنمنٹ کی طرف سے قراخ حوصلگی کا اظہار نہ ہوا، تو پھر ہم دوسری صورت پر غور کریں گے۔

خلافت کانفرنس | دسمبر ۱۹۳۰ء ہی میں خلافت کانفرنس کے انعقاد کے انتظامات بھی کئے گئے، اس کا مقام بھی کلکتہ قرار پایا، صدارت کے لئے مولانا محمد علی تام صوبہ خلافت کمیٹیوں کے اتفاق سے منتخب ہوئے۔

مسلم لیگ | مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھی انہیں تاریخوں میں کلکتہ ہی میں قرار پایا، اور سر ہاراج صاحب محمود آباد، مسٹر جناح کی پر خلوص ماسعی کے سبب اسکے صدر قرار دیئے گئے۔ غرض ہندوستان کی تمام قابل ذکر انجمنوں کے سالانہ اجلاس وہیں ہوئے، اور عجیب عجیب صورتیں بن بن کر بگڑیں، جن کی تفصیل آگے آتی ہے اور چونکہ حسن اتفاق سے ندوہ سے راقم الحروف بھی اس ”قومی میلہ“ کی سیر کو کلکتہ پہنچ گیا تھا، اس لئے اکثر

واقعات چشم دید ہی ہونگے ،

کنونشن | مسلمانوں کی سپیم چیج پکار، اور مسلسل جدوجہد کا نتیجہ نکلا کہ صدر کانگریس نے اعلان کیا کہ وہ اسی زمانہ میں ایک ”نیشنل کنونشن“ کا اجلاس بھی وہاں منعقد فرمائینگے، تاکہ ایک پھر طے شدہ تجاویز پر غور کیا جاسکے اور نہرو رپورٹ پر ایک نظر ڈالی جاسکے اور اختلافات رفع کئے جاسکیں، کنونشن کے متعلق بڑی امیدیں تھیں کہ اس اجلاس میں یقیناً تمام شکایتوں کا ازالہ ہو جائے گا، اور اتفاق کی کوئی صورت نکل آئیگی،

محمد علی کی شرکت | محمد علی گوکانگریس میں نہیں شریک ہوئے، مگر کنونشن میں شریک ہوئے تھے،

کنونشن میں تمام انجمنوں کو نمائندہ منتخب کر کے بھیجنے کی اجازت دی گئی تھی مگر خلافت کمیٹی اور جمعیتہ العلماء ہند نے متفقہ طور سے اپنا نمائندہ صرف محمد علی کو بنایا، اور وہ اس میں شریک ہونے کے لئے تشریف لائے،

فضا | اس وقت کنونشن میں عجیب و غریب فضا تھی، محمد علی گوکانگریس کے بڑے مربیوں اور سرپرستوں میں تھے، اور ابھی صرف چند روز سے انھیں اختلاف ہوا تھا، مگر حضار مجلس کو یہ بھی ناپسند ہوا، انھیں تباہی تھیں کہ دل میں کیا ہے؟

مباحثہ کا آغاز | مباحثہ کا آغاز ہوا، اور غالباً سب پہلے ”ڈومینین سٹیٹس“ کے اصول پر ہوا کہ آیا اسے قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ اجلاس میں ہر قسم کے لوگ تھے، آزاد خیال بھی، معتدل بھی، کانگریسی بھی، اور سوراچی بھی، ترک تعاون کے علمبردار بھی، اور حامی موالات بھی،

مشرین گپتا کی تقریر | مشرین گپتا اس اصول کے حامی تھے کہ ”ڈومینین سٹیٹس“

کو قبول کر لیا جائے، چنانچہ اسپر انھوں نے ایک تقریر بھی کی، کہ اگر اسے ایک ”درمیانی منزل“ تسلیم کر لیا جائے، تو کیا مضائقہ ہے اسکے بعد پھر ہماری منزل مقصود آزادی ہوگی اور ہم پھر اسی کی طرف بڑھینگے،

محمد علی کی مخالفت | محمد علی نے ایک تقریر کی، اس نظریہ کی مخالفت کی آزادی کامل کی حمایت کی، اور اسپر زور دیا کہ ابھی گزشتہ اجلاس کانگریس میں ”آزادی کامل“ کی جو تجویز پاس کی جا چکی ہے، اور جسے اپنا آخری نصب العین بنایا جا چکا ہے، اسے ہرگز نہ بدلا جائے اور کامل آزادی ہی کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھی جائے

تقریر کی رو میں کہیں اُنکے منہ سے یہ بھی نکل گیا کہ جو لوگ آزادی کامل کے مفاد و درجہ مستعمرات کے حامی ہیں، وہ ملک کے بہادر فرزند نہیں ہیں، بلکہ بزدل coward ہیں،

ہنگامہ | اس لفظ کا اُنکے منہ سے نکلنا تھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، لغو اور مہمل شور و غوغا کی اتنی افراط ہوئی کہ کان پڑی بات نہیں سُنائی دیتی تھی، اور برابر مطالبہ کیا جاتا تھا کہ ”محمد علی بیٹھ جاؤ“ ”بیٹھ جاؤ“ ہم نہیں سُننا چاہتے،

محمد علی کو اس قسم کے پست اختلافات سے ساری عمر سابقہ رہا تھا، وہ اس سُننا سے متاثر کیوں ہوتے؟ انھوں نے اپنی تقریر جاری رکھی، اور ڈومینین سٹیٹس کی سخت مخالفت کی اور اسے ملک کے لئے ہلک قرار دیا،

انکی تقریر کے بعد دوسرے بزرگوں نے اسی موضوع پر تقریر کی، اور ان کے نظریہ کی مخالفت اور درجہ مستعمرات کی حمایت کی،

مغرب کی نماز | مباحثہ ابھی اسی موضوع پر جاری ہی تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت

آگیا، اور محمد علی مغرب کی نماز پڑھنے باہر چلے گئے،
تھوڑی دیر کے بعد وہ نماز پڑھ کر واپس آئے تھے، لیکن ابھی ڈالس پر نہیں پہنچے تھے،
ہال کے اندر تھے کہ کسی نے ان سے کہہ دیا کہ درجہ مستعمرات تو پاس ہو گیا، اور اوس پر مباحثہ
بھی ختم ہو گیا،

یہ سنتے ہی محمد علی نے انا اللہ ڈھکا، اور اٹے پاؤں واپس آگئے، پھر انھوں نے
اسکے بعد کنونشن میں شرکت نہیں کی، اگرچہ زور بہت ڈالا گیا،

خلافت کانفرنس | ہائیڈے پارک میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی، خلافت کمیٹی
کے خلاف جو پروپیگنڈا کیا گیا تھا اسکا اقتضا تو یہ تھا کہ خلافت کمیٹی میں حاضرین کی تعداد
بہت کم ہوتی، لیکن ایسا نہیں تھا،

پورا پنڈال حاضرین سے بھرا ہوا تھا، اور تمام ہندوستان سے مندوبین کی
بڑی تعداد شریک اجلاس ہوئی تھی،

تحریک و تائید کے بعد محمد علی نے اپنا زبانی خطبہ صدارت شروع کیا، اسلئے کہ وہ
اسی زمانہ میں ممالک اسلامیہ اور یورپ کے سفر سے واپس آئے تھے اور جب سے آئے
برابر جلسے اور جلوس کی شرکت میں انکا وقت گزرتا رہا، اتنی جہلت انھیں کہاں مل سکتی تھی
کہ وہ باقاعدہ اپنا خطبہ صدارت تیار کرتے؟

خطبہ صدارت | چنانچہ وہ تقریر کرنے کیلئے کھڑے ہوئے، اور اتنی مؤثر اور
دلنشین تقریر فرمائی کہ سارا مجمع مسحور ہو گیا، بار بار اللہ اکبر، اللہ اکبر کے دلنواز و روح افزا
نعرے بلند ہوتے تھے،

اپنے خطبہ صدارت میں انھوں نے پہلے تو اپنے عالم اسلامی کے تاثرات بیان

کئے، پھر اسکے بعد انھوں نے سیاسیات وطنی پر ایک مفصل تنقید کی، اور نہرو رپورٹ پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا، اور اپنی علیحدگی، اور کانگریس سے عدم تعاون کے لباب و علل بتائے،

اسبابِ علل | اسبابِ علل وہی تھے، جو اس کتاب میں مختلف مواقع پر مختلف عنوانات کے ماتحت بتائے جا چکے ہیں

یعنی ہندو زعماء کا تغافل، برادرانِ وطن کی چیرہ دستیائیں، اپنی کوششیں، خود مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے اختلاف، مسلمان لیڈروں سے لڑنا، مسلمانوں کو تبلیغ و تنظیم کے ذریعہ سے نجات دلوانا،

اور پھر ہندوؤں کا یہ طرزِ عمل کہ صوبہ سرحد کی اصلاحات کی مخالفت کرنا، کتاب راج پال پر خاموش رہنا، ”تجاویزِ دہلی“ کو منظور کرنا، اور متعذبات منظور کرنا، اور پھر نہرو رپورٹ کی صورت میں نامنظور کر دینا، مسلمانوں کے مسلسل اور پیہم احتجاج کے باوجود، کوئی کوششِ صلاح و تدانی کی نہ کرنا، اور اپنا نصب العین یعنی ”مکمل آزادی“ بدل کر مستعمرات کو منزل مقصود بنا لینا، ان تمام چیزوں کو انھوں نے اپنی چار پانچ گھنٹہ کی سلسلِ تقریر میں نہایت غبی سے حاضرین کے ذہن نشین کر دیا، اور اعلان کر دیا کہ کانگریس سے اس وقت تک تعاون ناممکن ہے جب تک ”وہ تجاویزِ دہلی“ نہ منظور کر لے اور نہ منظور کرے تو اس سے ہماری جنگ ہے اور اگر منظور کر لے، تو پھر اسی طرح اشتراکِ عمل کرنے پر آمادہ اور تیار ہیں جس طرح گزشتہ تحریک میں ہم نے کیا تھا،

جمع پرائز | کلکتہ اسوقت مخالفت کا مرکز بنا ہوا تھا، وہاں کانگریس کا جلسہ ہو رہا تھا، اور دوسرے زعماء کلکتہ ہی میں مقیم تھے جو محمد علی کی رائے سے سخت اختلاف رکھتے تھے اور

جبکا انر بھی کلکتہ میں بہت بیان کیا جاتا ہے اسلئے کہ کلکتہ کی امامت واقدا بھی انہیں کے ہاتھوں میں ہے،

اسکے علاوہ محمد علی کے دوسرے رفقا جنہوں نے اپنی کارگزاری، اپنے اثبات اپنے خلوص، اور صداقت سے کلکتہ پر خاصہ اثر قائم کر لیا تھا مثلاً اکرم خاں صاحب غیرہ، یہ سب محمد علی سے مخالف رائے رکھتے تھے، اور انہیں چاہتے تھے کہ نہرو رپورٹ نامنطور ہو جائے، اسلئے جلسہ میں اگر کسی قسم کا ہنگامہ ہوتا تو وہ کوئی تعجب خیز بات نہ ہوتی، یا اگر کسی ایسی تجویز سے جبکا تعلق کانگریس کی مخالفت سے ہوتا، کوئی مخالفت کرتا، تو بھی کوئی حیرت کرنے کی جگہ نہیں تھی،

پھر جس جلسہ میں ۸-۹ ہزار آدمی ہوں وہاں ہر طبقہ، ہر خیال، ہر ذہنیت، اور ہر رائے کے افراد ہوتے ہیں ”ملت واحدہ“ وہ نہیں ہوتے ہیں، اصول میں اگر اتفاق بھی ہوتا ہے، تب بھی بعض فروعات میں اختلاف ہوتا ہے اور اسکے لئے صدر کو ترسیوں کا نوٹس دیا جاتا ہے، تقریریں ہوتی ہیں، یہ سب کچھ ہوتا ہے، اور ہونا چاہئے،

مگر خلافت کانفرنس کے اس جلسہ میں یقین کیجئے کہ ایک آواز بھی مخالفت میں نہیں اٹھی، ہر شخص آمنا و صداقتاً کہہ رہا تھا،

بہر حال کانفرنس ہوئی، اور نہایت شاندار طریقہ سے ختم ہوئی، اور اس نہرو کے مجمع میں نہ کسی نے مخالفت کی، نہ ہنگامہ بپا کرنے کی کوشش کی، سب نے عقیدت و محبت کے ساتھ اپنے زعم کے ارشادات کو سنا اور اپنے عمل پر ابھی ہوئے،

دوسرے حالات | اب یہ عنوان ختم ہو جانا چاہئے تھا، مگر اجمالی طور سے ایک بات کا تذکرہ ضروری ہے،

ایک اعتراض | بڑی شد و مد سے محمد علی اور اُن کے رفقا پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھیں کنونشن میں اپنے مطالبات پیش ضرور کرنے چاہیے تھے، اگر وہ ایسا کرتے تو بہت بڑی امید تھی کہ مطالبات منظور ہو جاتے اور یہ اختلاف و افتراق وہیں ختم ہو جاتا مگر چونکہ محمد علی نے پھر شرکت نہیں کی اسلئے اختلاف کی خلیج اور زیادہ وسیع ہوتی گئی،

بادی النظر میں یہ اعتراض وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن بہ تامل خفیف حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ محمد علی نے جو کیا وہی اچھا تھا، ڈومینین سٹیٹس پر کنونشن میں اُن کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کیا گیا وہ ایسا نہیں تھا کہ کوئی خوشگوار امید قائم کرنے میں مدد دیتا،

اسکے علاوہ اختلافات کے آغاز سے اس وقت تک ہندو زعماء کا جو بے نیازانہ طرز عمل ہو گیا تھا، وہ بھی ایک خود ادا اور شریف آدمی کو ”طواف کوئے ملامت“ کی اجازت نہیں دے سکتا تھا،

مسلم لیگ کی شرکت | یا ان سب باتوں کو چھوڑ دیجئے، اسپر آئے کہ، مسلم لیگ نے اپنے اجلاس تک نہرورپورٹ کی کوئی مخالفت نہیں کی، مسٹر جناح جو لیگ کی کونسل کے صدر تھے، اس وقت تک بالکل خاموش رہے، ایک حرف بھی انھوں نے مخالفت میں نہیں کہا، مسٹر چھپاگلا، لیگ کے دوسرے سرگرم رکن آل پارٹیز میں شریک تھے، پھر نہرورپورٹ کی حمایت میں انھوں نے سخت جدوجہد کی تھی اور مسلمان قوم کی مخالفت مول لی تھی،

ہمارا جمہور آباد، رپورٹ کے سخت ترین حامی تھے، انھیں کی کوششوں سے آل پارٹیز کا اتنا شاندار جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہو سکا اور انھیں نے مسلم لیگ کی کرسی صدارت پر محمد علی کے مقابلہ میں محض اسلئے فتح حاصل کی تھی کہ وہ نہرورپورٹ کو مسلمانوں سے منسوب نہیں

سر علی امام بھی نہرورپورٹ کے بڑے حامی تھے، اور انھوں نے بھی صرف اسی حمایت کے سلسلہ میں مسلمانوں کی بڑی مخالفت اٹھائی،

ان سب حایموں نے اپنے دوسرے رفقا اور شرکار کا ایک قافلہ مرتب کیا اور وہ مسٹر جناح کی سرکردگی میں کنونشن کے آخری اجلاس میں پہونچا، اور تجاویر و ھلی، کنونشن کے سامنے منظوری کے لئے پیش کیں،

مسٹر جناح کی تقریر | مسٹر جناح نے ایک بہت موثر تقریر کی، اور اپیل کی کہ محبت و اخوت کے جذبات کیساتھ ان تجاویر پر غور کیجئے، اور انھیں منظور کر کے اختلافات کا خاتمہ کر دیجئے کہ قوم کی ضروریات کا تقاضا یہی ہے،

جیکر کی تقریر | جناح کے بعد جیکر نے تقریر کی اور ان کے خیالات کا تارپود بکھیر کے رکھ دیا۔ دوٹو جیسے گئے، تو مسٹر جناح کو شکست اور مسٹر جیکر کو فتح ہوئی، گو سر تیج بہادر نے کوشش کی کہ ایسا نہ ہو مگر روک کون سکتا تھا؟

مسٹر چھاگلہ کا بیان | چنانچہ مسٹر چھاگلہ خبکا ذکر آچکا ہے، اور جو آج تک بہت بڑے قوم پرور ہیں، اس واقعہ شکست سے اتنے متاثر ہوئے کہ ۸ جنوری ۱۹۴۷ء کو ایسوسی اٹنڈ پریس کو ایک بیان دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا،

”کنونشن کے اجلاس کے سامنے لیگ کی نمایندگی اسلئے کی گئی تھی کہ مسلمان چند ضروری ترمیمات کے بعد نہرورپورٹ کو منظور کر سکیں گے، میں نہایت افسوس کھیتا اس امر کا اعادہ کرتا ہوں کہ کنونشن کو مسلم مطالبات پر نہایت فراخ دلی سے غور کرنا چاہئے تھا بجائے اسکے وہ ہندو مہا بھاس کے زیر اثر اور اسکی دھکی میں انگریز صورت اختیار کرنا،

میں یہ مظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ کے نمائندوں کی اکثریت کنونشن کے اجلاس میں شریک ہوئی تھی اور جنہوں نے مسلمانوں کے جائز مطالبات کو پیش کیا تھا نہرو رپورٹ کے حامیوں میں سے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے نہ صرف اپنی ملت کے ساتھ جنگ کی بلکہ اپنی جماعت کے (مسلم لیگ) محض نہرو رپورٹ کی تائید کرنے کے سلسلہ میں اہل حاصل کی اگر کنونشن ان ۳۳ منتخب نمائندوں کیساتھ کسی امر پر گفتگو کرنے سے قاصر ہو تو سمجھنا چاہئے کہ وہ ہندوستان کے کسی مسلمان سے بھی فیصلہ کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا، اگر ان ۳۳ نمائندوں کو فرقہ پرست سمجھ کر ان کے ساتھ یہ ویہ اختیار کیا گیا تو سمجھ لو کہ ہندوستان میں ایک بھی مسلم قوم پرور موجود نہیں، جس طرح مسلم لیگ نے شفیق سیکشن کو علیحدہ کر دیا، اور سطح اسے ٹینہ کی اس تجویز کو جو علی برادران نے تیار کی تھی رد کر دیا، یا آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں اپنی نمائندوں کے بھیجنے سے انکار کر دیا، اس طرح کنونشن کو بھی چاہئے تھا کہ بہادری کیساتھ معجزے اور جیکار کیساتھ بھی یہی عمل درآمد کرتا، جو اجلاس کنونشن میں لفظ بلفظ دھکی دے ہے تھے کہ وہ اجلاس چھوڑ کر چلے جائینگے،

مشرعہ چاکلہ یہ بیان دینے کے بعد بھی وفادار ہے، لیکن مٹرخاج دل بڑاشتہ ہو گا اور نہرو رپورٹ کے مخالف، اسی سلسلہ میں ان سے اور پنڈت موتی لال نہرو سے اسمبلی میں ایک پچپ جھڑپ بھی ہوئی تھی جسکی تفصیل سے یہاں احتراز کیا جاتا ہے،

بہر حال یہ اسباب تھے جنہوں نے محمد علی جناح کے علاوہ محمد علی جوہر کو بھی مایوس کر دیا اور وہ بھی بادل خواستہ۔ لے تری نرم سے ناچار پہلے جلتے ہیں۔ کہتے ہوئے کنونشن سے نکل گئے اور پھر نہ گئے،

محمد علی کا بیان | اس باب کے ختم کرنے پر پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کنونشن اور اسکے متعلقہ بات
محمد علی کے جو تاثرات ”رودادِ چین“ کے عنوان سے ہمدردی میں شائع ہوئے تھے انکا بھی ایک
خاص حصہ پیش کر دیا جائے،
وہ فرماتے ہیں، آج کل

”دیارِ غیر سے زیادہ خود اپنے وطن میں غریب الوطن ہوں، انھیں زبانوں سے جسے آج اپنی ہجو
سُن رہا ہوں، اپنی تعریف میں ہزاروں تھیسے بھی سُن چکا ہوں، ہمارے قید ہوتے ہی ہندو ہا
بھائی ہمارے سرنے ہاتا گاندھی اور عدم تعاون کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، خود ہاتا گاندھی
نے حکومت کو اٹنی ٹیم دے چکنے کے بعد اردولی میں ہر روش اختیار کی جس کو ملے ہتھیار ڈال
دینے کے مرادف سمجھا، اور وہ خود بھی ہماری طرح قید کر دئے گئے، انکے قید ہونے کے بعد پنڈت
موتی لال نہرو اور پیش بندھواس آزاد ہوئے، اور بجائے سول فرانسی شروع کر نیکی، جس کا
یادش بخیر! اب پھر کلکتہ میں نام لیا گیا ہے، گیا میں سراج پارٹی کے نام سے علم بغاوت بلند
کیا جس نے عدم تعاون کی تحریک خاتمہ کر دیا، پھر لطف یہ کہ ہندو ہا بھائیوں نے شدھی اور گھٹن
کی تحریکیں شروع کیں جنھوں نے ان مذہبی تعصبات کی آگ کو پھر بھڑکا دیا جنھیں ہم ٹھنڈا کر چکے تھے
۱۱۔ البتہ کہ بواب میں مسلمانانِ پنجاب کے اسی عنصر نے تبلیغ و تنظیم کے نام سے زبانی جمع خرچ
دکھانا شروع کیا جو آج وطن پرستی اور ملت شکنی کا ڈھول بجا رہا ہے

نہ ہم نے ڈاکٹر مہرجے، مسٹر آنے، اور مسٹر کیلکر کی طرح ہاتا گاندھی کے خلاف اس بغاوت میں
حصہ لیا تھا جو بالآخر پنڈت موتی لال کے خلاف بھی جو ابی تعاون کے لاجواب نام سے ظاہر ہوئی
نہ ہم نے کیا میں اس تحریک کے خلاف پنڈت موتی لال اور انکے سوراہی ساتھیوں کی طرح
علم بغاوت بلند کر کے حصہ لیا، نہ پنڈت من موہن مالویہ، رسومی شردھانند کی طرح ہندو
ہا بھائی قائم کردہ گھٹن اور شدھی کی تحریکوں میں حصہ لیا، اور نہ ڈاکٹر کچلو اور انکے گھٹن

کی طرح تبلیغ و تنظیم کے نام سے اپنا ڈھنڈہ وراٹا، آج بھی حضرات کلکتہ کی تماشا گاہ ہیں اپنا سوانگ بھر رہے ہیں،

پنڈت موٹی لال نہرو اور ان کے ساتھیوں کو کونسلوں اور اسمبلی کی شرکت سے کچھ سو راج دلو یا وہ ہمارے سامنے ہر اس شرکت میں پنڈت جی کو جو آج کانگریس کے صدر ہیں اتنا اصرار تھا کہ انھوں نے خود مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر کانگریس اس شرکت کی اجازت دی تو یہ کانگریس کے گرد گرد و دو میل کے احاطہ میں بھی قدم نہ رکھوں گا، مینے اس خیال کو طوعاً و کرہاً اپنی پارٹی کو آج کے خطبہ کانگریس کنونشن کو اجازت دلوائی کہ کہیں سو دو میل سے نکل کر ہاتھ کا گاندھی مجھے شکایت نہ کریں کہ تم نے کانگریس کو اتنی بڑی اقلیت کو کیوں نکلوا دیا، ورنہ دہلی اور کوکنا ڈا میں موتی لال جی کو شکست فاش نصیب ہوتی،

ہاتھ کا گاندھی جب جیل سے چھوٹے تھے تو انھوں نے اخبارات کو فیصلے سے میرا نام ایک پیغام ارسال فرمایا تھا جس میں اشارہ کیا تھا کہ جو تفریق ہندو مسلمانوں میں پڑ گئی ہو اس کے مٹانے ہی کو تم اپنی صدر کانگریس میں کامیاب سمجھے جا سکتے ہو، مینے اس تفریق کو مٹانے میں جیکیا اس کا فیصلہ خدا ہی پر چھوڑا ہوں ہاتھ کا گاندھی نے کوہاٹ کی نزاع کی خبر سننے ہی ہم کو خاص طور سے خطاب کرتے ہوئے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو ظالم اور ہندوؤں کو مظلوم سمجھتے ہیں اس کے بعد تو انھوں نے ہندو مسلم تنازعات اور منافقانہ کو چکھنے کا کام ہی بند کر دیا اور جب کبھی ان سے ہم دونوں بھائیوں کا کٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر محمود، یا اور کسی نے اس بارہ میں عرض کیا تو انھوں نے انہیں حصہ لینے سے انکار فرمایا، اور اس کام کو کلیتہً خدا ہی پر چھوڑ دیا،

یہ تھے وہ اسباب دہل چکی بنا پر محمد علی کنونشن سے بیزار ہوئے، کانگریس سے مایوس ہوئے اور بالآخر۔

نئے پیروی قیس نہ فرما د کریں گے ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے
کہکراؤ انھوں نے دوسرا ”طرز جنوں“ ایجاد کیا، جو سب کو معلوم ہے،

باب ۳۴

آل مسلم پارٹیز کانفرنس دہلی

کانگریس سے اور کنونشن سے جب یابوسی ہو گئی تو جنوری سہ ماہ میں محمد علی اس پر
ہو گئے کہ وہ مسلمانوں کی ایک ”آل پارٹیز کانفرنس“ منعقد کریں جس میں تمام جماعتوں کے
نمائندے شریک ہو کر اپنا لائحہ عمل مرتب کریں اس لئے کہ

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم کاہے کو میر کوئی فیہ جب بگڑ گئی
محمد علی کانگریس کے تھے اور کانگریس کا سارا زور شور محمد علی کی ”حدی خواہیوں“
سے قائم تھا، اب کانگریس نے اپنے طرز عمل سے انھیں پسے طور سے یابوس کر دیا تھا اور
جہان تک اسکان میں تھا ان کی اس بغاوت کی سزا بھی دیدی گئی تھی۔

سزا یعنی کلکتہ کانگریس میں جب اس کی ”مجلس عاملہ“ کے ارکان کا انتخاب ہو رہا تھا تو
مدرس اس کے ایک صاحب نے بدستی سے محمد علی کا نام بھی پیش کر دیا، جو اب تک اس کے ممبر
چلے آتے تھے، نام منظور تو کا ہے کو ہوتا، مگر پھر اس پر بھی ”نہیں، نہیں“ کے شور نے ”گرمی
محفل“ کا سامان ضرور پیدا کر دیا تھا۔

لیکن محمد علی نے یہ روش خود نہیں رکھی بلکہ ۲ جنوری سہ ماہ کے ہمدردوں میں یہ خبر شائع
ہوئی۔

”مؤاخر انصاری، سر علی امام، مہترن امام، مولانا ابوالکلام آزاد اور اسی طرح
بہت سے زعماء کو خاص طور پر دعوت دی گئی“

اگرچہ ان زعماء میں سے کوئی بزرگ تشریف نہ لائے لیکن کارکنان نے اپنے خیال کے مطابق اتمام حجت کر لیا۔

انتظامات | بہر حال ان ہنگامہ آرائیوں کے بعد دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے انتظامات شروع ہو گئے جسکو بہ کونسلوں اور اسمبلی و کونسل آف اسٹیٹ اور دوسری انجمنوں کو اطلاع دیدی گئی کہ وہ اپنے اپنے نمائندہ منتخب کر کے جلد سے جلد دہلی بھیج دیں۔

صدارت | صدارت کے لئے قرعہ فال سر آغا خاں کے نام پڑا، جنہوں نے ازراہ عنایت اسے قبول بھی فرمایا، اور فوراً دہلی تشریف لائے۔

شرکار | کونسلوں اور اسمبلی و کونسل آف اسٹیٹ کے علاوہ مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے مندوبین بھی شریک تھے اور خوشی کی بات ہو کہ اس مجلس میں جمعیۃ علماء ہند دہلی کے سربراہ اور وہ ارکان بھی موجود تھے، مثلاً مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب اور دوسرے حضرات۔

سرتشیع کا دعویٰ | سرتشیع نے کانفرنس کے اس اجلاس میں باہل صحیح دعویٰ کیا کہ یہ کانفرنس پوری نمائندہ ہو اس لئے کہ جس کانفرنس میں علی برادران شریک ہوں اور جمعیۃ علماء کے محترم بزرگ رونق افروز ہوں وہ سیاسی اور مذہبی دونوں نقطہ ہائے نظر کی صحیح طور سے نمائندہ کہی جاسکتی ہے۔

بڑا مرحلہ | کانفرنس میں سب سے بڑا مرحلہ یہ درپیش تھا کہ کانفرنس کا نصب العین کیا ہو بہر شفیق اور ان کے ہمنوا حضرات کا جہان تک تعلق تھا وہ تو اس پر بھی راضی ہو سکتے تھے کہ ”سین اسٹیٹس“ بھی نہ رکھا جائے، مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کم از کم ”درجہ ستعرات“ کے طلبگار ضرور تھے، ان کے ذوق کی رعایت بھی ضروری تھی اور ایسا ممکن بھی تھا لیکن سب سے زبردست

مرحلہ یہ تھا کہ محمد علی کمال آزادی کے علمبردار تھے! اور یہ وہ چیز تھی جسے کانفرنس میں بطور نصب العین کے پیش ہی نہیں کیا جاسکتا اور یہ فرض اگر ایسا ہوتا بھی ہو تو سر آغا خاں دہلی میں نہ نظر آتے نہ شفیق کی یہ سرگرمیاں ظاہر ہوتیں، نہ مسلم لیگ کے سیاست دان بزرگ اس پلیٹ فارم پر تشریف رکھ سکتے تھے اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ محمد علی اس ”درمیانی راستہ“ کو قبول کر سکتے، یہ ایک مسئلہ ایسا آن پڑا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں کانفرنس ہی نہ ختم ہو جائے۔

حکمت علی | آخر بڑے غور و فکر کے بعد یہ قرار پایا کہ کانفرنس اپنا کوئی خاص نصب العین نہ مقرر کرے اور جو جماعتیں اس کے ساتھ اشتراک عمل کر رہی ہیں ان پر نصب العین کے بارے میں کوئی پابندی کسی قسم کی نہ عاید کی جائے، یعنی اگر مسلم لیگ ”ڈومنین سٹیٹس“ کی طلبگار ہے تو اسے حق ہو کہ وہ اس کے لئے جدوجہد کرے، اگر جمعیۃ خلافت آزادی کمال کی علمبردار تو وہ اپنی اس مقصد عالی کے حصول کی کوشش کر سکتی ہے، آل پارٹیز کانفرنس کی طرف سے اس پر کوئی پابندی یا کسی قسم کی روک نہیں ہوگی۔

لیکن مسلمانوں کے لائحہ عمل اور موجودہ سیاسی جدوجہد اور ان کے حقوق کا جانتک تعلق ہر وہاں سب جماعتیں جو اس میں شریک ہیں وہ مسلم کانفرنس کے ساتھ اشتراک عمل کریں گی۔
کارروائی | یہ بھی وہ بین بین صورت جس پر محمد علی کا اشتراک عمل حاصل کیا جاسکتا تھا اس مرحلہ صعب کے گزر جانے کے بعد کارروائی شروع ہوئی اور اس میں جو تجویز منظور ہوئی وہ درج ذیل ہے۔

تجویز | سبیکہ ہندوستان کی وسعت اور اس کی نسلی، لسانی، انتظامی، جغرافیائی یا ملکی تقیسات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہندوستانی حالات کے مطابق صرف وفاقی طرز

حکومت ہوجس میں ان ریاستوں کو جو اس وفاقی حکومت کے اجرائے ترکیبی کی حیثیت رکھتی ہوں، کامل خود مختار نہ اور فیصلہ کن اختیارات حاصل اور مرکزی حکومت کو صرف ان امور کے متعلق قطعی اختیارات حاصل ہوں جو مشترکہ مفاد سے تعلق رکھتے ہوں اور جو دستور اساسی کی رو سے خاص طور سے تفویض کئے گئے ہوں۔

اور

جبکہ یہ ضروری ہو کہ کوئی ایسا مسودہ قانون، قرارداد، تحریک یا ترمیم جو بین الملکی معاملات کے متعلق ہو کسی مجلس مقننہ میں خواہ وہ صوبہ دار ہو یا مرکزی پیش نہ کیا جائے، یا زیر بحث نہ لایا جائے، یا منظور نہ کیا جائے، اگر اس ملت سب حق اس کا اثر پڑتا ہو خواہ وہ ہندو ملت ہو یا مسلم ملت، تین چوتھائی ارکان کی اکثریت اس مجلس مقننہ میں اس کے پیش کرنے، اس پر بحث مباحثہ کرنے یا اس کو منظور کرنے کی مخالفت کریں۔

اور

جبکہ مسلمانوں کا یہ حق کہ مختلف ہندوستانی مجلس مقننہ میں جداگنا حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ اپنے نمائندہ منتخب کریں، ملک کا مروجہ قانون ہو اور مسلمان اپوز اس حق سے بغیر اپنی رضامندی کے محروم نہیں کئے جاسکتے۔

اور

جبکہ ان حالات کے ماتحت جو اس وقت ہندوستان میں موجود ہیں اور جب تک یہ حالات موجود رہیں گے مختلف مجالس مقننہ اور دیگر آئینی خود مختار انجمنوں میں مسلمانوں کی نیابت اپنے جداگنا حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ ضروری ہو

ناک حقیقی نمائندہ جمہوری حکومت قائم کی جائے۔

اور

جبکہ اس وقت تک جب تک کہ مسلمانوں کو یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ دستور اس کی
میں ان کے حقوق اور مفاد کی مناسب حفاظت کی گئی ہے وہ کسی صورت میں
بھی اس پر رضامند نہ ہوں گے کہ خواہ مشروط یا غیر مشروط طریقہ پر مخلوط حلقہ کا
انتخاب قائم کئے جائیں۔

اور

جبکہ مذکورہ اصد در مقاصد کے لئے یہ ضروری ہے کہ مسلمان مرکزی اور
صوبائی کامیوں میں اپنا جائز حصہ حاصل کریں۔

اور

جبکہ یہ ضروری ہے کہ مختلف مجالس مقننہ اور آئینی خود مختار انجمنوں میں مسلمانوں
کی نیابت ایک ایسے طریقہ پر مبنی ہو جس سے ان اصولوں میں جہاں مسلمانوں
کی آبادی اکثریت میں ہے، مسلمانوں کی اکثریت میں کسی صورت سے
بھی فرق نہیں آئے گا اور ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے
کسی حالت میں بھی ان کی نیابت اس سہکم نہ ہوگی جو ان کو موجودہ قانون کے
ماتحت حاصل ہے۔

اور

جبکہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندہ جماعتوں نے متفقہ

لے یا اقلیت؟ (مؤلف)

طور پر فیصلہ کر لیا ہے کہ ہندوستان میں بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں کے مفاد کے مناسب تحفظ کی غرض سے مرکزی مجالس مقننہ میں مسلمانوں کو $\frac{1}{3}$ یا $\frac{1}{4}$ فیصدی نیابت کا حق ملنا چاہئے اور یہ کانفرنس اس مطالبہ کی کامل تائید کرتی ہے۔

اور

جیکہ سانی، نسلی، جغرافی اور انتظامی وجوہ کی بنا پر صوبہ سندھ بقیہ احاطہ ملٹی سے کوئی بھی مناسبت نہیں رکھتا اور اس کے باشندوں کے مفاد کے لحاظ سے اس کا غیر مشروط طور پر ایک ایسا علیحدہ صوبہ بنانا جس میں ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح اپنا علیحدہ نظام حکومت اور مجلس قانون ساز موجود ہونا ضروری ہے ہندو قیامت کو اس کے تناسب آزادی سے زیادہ اسی طرح مناسب اور موثر نمائندگی دیدی جائے جس طرح کہ مسلمانوں کو ان صوبوں میں دی جاسکتی ہے جہاں ان کی آبادی اقلیت میں ہو۔

اور

جیکہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اسی طریقہ پر جو ہندوستان کے دیگر صوبوں میں اختیار کیا جائے، آئینی اصلاحات کا نفاذ نہ صرف ان صوبوں کے مفاد کے خیال سے بلکہ بحیثیت مجموعی تمام ہندوستان کی آئینی ترقی کے لحاظ سے بھی ضروری ہے، ان صوبوں کی ہندو اقلیتوں کو ان کے تناسب آبادی سے زیادہ اسی طرح مناسب اور موثر نمائندگی دیدی جائے جس طرح کہ مسلمانوں کو ان صوبوں میں دی جاسکتی ہے جہاں کہ ان کی آبادی اقلیت میں ہو۔

اور

جیکہ انتظام ہندوستان کے مفاد کے لحاظ سے یہ ضروری ہو کہ دستور اساسی میں ایسا بندوبست کیا جائے جس کی رو سے سرکاری اور آئینی خود مختار انجمنوں کی ملازمتوں میں اہلیت کے واجبات کا مناسب لحاظ رکھے ہوئے مسلمانوں کو دیگر ہندوستانیوں کے ساتھ مناسب حصہ دیا جائے۔

اور

جیکہ ہندوستان کے موجودہ سیاسی، معاشی حالات کو مد نظر رکھے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کے دستور اساسی میں مسلمانوں کے تمدن کے تحفظ اور مسلمانوں کی تعلیم، زبان، مذہب، شخصی قانون اور مسلمانوں کے خیراتی ادارات کے تحفظ اور ترقی اور سرکاری امداد میں ان کے مناسب حصہ کے لئے مناسب تحفظ پیش کئے جائیں۔

اور

جیکہ یہ ضروری ہو کہ دستور اساسی میں یہ قرار دیا جائے کہ ہندوستان کے دستور اساسی میں اس کے فساد کے بعد کوئی تغیر و تبدل اس وقت تک نہیں کیا جائیگا جب تک کہ وہ تمام ریاستیں جن پر ہندوستانی وفاقی حکومت (ایڈمن فیشن) مشتمل ہو متفقہ اس کی خواہش نہ کریں گی۔

یہ کانفرنس نہایت زور کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کسی دستور اساسی کو خواہ اس کو کوئی مرتب کرے یا تجویز کرے، اس وقت تک قبول نہیں کریں گے جب تک وہ ان اصولوں کی تصدیق نہ کرے جو اس تجویز میں پیش کئے گئے ہیں۔

یہی وہ ہنگامہ آرا تجویز جو آجنگ ”بدنام“ ہے جسے سر محمد شفیع نے پیش کیا اور شفیع داؤد کی صاحب اسر قبال، سر یعقوب، حاجی عبداللہ ہارون، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا کفایت اللہ اور مولانا محمد علی وغیرہ نے تائید کی۔

محمد علی کی تائید | محمد علی کے ساتھ کنونشن میں جو سلوک ہوا تھا وہ معلوم ہے پھر نہر و رپورٹ کے بعد ان پر غداری، قوم فروشی اور تلون مزاجی کے جوازات لگے گئے تھے ان سے بھی سب وقت ہیں، اب ان کی تائیدی تقریر کا بھی ایک حصہ ملاحظہ فرمائیے کہ اعلان جنگ کے بعد بھی ایک ”شرف“ دشمن کی زبان سے کیا الفاظ کل سکتے ہیں۔

”میں انگریزی حکومت سے بیزار ہوں، میں دوسروں کو مجبور نہیں کرنا کہ وہ میرے ہنجال بن جائیں، میں تو انگریزی حکومت سے اس قدر بیزار ہوں کہ اگر مجھ کو انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کر نیکی لے ہندوؤں کی غلامی بھی قبول کرنی پڑے اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو تو میں اسے قبول کر لوں گا، میں اس مسلمان کو بزدل سمجھتا ہوں جو یہ کہتا ہے کہ جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں گے تو پھر کیا ہوگا! مسلمانوں کی زندگی ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوگی، میں اس اندیشہ کو اہمیت نہیں دیتا، میرے نزدیک ایک سچا مسلمان دس آدمیوں پر بھاری ہوتا ہے، کیا جنگ بدر اور خیگ احد میں مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی لیکن کامیابی و کامرانی کس کو حاصل ہوئی؟ مسلمانوں کو! میری خواہش یہ ہے کہ مصالحت ہو، امن ہو، اتحاد ہو، میری تحریروں اور تقریروں کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میں نے ابھی تک صلح کا دروازہ بند نہیں کیا ہے، میں صلح کو پسند کرتا ہوں اور امن و اتحاد کا حامی ہوں۔“

مفتی صاحب کی تائید | مفتی کفایت اللہ صاحب کی تقریر بہت خوب تھی، خاص حصہ یہ ہے۔

”میں جس ریزولوشن کی تائید کے لئے حاضر ہوا ہوں وہ ایک نہایت اہم ریزولوشن ہے، اور یہ ریزولوشن ایک ایسے جلسہ کی طرف سے ہے جو مسلم قومیت کے حقوق کی حفاظت کا ایک نمائندہ جلسہ ہے، اس میں ہر خیال اور ہر طبقے کے مسلمان شریک ہیں۔“

اب کسی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہ ہوگا کہ مسلمانوں نے ہر ور پورٹ کو تسلیم کیا ہے اگر کوئی شخص ایسا کہے گا تو اس کا کہنا غلط ہوگا اور یہ طرز عمل ایسا ہی ہوگا جس طرح کوئی شخص آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش سعی کرے، میں جمعیت علمائے ہند کی طرف سے اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔“

باب ۴۴

وائسرائے کا بیان

سلسلہ میں جب سرالکھم ہیلی اسمبلی کے ہوم ممبر تھے اس زمانہ میں انھوں نے ڈونین اسٹیٹس کی تعمیر و تعمیر میں سخت غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں ایسی کہ برل حضرات بھی مایوس ہو گئے تھے۔

لارڈ ارون کا تدبیر | لارڈ ارون نے یہ موقع غنیمت سمجھا کہ وہ ان غلط فہمیوں کو رفع کر دیں کہ اس وقت جو یہ شور و شر مہور ہا ہے اس میں بھی کمی ہو جائے گی، اور کیا عجیب ہے کہ کانگریس کا تعاون بھی حاصل کیا جاسکے چنانچہ وہ یورپ گئے اور واپس آکر انھوں نے اسمبلی کے ارکان کو مخاطب فرمایا جس میں یہ صاف صاف تشریح کر دی کہ ڈونین اسٹیٹس سیرماد کامل درجہ نوآبادیات ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

زعما کانگریس کا اجتماع | وائسرائے جس روز اپنا بیان دینے والے تھے اس وقت دوسرے مشائخان زیارت کے علاوہ کانگریس کے غیر اور محترم زعماء بھی مختلف مقامات سے زحمت سفر برداشت کر کے وہلی میں تشریف لے آئے تھے، اور منتظر تھے کہ نائب السلطنت بہادر کے ارشادات کہاں تک مایہ نعلی ثابت ہو سکتے ہیں؟

بالآخر وہ ساعت منظرہ آئی اور نہر کسی لہنی وائسرائے نے ایوان اسمبلی میں بقول بعض غلط فہمی "رفع کر دی۔"

کانگریس کا بیان | چنانچہ فوراً کانگریس کی طرف سے ایک محضر تیار ہوا جس میں وائسرائے

کے اس بیان کا شکریہ ادا کیا گیا، گول میز کانفرنس میں شرکت کا عزم ظاہر کیا گیا اور وہی زبان سے یہی کہا گیا کہ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ”ہر کسی لینی“ ہیں کانفرنس میں ہماری سٹشدہ رعایتیں بھی مرحمت فرمائیں گے اور اس طرح ہم اپنا مقصد حاصل کر لیں گے۔

وائسرائے کا اعلان | اس بیان پر پھر وائسرائے نے یہ اعلان کیا، تعین منزل کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ منزل کی قطع مسافت بھی کر چکے، قطع مسافت اسی وقت ہوگی جب آپ سفر شروع بھی کریں گے، ڈومنین اسٹیشن آپ کو اسی وقت ملے گا جب رفتہ رفتہ تدریجی طور سے آپ میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ اس بیان سے کانگریس پھر ”ناخوش“ ہو گئی اور اس نے ”آزاد کامل“ کا اعلان کر دیا۔

محمد علی کی روش | وہ بیان محمد علی کے پاس بھی گیا جس پر گاندھی جی، جواہر لال اور دوسرے زعماء کانگریس نے دستخط کئے تھے اور وائسرائے کی تعریف و توصیف کے بعد ”بہ اقرار اصلح“ گول میز کانفرنس کی شرکت پر آمادگی ظاہر کی گئی تھی بشرطیکہ اس میں درجہ مستورات کے ”اصول و ضوابط“ بھی متعین کرنے کی اجازت دیدی جائے، یا بہ الفاظ دیگر نہرو رپورٹ کی سرکاری تصدیق کر چکا۔ محمد علی نے اس بیان پر دستخط تو کئے لیکن ”یہ شرط“ انھوں نے بھی لگا دی، اگر میری ملت کو موثر نائنڈگی دی گئی تو میں گول میز کانفرنس میں شرکت پر آمادہ ہوں، بغیر اس کے اشتراک عمل مشکل ہے۔

بیان کا اثر | کانگریس یا گاندھی جی کے اس بیان کا ہندو پرس اور مسلم پرس نے خیر مقدم کیا مگر محمد علی کو اس میں بھی شرف ”جہاد“ حاصل ہوا۔

ان کی خوب مخالفت کی گئی، تمسخر کیا گیا، استہزاء کیا گیا کہ اگر کانگریس نے ڈومنین اسٹیشن کو مان لیا تو خیر، وائسرائے کے بیان پر مدحیہ کہہ کر اگر اس نے گول میز کانفرنس میں شرکت پر آمادگی

ظاہر کی تو یہ بھی زیادہ تعجب خیز نہیں ہو اس لئے کہ وہ تو درجہ مستعمرات کو بطور نصب العین کے بھی طے کر چکی ہو، مگر مولانا محمد علی نے اس بیان پر کچھ دستخط فرمائے، وہ تو کامل آزادی کے علمبردار تھے، انھوں نے خلافت کا نفرین کلکتہ میں آزادی کامل کا جھنڈا بلند کیا تھا، کنونشن ”میں انھوں نے سب سے زیادہ مخالفت تو اسی درجہ مستعمرات کی کی تھی، ان کا قلم دستخط کے لئے کیسے چلا؟

”برہان قاطع“ | اعتراض بہت وزنی ہے اور یہ ظاہر محمد علی کی شخصیت اور اصول پروری کو بڑی حد تک یہ ”برہان قاطع“ مجروح کر دیتی ہے کہ ایک طرف یہ بلند بانگ دعوای، یہ زبردست اعلان، یہ زبردست ادعا آزادی کامل ۱۔

دوسری طرف یہ تائید، یہ آمادگی اور وائسرائے کی دعوت کی یہ پذیرائی، قول و عمل کے تضاد کو کس قدر زیادہ نمایاں کر دیتی ہے اور اتنے دعوے پیش کر کے مزید دلیل یہ بھی پیش کی گئی کہ یہ سب فیابیطس کا اثر ہے کہ اتنا اچھا دماغ اس طرح خراب ہو جائے، اور مسلمان تقریباً اس سے محروم ہو جائیں، چنانچہ ایک دوسرے موقع پر ایک بڑی ذمہ دارجاعت کے اخبار نے ایک بتبدل پرچہ سے لے کر ”بیچارہ محمد علی پر لکھا تھا

کوئی خوبی نظر آتی نہیں تجھ میں ظالم لے فلک اپیری و صد عیب کہتے ہیں

غرض اس قسم کے براہین قاطعہ نے ایک بار پھر اسلامی پریس اور ہندو پریس میں ذرا ہماہمی پیدا کر دی۔

”مقاطعہ برہان“ | لیکن اگر سنجیدگی سے اس اعتراض پر غور کیجئے تو اس کی یہ اہمیت قطعاً باقی نہیں رہتی جس کا اظہار بڑے شد و مد سے ترش لب دلہجہ میں چڑھی ہوئی آستینوں اور متنی ہوئی رگوں میں ہوتا ہے۔

محمد علی یقیناً کانگریس کی طرح نہایت دیانت داری اور ایمان داری سے ”مکمل آزادی“

کے حامی تھے، بلکہ علیبر دار تھے۔

مدرس کانگریس | مدرس کانگریس میں جب ماسکو سے واپس کرپٹ جواہر لال نہرو نے ”آزادی کامل“ بطور نصب العین کے کانگریس سے منوانا چاہا تو وہ محمد علی ہی تھے جنہوں نے نہایت زوروں سے اس تجویز کی تائید کی اور پاس کرایا۔

مالوی جی کے اعتراضات | پھر مالوی جی نے جب اس ”سابق صدر کانگریس“ کی خلت سے عاجز آکر گھبرا نا شروع کیا، جس نے مالوی جی کو پریشان کر دیا تھا اور مالوی جی جو بڑی شدت سے اس تجویز کی مخالفت کے لئے اٹھے تھے، بالآخر انھیں خاموش ہونے پر مجبور کر دیا اور یہ وہی محمد علی تھا جس نے کانگریس کے کھلے جلسہ میں ملک معظم کو ”قانونی مخالف“، کھل کر ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی، پھر خلافت کانفرنس کلکتہ میں کامل آزادی کو محمد علی نے منظور کرایا، آل پارٹیز کانفرنس میں جو بعد کو ”مسلم کانفرنس“ کہلائی درجہ مستعمرات کو پاس نہیں ہونے دیا۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ اس نصب العین نے ایک تفریح و مذاق کی سی حیثیت اختیار کر لی ہے، جب گورنمنٹ کو دھکی دے کر کام نکالنا ہوا تو فوراً ”آزادی کامل“ کی تجویز پیش ہو گئی اور جب اس کی کسی بات سے خوش ہوئے تو پھر درجہ مستعمرات پر قناعت کر لی۔

ہندوستان میں یہی ایک جماعت ہو جو سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ مؤثر اور سب سے زیادہ عالمہ جماعت ہے، پھر وہ خود جب ”مصلحت وقت“ سے درجہ مستعمرات پر راضی ہو گئی تو محمد علی کو کون الزام دے سکتا ہے۔ سیاست کا قصداً یہی ہے کہ زمانہ کا ساتھ دو، آزادی کامل کے نصب العین کو ترک کر کے عارضی طور پر محمد علی اگر مستعمرات پر راضی ہو سکتے تھے تو ہمیں کوئی مضائقہ نہیں ہوا، عقیدہ ان کا بھی کانگریس

کی طرح وہی تھا جس کا انھوں نے، گول میز کانفرنس میں بے بائگ ڈھل اعلان بھی فرمادیا تھا کہ
”میں ڈومنین اسٹیٹس کا قائل نہیں، میں تو آزادی کامل کا خواہاں ہوں،
اور اس کے علاوہ کسی چیز پر راضی نہیں ہو سکتا۔“
سیاستہ عارضی طور پر طرز عمل کی تبدیلی کو نصب العین اور عقیدہ کا تغیر نہیں کہتے
اور اگر کہتے ہیں تو

ایں گناہیت کہ در شہر شمانیز کفند

جنوبی افریقہ

دعوت | چنانچہ جنوبی افریقہ کے مسلسل اور متعدد دعوتیں تشنہ کا مان زیارت کی آئیں، گو محمد علی وہاں کبھی نہیں گئے تھے لیکن ان کی شہرت وہاں پہنچ چکی تھی۔

بہر حال جب وہاں سے لگاتار دعوتیں آنے لگیں تو محمد علی کے لئے سوا اس کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ گیا کہ وہ یہ دعوت قبول کریں اور مسلسل کام کرنے سے ان کی صحت پر جو برا اثر پڑ رہا تھا، اس کو اسی بہانہ سے تباہ و برباد ہو کر ذریعہ بنائیں چنانچہ انہوں نے دعوت قبول کر لی اور روانگی پر آمادہ ہو گئے، اپنے احباب اور عقیدہ مندوں کو اطلاع بھی دے دی۔

عزم روانگی | اسی خیال سے اکتوبر ۱۹۲۹ء میں محمد علی جناحؒ روانہ ہوئے، اپنے تمام انتظامات

کمل کئے، اسباب سفر تیار ہوا، سامان بندھ گیا ٹکٹ لے لئے گئے اور وہ بس اب روانہ ہوا چاہتے ہی تھے۔

اہانت آمینر حکم | اکہ جنوبی افریقہ کے گورنر نے ایک نہایت اہانت آمینر شرط یہ لگائی کہ جنوبی افریقہ میں ان داخلہ اسی وقت ممکن ہو جب چند پونڈ بطور ضمانت کے جمع کر دیں، بہ صورت دیگر جنوبی افریقہ کے وار السلطنت میں انھیں داخل ہونے کی اجازت دینا گورنر صاحب کو منظور نہیں۔

اٹکار | محمد علی نے اس اہانت آمینر شرط کی تکمیل سے قطعاً انکار کر دیا اور اس صورت میں جانے سے معذوری ظاہر کی، نیز ایک تار فوراً گورنر کو دیا کہ اس قسم کے ہل شرائط کے بغیر انھیں وہاں داخلہ کی اجازت دیدیں اور یہ کہ وہ وہاں کسی سیاسی غرض سے نہیں جائے ہیں بلکہ صرف اپنے مسلمان بھائیوں سے تبادلہ خیالات کرنے اور ان کے حالات کے متعلق مشورہ کرنے، چنانچہ محمد علی نے جنرل ہرٹزوک گورنر افریقہ کے نام ایک تار دیا جس کے الفاظ یہ ہیں۔

تار | ”بہادر لوگ ہر جگہ بہادری کو پسند کرتے ہیں، جو لوگ اپنی عزت کرتے ہیں وہ دوسروں کی بھی عزت کرتے ہیں۔ ہمیں جو قوم بزرگی بہادری کے معترف ہیں ان شرائط کو معلوم کر کے بہت تکلیف ہوئی جن کو کوئی فرد بھی قوم بزرگ کا تسلیم نہ کرے گا، مہربانی کر کے میرے بھائی کی جماعت کو وہاں اور مجھے اور میرے غمزہ اہل و عیال کو یہاں موجودہ کشمکش سے نجات دلائے اور جن امور کا یقین ہم نے دیا تھا انھیں کی بنا پر اجازت بذریعہ برقی پیام عنایت فرمائے یہاں ایک انسان کی طرف سے ایک انسان سے کیجا رہی ہو۔ محمد علی صدقہ“

جواب | اس تار کا جنرل ہرٹز وگ کی طرف سے نہایت اہل اور حسب توقع وہی جواب آیا کہ ”آپ کا تار پہنچا، افسوس ہے کہ شرائط میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔“

وزیر داخلہ

جدوجہد | اس تار کے بعد محمد علی نے چاہا کہ گورنمنٹ اپنی اس ”نوا بادی“ کے اس احمقانہ طرز عمل کی اصلاح کرے، چنانچہ انھوں نے وائسرائے کو اس مطلب کا ایک تار دیا کہ وہ جنرل ہرٹز وگ کے اس غیر شریفانہ رویہ میں کچھ تغیر کرنے کی کوشش کریں۔ نیز ایک تار اپنے دوست میاں سر فضل حسین ممبر حکومت ہند کو دیا کہ وہ بھی اس معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کریں، عرصہ کے غور و فکر کے بعد حکومت ہند نے کسی قسم کی مداخلت سے انکار کر دیا تو اب ظاہر ہے کہ سر فضل حسین کی کیا چل سکتی تھی چنانچہ وہ بھی خاموش ہو رہے اور معذوری ظاہر کی۔

آخری تار | ان مسلسل کوششوں کے بعد محمد علی نے جنرل ہرٹز وگ کو ایک آخری تار دیا جو یقیناً ان کے قصور استبداد پر بجلی بن کر گرا ہو گا۔

محمد علی نے لکھا۔

”ہندوستان کی حکومت کو یہ سبق دینے پر کہ دوستانہ معروضات سے کس قدر توقع ہو سکتی ہے، بہت بہت شکریہ، ہم اب اس وقت آئیں گے جب آپ کو یہ سکھا دیا جائے گا کہ اسلام اور ہندوستان کا کس طرح احترام کیا جاتا ہے۔“

محمد علی صدر خلافت

کانگریس کی تجویز | اکتوبر ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا جس میں آئندہ صدارت کانگریس کے لئے پنڈت جواہر لال کا انتخاب ہوا تھا، اسی جلسہ میں مسٹر سروجنی ناتھ نے ایک تجویز پیش کی جس کا مفاد یہ تھا کہ علی برادران کے داخلہ

جنوبی افریقہ پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں، انہیں کانگریس سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے، مشرولینڈ بھائی ٹیل اور دوسرے کانگریسی حضرات نے اس تجویز کی پرزور تائید کی اور بالآخر یہ منظور ہو گئی۔

توقعات | جنوبی افریقہ نہ جا کر محمد علی نے اپنی خودداری کو تو برقرار رکھا اور اسے کوئی صدمہ نہیں پہنچے دیا، لیکن ایک دوسرا نقصان بھی کیا۔

مجلس خلافت کی مالی حالت عرصہ سے سقیم ہوتی جا رہی تھی وہ اگر وہاں جاتے تو یقیناً اتنا سرمایہ فراہم کر سکتے تھے کہ مجلس خلافت کی مالی حالت کسی نہ کسی حد تک استوار ہو جائے تاکہ اطمینان کے ساتھ وہ اپنے کام جاری رکھ سکے، چنانچہ ان کے ایک دوست انہیں لکھتے ہیں کہ

اپیش ٹرین کا انتظام | ”غلام معین الدین صاحب ابھی آئے ہیں، یہ وہاں کی ینگ مسلم سوسائٹی کے سکریٹری ہیں، انہیں آپ کے افریقہ نہ جانے کا سخت افسوس ہے، وہ کہتے تھے کہ اگر آپ افریقہ پہنچ جاتے تو تین چار لاکھ آسانی سے فراہم ہو جاتا، انکا بیان ہے کہ آپ کے استقبال کے لئے ایک اپیش ٹرین کا انتظام کیا جا رہا تھا، اور جس عمارت میں آپ کے ٹہرنے کا انتظام کیا گیا تھا وہ پچاس ہزار پونڈ کی لاگت سے تعمیر کی گئی ہے، آپ کے نہ پہنچنے سے مسلمانوں میں مایوسی پیدا ہو گئی ہے۔“

محمد علی پر ایک سنگین اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ ”زیر پرست“ بہت زیادہ تھے اس سے انکار نہیں کہ ان کی ضروریات روز افزون اور ان کے افلاس و ناداری نے انہیں بہت شکستہ حال اور تھیدست کر رکھا تھا اور وہ دوستوں اور قدروانوں کے

عطیوں کو قبول بھی فرمالیا کرتے تھے۔

مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس مالی اعانت نے ان کے عقائد و خیالات میں کسی قسم تغیر کیا ہو، وہ رہن منت ہونے کے باوجود ہمیشہ آزاد رہے اور کسی پابندی کو کبھی قبول نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو اسی فرقہ کے معاملہ میں تین چار لاکھ روپیہ پر اس آسانی سے وہ لات نہ مارتے۔

باب ۴

ساردا ایکٹ

محمد علی کی آخری جدوجہد ساردا بل کی تیئیس پر ختم ہوئی، اس بل کے خلاف وہ اگر سخت علیل اور صائب فراش نہ ہوتے تو یقیناً اپنی پوری کوششیں صرف کرتے اور اسے منسوخ کر کے دم لیتے، لیکن اس سے پہلے انھوں نے دم ہی دیدیا!

ساردا بل کیا تھا؟ | اجیر کے مسٹر ہربلاس ساردا نے اسمبلی میں ایک تجویز پیش کی کہ چونکہ علی العموم ہندوؤں میں یہ عادت قبیحہ پائی جاتی ہے کہ وہ نہایت کنسی میں بچوں اور بچیوں کی شادی کر دیتے ہیں جس کا اثر بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما، اخلاق و عادات اور صحت پر بہت برا پڑتا ہے، لہذا ایک ایسا قانون نافذ کیا جائے جس سے اس رسم کا افساد ہو سکے۔

ساردا بل محدود تھا | مگر اسمبلی کے ایک مسلمان ممبر نے اس بل کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ اس بل کو محدود نہ رکھا جائے بلکہ عام کر دیا جائے، اور اسے ہندوستان کی ساری قوموں پر بلا استثنا نافذ کیا جائے، ان کی تحریک پر بل کو ”منتخبہ مجلس“ کے سپرد کیا گیا اور بالآخر ہوا یہ کہ اسے سارے ہندوستان پر نافذ کر دیا گیا اور اب قانوناً کہیں بھی کسی صورت میں بھی کسی تابع لائے کی یا لڑکی کا عقد نکاح نہیں ہو سکتا۔

محمد علی کا اختلاف | پہلے پہل جب یہ بل اسمبلی میں پیش ہوا تو اس وقت علمائے سے کسی کو خیال بھی نہیں آیا، لیکن محمد علی نے اس وقت اس قانون کی مضرتوں کا اندازہ کر لیا تھا جو ان کے نقطہ نظر سے نہایت اہم تھیں، اس لئے انھوں نے اسی وقت ہندوؤں میں اس

پرسل مقالات و مضامین لکھے اور قوم کو متوجہ کیا کہ وہ اس قانون کا مقابلہ کرے اور نہ ہرگز نہ منظور ہونے لے اگر ہندو اپنے ہاں اس قسم کے قانون کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو چشم مارو شن دل ماشاد، لیکن مسلمانوں کو الحمد للہ کما قسم کی پابندیوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے اس لئے کہ ان کے ہاں اول تو یہ رسم بد پائی نہیں جاتی، اور اگر ان سے ایسا ارتکاب ہوتا ہے تو بالکل ناگزیر حالت میں۔

مسلمانوں میں خاموشی | لیکن ان مقالات اور صدائے احتجاج سے مسلمانوں میں کوئی حرکت نہیں پیدا ہوئی، وہ اسی طرح غافل ہے کہ جیسے سارو ابل پیش ہی نہیں ہو رہا ہے۔ اسی جمود و سکوت کی حالت میں یہ بل ”مجلس منتخبہ“ میں گھومتا رہا اور دوسری کارروائیاں ہوتی رہیں، شہادتیں لی جاتی رہیں اور کسی قسم کی کوئی صدائے احتجاج نہیں بلند ہوئی۔

مولانا احمد سعید کی شہادت | اپنا پنجہ جمعیتہ العلماء ہند کے محترم ناظم جناب مولانا احمد سعید صاحب نے بھی اس مجلس منتخبہ کے سامنے شہادت دی تھی اور اس بل کی مخالفت نہیں کی تھی۔ بہر حال بل کی غالباً دو خواندگیاں ہو گئیں، اب تیسری خواندگی کا جب وقت آیا تو پھر ایک پبلچ میج گئی، جمہور مسلمین میں بھی ایک خاص انہماک پیدا ہو گیا اور ملک کی دوسری جماعتیں بھی اس کے خلاف مصروف پیکار ہو گئیں چنانچہ جمعیتہ العلماء ہند اور مولانا احمد سعید صاحب نے بھی اس بل کی مخالفت میں بہت زیادہ جوش و سرگرمی کا اظہار کیا۔

محمد علی میدان علی میں | محمد علی اس زمانے میں سخت علیل تھے مگر جب اس کی تیسری خواندگی بھی قریب آن پہنچی اور گورنمنٹ کچھ بھی متاثر نہیں ہوئی اور اس کا احتمال پیدا ہو گیا کہ وہ اب ضرور ہی پاس ہو جائے گا تو ایک بار پھر محمد علی میدان علی میں آئے اور تحریر

تقریب سے اور ہر ممکن ذریعہ سے اس کی تیسخ کی جدوجہد کی، گو نتیجہ کچھ نہیں نکلا!
خواندگی ختم | آخر تیسری خواندگی بھی ختم ہو گئی اور سارو اہل مسلمانوں کی مخالفت اور سولاج
 پارٹی، پنڈت موتی لال، دوسرے ممبران اسمبلی اور بعض مسلم ممبران سولاج پارٹی کی حمایت
 سے منظور ہو گیا۔

منظوری کے بعد | اہل کے پاس ہو جانے کے بعد مسلمانوں میں حرکت بھی پیدا ہوئی جو
 بھی پیدا ہوا اور غیظ و غضب کی شکلیں بھی ماتھے پر پڑ گئیں لیکن اب اس کا منسوخ کرانا اتنا
 آسان نہیں تھا جتنا سمجھا جا رہا تھا۔

محمد علی کو دو گونا گونے | محمد علی کی ذات اس وقت اتنی قابل رحم تھی جتنی کبھی نہیں ہوئی
 تھی، بہت سخت علیل تھے، کانگریس کے خلاف مصروف پیکار وہ تھے، گورنمنٹ کے خلاف
 وہ تھے، مسلمانوں کی مختلف جماعتیں ان سے الجھ رہی تھیں، اسی زمانہ میں جمعیتہ علماء ہند
 کے کیمپ میں تبدیل ہو گئی تھی، غرض ہر طرف سے مقابلہ کی دعوت دی جا رہی تھی، اور زور
 بازو کا امتحان ہو رہا تھا۔

وہ غریب کس کس کو جواب دیتا، کس کس سے لڑتا، لیکن پھر بھی اس کے پاس
 ثبات میں نغزش نہیں آئی اور وہ اسی استقلال سے اپنا کام پورا کرتا رہا، جو اس کی طبیعت
 میسرہ تھی۔

قائم مقام دائرے کے نام خط | لارڈارون اس زمانہ میں ولایت گئے ہوئے تھے
 غالباً مدراس پریسیڈنسی کے گورنر لارڈ گوپچن ان کے قائم مقام تھے انھیں نے اس قانون
 پر تصدیقی دستخط ثبت کئے تھے۔

محمد علی بلیٹی میں اس وقت صاحب فزائش تھے، لیکن اپنی علالت کی انھوں نے

کوئی پروا نہیں کی اور ایک نہایت طول طویل مفصل مراسلہ دائرے کی خدمت میں بھیجا جس میں بدلائل مندرجہ ذیل یہ ثابت کیا تھا کہ کوئی مسلمان از روئے شرع مجبور نہیں ہو کہ ایک خاص عمر میں شادی کرے اور ایک خاص سن میں نہ کرے۔

دلائل | اسلام نے مسلمانوں کو اس باب میں بالکل آزاد رکھا ہے اور انسان کے مصالح اور ضروریات پر چھوڑ دیا ہے، مثلاً ایک ضعیف العمر باپ بستر مرگ پر پڑا دم توڑ رہا ہو، اس کے صرف ۶ سال کی ایک لڑکی ہو اور کچھ جائداد ہے، وہ چاہتا ہے کہ اپنے سائے کوئی ایسی صورت پیدا کرے کہ وہ اپنی بچی کی طرف سے مطمئن ہو جائے چنانچہ وہ اس لڑکی کا نکاح ایک لڑکے سے کر دیتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ اب ضروری انتظامات مکمل ہو گئے، وہ مطمئن ہو جاتا ہے، اور مر جاتا ہے۔

اور پھر اس نکاح کے یہ معنی نہیں کہ لڑکی اور لڑکا مجبور ہیں کہ اسے ”بیان وفا“ سمجھیں بلکہ بلوغ کے بعد ان دونوں میں سے ہر شخص کو اختیار ہو کہ وہ اگر اپنی اس ازواجی زندگی کو پسند نہیں کرتا ہے تو الگ ہو جائے۔

اس لئے مسلمانوں کو اس قانون کی کوئی ضرورت نہیں ہو جبکہ وہ شرعاً آزاد بھی ہیں جو پابندیاں یا آسانیاں ضروری تھیں ان کا بھی شرع نے کافی لحاظ رکھا ہے، آخر میں اس پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ میاں فضل حسین نے مسلمان ہونے کے باوجود اس قسم کے قانون کو کیسے منظور کرانے کی کوشش کی، وجہ ماف طور سے ”مداخلت فی الدین“ ہے۔

دائرے کا جواب | لیکن قائم مقام دائرے صاحب نے ان دلائل پر کوئی توجہ نہیں فرمائی اور قانون کو اپنے اختیارات سے منسوخ کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کی، حالانکہ اگر کجبت کا یا تخفیف مصارف کا مسئلہ ہوتا تو بغیر کسی تحریک کے ”ہر کسی یعنی“ کا قلم ”ڈیو“ کے عقیدہ

سے فائدہ اٹھا رہا ہوتا، لیکن چونکہ ایسا مسئلہ تھا جس سے گورنمنٹ کو براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا اس لئے اس پر ”معدوری“ ظاہر کی گئی۔

لارڈ ارون سے ملاقات | کچھ عرصہ کے بعد لارڈ ارون اپنے سفر یورپ سے واپس آ گئے۔ اب محمد علی کی صحت میں بھی کچھ بگالی آچکی تھی، چنانچہ اس مسئلہ کے متعلق وہ وائسرائے سے ملے اور ان کو بھی بہ دلائل سمجھا دیا کہ یہ مداخلت فی الدین ہے، اور گورنمنٹ کی پالیسی کے خلاف ہے، لہذا اسے منسوخ کر دینا چاہئے۔

وائسرائے کا جواب | لیکن ان تمام دلائل کو سننے کے بعد ہرائیس نے جواب دیا کہ مذہب معاشرت کی حدود جہاں متصادم ہوں، وہاں ایک مذہب اور تمدن حکومت کا فرض ہے کہ وہ معاشرت کا خیال رکھے! اور آخر میں انتہائی خوش فہمی سے یہ امید بھی ظاہر کی گئی کہ امید ہے آپ لوگ بھی اس ضرورت کا سختی سے احساس فرماتے ہوں گے اور مجھ سے متفق ہوں گے۔

محمد علی کا جوش ایا فانی | اس جواب سے محمد علی کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہوا اور اسی وقت انھوں نے نہایت جرأت و بیباکی سے لارڈ ارون کی غلط فہمی رفع کر دی کہ آپ نے ہم لوگوں کے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے، ہم قطعاً آپ کے ہمنوا نہ ہیں، نہ ہو سکتے ہیں اور اگر آپ اپنے اختیارات سے اس قانون کو منسوخ یا کم از کم مسلمانوں کو مستثنیٰ نہیں فرماتے ہیں تو پھر ہمارے آپ کی جنگ ہواور میں جاتے ہی اس قانون کی خلاف ورزی کروں گا، اور لوگوں کو اس پر آمادہ کروں گا کہ وہ بھی ایسا کریں۔

اس تقریر سے محمد علی کے بعض ”سرکاری“ رفقا کی جو حالت ہوئی وہ تو خیر ایک مصلو کا موقلم ہی پیش کر سکتا ہے، اس لئے اس سے قطع نظر کر کے اصل مقصد کی طرف رجوع کیجئے۔

لارڈ ارون کی ”درخواست“ | اس تقریر کے بعد لارڈ ارون نے ”درخواست“ کی کہ

آپ اس قانون کے خلاف جو چاہئے کیجئے، لیکن قانون کے حدود میں رہ کر اور حصول مقصد کے لئے وہی زیادہ بہتر صورت ہوگی۔

محمد علی کا جواب | محمد علی نے جواب دیا کہ مذہب کے معاملہ میں قانون اور آئین میرے سنگ راہ نہیں بن سکتے اگر ضرورت ہوگی تو میں مذہب کے لئے قانون شکن بن سکتا ہوں، اس لئے اس قسم کا وعدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس گرامر گھنٹہ کے بعد محمد علی واپس چلے آئے اور اپنی علی جدوجہد کا آغاز کر دیا جس کا ابھی پوسے طور سے آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ خود محرک اعلیٰ اجل کو لبیک کہہ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔

باب

”علماء کافر نس“

وفات سے ایک سال پیشتر محمد علی نے ایک جدید ”علماء کافر نس“ کی تائیس ”جمیعتہ علماء ہند“ کے مقابلہ میں کی تھی، ایسا کیوں ہوا؟ ذیل کے صفحات میں یہی جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے!

علماء پر محمد علی کے احسانات | غدر سے پیشتر ہندوستان کا یہ گرامی قدر طبقہ جس قدر سرفراز ہو گیا اور قدر و انبیاؤں کا مستحق تھا اس کا پورا پورا ثبوت ہندوستان کے مسلمانوں نے دیا، لیکن غدر کے بعد مسلمانوں کی عقیدت میں کمی آتی گئی اور رفتہ رفتہ علماء کے اقتدار کا انحطاط شروع ہو گیا۔ اب کے اباب و علل پر مفصل بحث کرنے کی ضرورت ہے، نہ کوئی خوشگوار موضوع اس لئے اسے قطع نظر کر کے اجالائیوں بچھ لیجئے کہ علماء کی عام طور سے حالت یہ تھی کہ گوشہ عزلت میں بیٹھے ہوئے وہ صرف درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے اور خود یہ فرائض کس نوعیت کے تھے اسے بھی چھوڑے۔

انگریزی تعلیمیافتہ اب یہ کہتے ہیں کہ سیاست اور چیز ہے اور مذہب دوسری چیز، لیکن ان لوگوں نے اپنے طرز عمل سے اس دعوے کی دلیل دینا کی۔

عموماً سو اس کے کہ وہ لوگوں کو مسئلہ مسائل کی تعلیم دیں یا صوفی ہو جائیں یا اگر کوئی گستاخی کرے تو اسے کافر کہیں، دوسرے فرائض و واجبات سے بہت کم دلچسپی لیتے تھے، چاہے مسلمانوں پر جتنی بڑی آفت کیوں نہ آجائے، چند مستثنیات سے قطع نظر کر کے بیشتر کی حالت

بھی تھی۔

سر یعقوب کا خیال | سر محمد یعقوب نے بالکل سچ کہا کہ

”محمد علی کی زندگی کے سب سے نمایاں اور درخشندہ دو کارنامے ہیں ایک سلاطین کی مذہبی جماعت میں بیداری اور سیاسی احساس پیدا کرنا ہے، حاشا وکلاء اس سے میرا مقصد حضرات علماء کی کسی طرح کی تحقیر یا تنقیص ہرگز نہیں ہے، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارے علماء مذہبی زندگی مساجد اور عربی مدارس میں بسر کرتے تھے اور سیاسی میدان سے وہ کوسوں دور تھے، علامہ شبلی علیہ الرحمۃ کی کوشش سے ندوۃ العلماء کی تحریک کے سلسلہ میں علماء کی ایک جماعت کو ضرورتاً زمانہ کا کچھ احساس ضرور پیدا ہو گیا تھا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ میں چند ایسے نوجوان عالم پیدا ہو گئے تھے جو مضطرب طور پر قدامت پرستی کی زنجیر کو توڑنا چاہتے تھے، لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ گوشہ عزلت میں بیٹھے دہلے علماء کو سیاسی پلیٹ فارم پر لانا محمد علی ہی کی جادو اثر کوششوں کا نتیجہ تھا، علماء اسلام کی جادو عمل میں اس انقلاب کے پیدا ہونے سے جو خوشخبریں نتائج آئندہ پیدا ہوں گے وہ ہمیشہ اس ملک کی تاریخ میں محمد علی کے نام کے ساتھ منسوب کئے جائیں گے“

جمعیتہ العلماء بحیثیت متبع کے | محمد علی کے مرشد مولانا عبد الباری مرحوم نے اس جمعیتہ کا سنگ بنیاد اپنے دستِ حق پرست سے رکھا اور رفتہ رفتہ اس جمعیتہ نے سارے ہندوستان میں اپنا اثر و اقتدار پیدا کر لیا اور سارے مسلمان اس کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

سیاست کیا تھی؟ | لیکن اگر کوئی یہ سوال کرے کہ جمعیتہ کے قیام کے وقت سے مسلمان

تک برابر مسلسل، غیر متقطع طور پر جمعیتہ العلماء ہند کا سیاسی نظریہ کیا تھا؟ وہ کس اصول سیاست کی پابند تھی؟ کن سیاسی لائنوں پر وہ اپنی قوم رہنمائی کرنا چاہتی تھی؟ اس کا مختصر لیکن نہایت جامع و مانع جواب یہ ہے کہ اس کی پالیسی وہ تھی جو محمد علی کی تھی، اس کا نظریہ وہ تھا جو محمد علی کا تھا اور اس کی سیاسی لائن وہ تھی جو محمد علی کی اختراع کی ہوئی۔ ہر جزئی سے جزئی معاملہ میں، ہر ہم سے ہم معاملہ میں، ہر نازک سے نازک وقت پر جمعیتہ العلماء نے بلا تامل و بلا تذبذب محمد علی کی رفاقت کی۔

”انکشاف راز“ | لیکن جس طرح عشق و محبت کا چھپا نا شکل ہوا اسی طرح تقلید کا راز بھی آخر ظاہر ہو کر رہتا ہے، جمعیتہ العلماء کا یہ نہایت معقول رویہ کہ وہ محمد علی کو اپنا قائد سمجھ رہی تھی اور چونکہ اس کے محترم ارکان سیاست کے فن سے نا آشنا تھے اس لئے اگر محمد علی کی سیاست پر انھوں نے اعتماد کیا تو گناہ کیا ہو گیا؟ محمد علی بھی تو آخر عربی نہیں جانتے تھے اور وہ برابر اپنے شکوک حضرت مفتی صاحب، مولانا احمد سعید صاحب وغیرہ سے رفع کر لیا کرتے تھے۔

لیکن مخالفین کو تو ایک موقع چاہئے چنانچہ انھوں نے جمعیتہ علماء کو بدنام ”کرافٹسریع“ کیا کہ جمعیتہ علماء محمد علی کی تابع مہل ہے، اس کے محترم ارکان محمد علی سے لرزتے ہیں اور ان کے خلاف ایک حرف کہنے کی جرأت نہیں رکھتے، محمد علی نے ان سب پر اپنی سیادت قائم کر لی ہے اور جرجی میں آتا ہے جائز ناجائز، مناسب غیر مناسب، سب ان لوگوں سے کام نکال لیتے ہیں اور یہ لوگ ایسے ”سادہ لوح“ ہیں کہ آئندہ کاربن جاتے ہیں۔

غرض اس قسم کے سفیانہ اور رکیک الزامات سے جمعیتہ علماء کو زیادہ سے زیادہ مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی۔

”آزادہ ردی کا فیصلہ“ | بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس قسم کے مسلسل اور مکر وہ پروپیگنڈے

کا اثر یہ ہوا کہ جمعیت کے محترم ارکان کے دل میں بھی یہ بات جم گئی کہ یہ بدنامی بڑی حد تک صحیح ہے کہ جمعیت نے اب تک محمد علی کی حمایت ہی کی مخالفت کبھی نہیں کی لہذا اب ذرا مخالفت بھی ہو جائے۔

اس پروپیگنڈے کا یہاں تک اثر ہوا کہ راقم الحروف نے خود جمعیت کے ایک محترم رکن سے یہ شکایت سنی کہ کوئی ”عالم“ بھی آج تک خلافت کا صدر ہوا ہے؟ پھر ہم جمعیت کا صدر محمد علی کو کیوں بنا دیں؟

بنار اختلاف | بدقسمتی سے اسی زمانہ میں جمعیت کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا اور صدارت کے لئے بعض حضرات کی طرف سے محمد علی کا نام پیش کر دیا گیا، اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی اور طے کر لیا گیا کہ محمد علی کی صدارت سے اختلاف کیا جائے گا اور اس میں پوری کوشش صرف کر دی جات گی۔

مراد آباد کا جلسہ | چنانچہ مراد آباد میں جمعیت کی مجلس مرکزیہ کا جلسہ ہوا اور اس میں صدارت کے لئے کشمکش شروع ہوئی، ایک جماعت تھی جو محمد علی کو صدر بنانا چاہتی تھی اور دوسری جماعت تھی جو ان کو کسی حالت میں بھی اس منصب گرامی کا اہل نہیں سمجھتی تھی، پہلے خوب گرامر مباحثیں ہوئیں اور بعد کو پھر فیصلہ یہی ہوا کہ صدارت کے لئے محمد علی کا نام منظور نہیں کیا گیا۔ یہ تھی وہ پہلی مخالفت جو جمعیت العلماء اور اس کے محترم اراکین کی جانب سے علی الاعلان پبلک پر ظاہر ہوئی۔

محمد علی کا رویہ | محمد علی ظاہر ہے کہ اس اختلاف اور اس فیصلہ سے خوش نہیں ہوئے اور انھیں یقیناً صدمہ ہوا کہ ان کو صدارت سے صرف اس لئے محروم کیا گیا کہ وہ سب یافتہ عالم نہیں تھے، ورنہ بہت سے عالموں سے بڑھ کر ”تو خود جمعیت کے محترم کارپرداز حضرات

بھی مانتے تھے۔

ایک دشمن حملہ | صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ محمد علی کی قابلیت اور عربی استعداد پر بھی طے کئے گئے۔

سنائے کہ جمعیت کے ایک محترم رکن نے برسرِ اجلاس فرمایا کہ محمد علی تو قرآن شریف تک غلط پڑھتے ہیں وہ صدارت کیا کر سکیں گے؟ گو یہ صدارت کے لئے صرف منجھ کی قابلیت بھی ضروری تھی؟ بہر حال ان دشمن اور افسوسناک کارروائیوں کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا، اور صدارت کے لئے ہندوستان کے مشہور مخدوم قوم اور خادم اسلام مولانا معین الدین صاحب مظلہ کا انتخاب ہوا جنہوں نے اس روش کے بعد صدارت قبول کرنے سے قطعاً انکار کر دیا اور مہر می سے بھی استعفیٰ دیدیا۔

محمد علی کے رفقا | لیکن جن لوگوں نے محمد علی کا نام صدارت کے لئے پیش کیا تھا، وہ اس ناکامی کے بعد جس کی بنیاد صرف تنگ خیالی اور غلط فہمی تھی، خاموش کیسے بیٹھ سکتے تھے؟ انھوں نے کہا کہ جب جمعیت العلماء کا دائرہ اس قدر تنگ ہو کہ اس کے اجلاس کا صدر محمد علی کا سامجا ہدراہ حق، عاشق رسول، شیفتہ مذہب، جاننازا سلام اور وسیع النظر عالم نہیں ہو سکتا تو یقیناً ایک جدید جمعیت العلماء کی ضرورت ہو جس میں اس قدر تنگ دلی کا مظاہر نہ ہو سکے، ان کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ علماء کی اکثریت اس خیال کی حامی نہیں ہے، وہ ضرور اپنی مجلس کا صدر نشین محمد علی کو بنانا چاہتی ہے۔

کانپور علماء کا نفرنس | چنانچہ کانپور میں ایک جدید جمعیت العلماء کی تاسیس وقوع میں آئی اور اس کے دائرہ عمل کو بنسبت اس جمعیت العلماء کے ذرا زیادہ وسیع کر دیا گیا تاکہ مسلمانوں کی ہر جماعت اور طبقہ اس سے اشتراک عمل کر سکے، مولانا عبدالمجید صاحب بدایونی مولانا

عبدالکافی، مولنا قاری شاہ سلیمان پھلوارومی، مولنا قطب الدین صاحب عبدالوالی،
اور دوسرے مشہور علمائے نے ایک دوسری جمعیت کے قیام پر آمادگی کا اظہار کیا۔

اجلاس | آخر کانپور میں دبیر مسلمہ میں علماء کانفرنس کا اجلاس محمد علی کی صدارت
میں شروع ہوا اور خیر و خوبی سے ختم ہوا۔

حاضرین | داخلہ ٹکٹ سے تھا، حاضرین کی تعداد پانچ ہزار سے کسی طرح کم نہیں تھی، اگرچہ
باد و باران کی کثرت نے حواس پریشان کر رکھے تھے، لیکن جوق جوق کانپور اور دوسرے
مقامات سے لوگ آکر شریک اجلاس ہو رہے تھے، جن میں سے ایک محمد علی کا یہ سوانح نگار
بھی تھا جس نے اس جلسہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

تحریک و تائید | مولنا عبدالماجد صاحب بدایونی نے صدارت کے لئے محمد علی کا نام
پیش کیا، اور جدید جمعیتہ العلماء کے قیام و تائید کی ضرورت اور باقی جمعیتہ کے طرز عمل پر
ایک مفصل تقریر کی، پھر محمد علی کا استحقاق بتایا اور بتلایا کہ محمد علی اپنی خصوصیات کی بنا پر اس
م منصب رفیع کے کس قدر زیادہ بہ نسبت دوسروں کے مستحق ہیں۔

تائید کرنے والوں میں مولنا عبدالکافی علامہ ثقہ الاسلام (بیبی)، قطب الدین عبدال
صاحب مولنا اجاز حسین پرنسپل مدرستہ الواعظین (لکھنؤ)، مولنا فاخر اور ہندوستان کے
بیسوں محترم علماء تھے۔

آپ باور فرمائے کہ تحریک و تائید کا ایسا عجیب و غریب منظر کم دیکھا گیا ہوگا۔
اتنے علمائے نے اپنی مختصر مختصر تقریروں میں محمد علی کی صدارت کی تائید کی کہ پہلے
اجلاس میں دوسری کارروائی کا وقت ہی نہیں رہا، سارا وقت اسی تائید میں صرف
ہو گیا، محمد علی کی عظمت و جلالت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ گروہ علماء کی اتنی

بڑی جماعت نے ان کی ہمنوائی کی، ان کو صدارت کا منصب بخشا اور ان کے مقابلہ میں ایک دوسری جمعیت قائم کر دی، اتنا بڑا ہنگامہ انھیں شخصیتوں کے لئے ہوتا ہے جو غیر معمولی جوہر کمال اپنے اندر رکھتی ہیں۔

خطبہ صدارت | اس تائید و تحریک کے بعد محمد علی باطل عربی وضع میں عجیبہ، عامہ باندھے، کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے اللہ اکبر کے نغزوں کے ساتھ مجمع نے اپنی سرست بے پایاں کا اظہار کیا۔

لیکن ان کی حالت کیا تھی؟ ایک دوسرے آدمی کے سہائے سے وہ کرسی پر شتر لاسکے کمزوری اور ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ خود اپنا خطبہ صدارت نہ پڑھ سکے، ایک دوسرے صاحب نے نایاب جس کا ایک اہم جزویہ ہو، علماء کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

”کیا تقہ فی الدین کا دروازہ ہمیشہ کسے بند ہو گیا؟ دنیا کے اسلام الہامیہ کی ہمیشہ ہمیشہ ممنون احسان رہے گی کہ انھوں نے تقہ فی الدین سے کام لے کر فقہ اسلام کو مرتب فرمایا، لیکن کیا انھیں کی درخشندہ مثال ہمارے لئے شمع ہدایت کا کام نہیں دیتی؟

میری غرض صرف اس قدر ہے کہ آپ کو یاد دلاؤں کہ اجتہاد کا دروازہ آپ لاکھ بند کریں، زندگی کا دروازہ آپ تاقیامت نہیں بند کر سکتے اور جب تک یہ دوسرا دروازہ کھلا ہوا ہے ہزاروں نئے مسائل آپ کے سامنے ایسے آئیں گے کہ ان کا حل آپ کو کرنا ہو گا اور اگر آپ نہ کریں گے تو ہم جیسے امی اور جہلان کا حل کرنے پر مجبور ہوں گے، یہ وہ مسائل نہیں کہ جو ان کے اربعہ کے سامنے پیش ہو چکے تھے اور جن کا حل انھوں نے قرآن کریم اور

احادیث نبوی کے تفقیہ سے خود فرمایا تھا، یہ نئے مسائل ہیں جو زندگی کی نئی
افزوں پیدگی کے باعث پہلی بار نوع انسانی کے سامنے آتے رہتے ہیں اور
ان کے حل کرنے سے خواہ وہ حل صحیح ہو یا غلط انسان گریز نہیں کر سکتا کیا
آپ چاہتے ہیں کہ ان کا حل ہم جیسے امی اور جاہل کریں جنہیں نہ قرآن کریم پر
عبور ہے نہ احادیث نبوی پر یا آپ جیسے علماء کرام جنہوں نے اپنی زندگی
انہیں کے مطالعہ کیلئے وقف کر دی ہیں، میں نہایت دسب عرض کروں گا
کہ اس قسم کے اجتہاد سے اجتناب ہی نے ہماری آج یہ حالت کر دی ہے
کہ ہم عہد حاضرہ کے فتنوں میں مبتلا ہو گئے ہیں اور جوں جوں ان سے نکلنا
چاہتے ہیں اور ان میں گرفتار ہو جاتے ہیں جس فلسفی شاعر نے ملت
اسلامیہ کو فرحیات سکھایا ہے اس کے یہ بھی شعر ہیں۔

بزم اقوام کہن ہر بزم ازو شاخسار زندگی بے نم ازو
جلوہ اش مارا زابیکا نہ کرد ساز مارا از نو ابیکا نہ کرد
از دل ما آتش دیرینہ برد نور و نار لا الہ الا سینیہ برد

اگر ہم نے عہد حاضرہ کے فتنوں کا نور و نار لا الہ سے مقابلہ کیا ہوتا اور اجتہاد
وجہاد دونوں کو جاری رکھا ہوتا تو آج ہم اس زمانہ انحطاط تک پہنچے ہوتے؟

باب ۲۸

لاہور کا قومی ہفتہ

لاہور کی علماء کانفرنس کے بعد آخر دسمبر ۱۹۲۵ء میں محمد علی نے لاہور کا رخ کیا، جہاں قومی ہفتہ منایا جا رہا تھا اور کانگریس و خلافت کے سالانہ اجلاس ہو رہے تھے۔

گاندھی جی سے گفتگو | کانگریس کا یہ سالانہ جلسہ نہایت اہم تھا، کلکتہ میں گاندھی جی نے وائسرائے اور برطانیہ کو ایک سال کی جو مہلت دی تھی وہ ختم ہو گئی تھی اور اب دریائے راوی کے کنارہ آزادی کا لہر چمک رہا تھا، اس لئے کہ اس مہلت گورنمنٹ نے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھایا، اور ہندوستان کو درجہ ستمرات نہیں دیا۔

لیکن محمد علی نے کانگریس کے فیصلہ اور خلافت کی آئندہ پالیسی متعین کرنے پر پیشتر گاندھی جی سے آخری گفتگو کر لینا ضروری خیال فرمایا۔

چنانچہ وہ گاندھی جی سے ملے اور انکو سمجھایا کہ اگر اب بھی آپ عام مسلمانوں کے مطالبات منظور کر لیں اور شکایات رفع کر دیں تو ہمارا اشتراک عمل حاصل کر سکتے ہیں اور پھر نہایت اہم آہنگی سے مسلمان آپ کا ساتھ دیں گے اور دونوں ساتھ ہی سبھی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوں گے۔

گاندھی جی کا جواب | لیکن گاندھی جی اس وقت ”کامل آزادی“ کے خیال میں تھے وہ اپنی راہ عمل میں کسی قسم کی پابندیاں حائل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے، انھوں نے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ اب تو ہم آزادی کامل کے لئے اپنی جدوجہد کا آغاز کر رہے ہیں لہذا

اس وقت تو آپ غیر مشروط طور سے ہمارا ساتھ دیجئے، پھر آزادی حاصل کرنے کے بعد آپ کے مطالبات پر غور کیا جائے گا اور حقوق کی تقسیم ہوتی رہے گی لیکن ابھی یہ ممکن نہیں ہے، محمد علی پراثر | اپنی کوششوں کی ناکامی سے محمد علی بہت مایوس ہوئے اور اب ان کے لئے کوئی چارہ کار نہیں باقی رہ گیا کہ وہ کانگریس کیساتھ اشتراک عمل کر سکیں۔ اس لئے کہ آزادی کا مل و ناقص کے متعدد دوران کے سامنے تھے اور وہ خوب سمجھتے تھے کہ یہ

بہم گش گیر تا بہتپ رضی شود

کے ہمہ گیر اصول کے مطابق صرف درجہ مستعمرات لینے کی تیاریاں ہیں، اس لئے وہ تصفیہ حقوق پر مصر رہے اور آخر مجبوراً انھیں اپنی راہ عمل الگ متعین کرنی پڑی۔

خلیج اختلاف | لاہور کے قومی ہفتہ سے جو آگ سلگ ہی تھی بھڑک اٹھی اور مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے فیصلہ کیا کہ وہ کانگریس سے اپنا رشتہ منقطع کر کے خود اپنے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کرے اور اسکے بعد اپنی منزل مقصود کی طرف رجعت کرے۔

اجلاس کے اختتام کے بعد بھی اور اس سے پہلے بھی محمد علی پر بہت زور ڈالا گیا کہ وہ ”غیر مشروط“ طور پر تھیما رڈالیں، مگر انھوں نے انکار کر دیا۔

اختلاف مسلمانوں میں | جو مسلمان کانگریس کے ہمنوا تھے وہ خلافت کا نفرنس کے اس فیصلہ کے بعد اور کانگریس سے علیحدگی کے بعد بہت برہم ہوئے اور آپس کے یہ اختلافات روز بروز بڑھتے گئے محمد علی پر رجعت پسندی کا الزام بھی لگایا گیا۔

مگر وہ ان چیزوں سے متاثر نہیں ہوئے، مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کا بیج محمد علی نے بویا تھا، مسلمانوں کو گورنمنٹ کے خلاف محمد علی ہی نے صفت آرا کیا تھا اور

مسلمانوں میں اشیاء و قربانی کے جذبات محمد علی ہی نے پیدا کئے تھے اگر وہ اپنے ضمیر کی
پیروی میں کانگریس سے علیحدہ ہوئے تھے تو اس کے یسینی نہ تھے کہ وہ محبت پسند ہو جاتے
یا حکومت کے دام فریب میں پھنس جاتے۔
ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جھٹکے میں جسے غرور ہو آئے کرے شمار مجھے

باب ۴۹

گول میز کانفرنس

کانگریس کے متعلق محمد علی کے تاثرات و خیالات اور محسوسات و جذبات کا ذکر ہو چکا ہے، یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے انہیں بالآخر کانگریس سے دل برداشتہ کر دیا۔

دعوت کیوں قبول کی | محمد علی نے اپنی خطرناک علالت کے باوجود یہ طویل طویل جرت سفر کیوں برداشت کی اور کیوں نہ جانے کس معذوری ظاہر کر دی، یہ ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے لیکن محمد علی کے لئے اس کے سوا چارہ کار کیا تھا؟ کانگریس کی جو روش تھی اس سے وہ مایوس ہو چکے تھے، گول میز کانفرنس کے لئے جن مندوبین کا انتخاب عمل میں آیا تھا، ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو محمد علی کی طرح قوم کا درد اپنے دل میں رکھتا ہو، یا محمد علی کے خیالات و معتقدات سے اتفاق رکھتا ہو، اس لئے بجا طور سے انہیں خیال تھا کہ گول میز کانفرنس میں بغیر ان کے گئے ہوئے مسلمانوں کی صحیح ترجمانی نہیں ہو سکتی، اپنے ان خیالات کا اظہار انہوں نے اپنی مکتوب بنام مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی میں بھی کیا تھا، لوگوں نے لاکھ لاکھ بھجایا نثیب و فراز کی طرف رہنمائی کی صحت کے خطرات سے آگاہ کیا، سب جن کے مگر محمد علی جو عزم کر چکے تھے اس سے انہوں نے رجوع نہیں کیا، ان کا تو اس پر عمل تھا۔

تاصح کہے سنے پہ ہمارا نہیں عمل جو دل میں آگیا وہ کیا کوئی کچھ کہے

مظاہرہ کا اندیشہ | محمد علی کی خبر روانگی جب مشہور ہوئی تو بمبئی کے بعض مدعیان

حریت نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ مندوبین گول میز کانفرنس کو سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ الوداع کہیں گے اور اس کے انتظامات بھی مکمل ہو چکے تھے اور اعلان کر دیا گیا تھا کہ مندوبین کی روانگی کے روز مظاہرہ کیا جائے گا۔

مسلمان بھتیجی اس خبر سے سخت مشتعل ہوئے وہ اسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے محترم رہنما کو سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ الوداع کہا جائے، انھوں نے بھی پورے طور سے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے اس سردار کو پھولوں اور باروں اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ الوداع کہیں گے، خواہ اس میں تصادم ہی کیوں نہ ہو جائے۔

اس خبر وحشت اثر ”نے مخالفین کے کیپ میں تہلکہ ڈال دیا اور مجبوراً یہ ارادہ فسخ کر دینا پڑا، محمد علی بھائی نے اپنے بہت سے مخلصوں اور عقیدت کیٹوں کی دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کے ساتھ روانہ ہو گئے، مشتاقان زیارت اس وقت تک جہاز کی طرف ٹکٹ لگا لگائے رہے جب تک جہاز انکھوں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

تبادلہ خیالات | یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ محمد علی کس حال زار کے ساتھ لندن پہنچے تھے لیکن چونکہ دل سے کام کی لوگی ہوئی تھی اس لئے انھوں نے اپنی صحت سے بے نیاز ہو کر مستعدی اور کارگزاری کی انتہا کر دی، وزراء و اُمراء اور مدیران جرائد سے مسلسل تبادلہ خیالات کیا، انھیں ہندوستان کے حالات بتائے، سیاسی پیچیدگیاں سمجھائیں، ہندو مسلم اختلافات کی سیاسی اہمیت بتلائی، غرض تمام حالات آئینہ کر کے رکھ دیے۔

مکتوب بنام مولنا عرفان | اپنے ایک خط میں جو مولنا عرفان صاحب کو لکھا گیا تھا، پہلے تو اپنی علالت کا مفصل تذکرہ کیا ہے، پھر فرمایا ہے کہ۔

”اس پر بھی وہ کام کر رہا ہوں جو نہ کسی سے ہو سکتا ہے، نہ کرتا ہے، بااثر

محمد علی کی شخصیت | محمد علی نے جب میدان سیاست میں قدم رکھا، تو اسے میدان خالی نہیں ملا، قبل و بعد ہر زمانہ میں رقیبوں اور حریفوں کی گرم بازاری رہی، مخالفوں اور دشمنوں کی جماعت کی جماعت اسے تمام سامانِ اسلحہ سے مسلح ملی، لیکن جب وہ آسان سیاست و صحافت سے طلوع ہوا، تو اس کی ضیاء باریوں سے ایک عالم جگمگا اٹھا اور دوسرے تارے ماند پڑ گئے؛ انگلشن وطن میں اس کی نہایت یزیدوں نے باغ و چین کے ہر گوشہ کو معطر بنا دیا، پر دوسرے پھولوں کی خوشبو جاتی رہی، نیتان سیاست و قیادت میں وہ جب ایک شیر کی طرح دھاڑا تو شمال و دریاہ نے بھٹ تلاش کرنے شروع کر دیے! اس کے سامنے کوئی بھی پیش نہ پاسکا، یہ داغ بڑا سخت تھا اور اسی داغ نے محمد علی کے سیکڑوں دشمن پیدا کر دیے۔

بہ گیر اختلاف | ان دشمنوں نے اس کی زندگی اجیرن کر دی وہ اگر دن کو دن کہتا تھا تو یارانِ بزم اسے شب بلا ثابت کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دیتے تھے جب وہ کہتا تھا کانگریس سے تعاون کرو تو ایوانِ تبلیغ سے یہ صدا بلند ہوتی تھی کہ یہ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی اور اسلام کے ساتھ غدار ہی ہے، کانگریس میں شریک ہونا اپنے مذہب اور اپنی قوم کے ساتھ دشمنی کرنا ہے، پر جب اس نے کانگریس سے تعاون منسوخ قرار دیا تو پھر اسی ایوانِ تبلیغ سے صدا بلند ہوئی کہ ”کانگریس سے علیحدگی مسلمانوں کی سیاسی خودکشی ہے“

میں ہوا کا فرق تو وہ کافر مسلمان ہو گیا!

جب اس نے ابنِ سعود کی حمایت کی تو ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور جب اس نے اپنی تحقیقات کے بعد مخالفت کی تو اس کے مخالف پھر اس کے مخالف ہو گئے، جو اس نے کہا دوسروں نے اس کی تردید کی۔

غرض وہ جب تک زندہ رہا اس کی مخالفت کے لئے ایک جماعت تیار رہی اس کو

ذلیل کرنے کے لئے ایک گروہ ہمہ تن مستعد رہا اور جب وہ مر گیا! تو آج وہ انہیں مخالفین کی نظروں میں ”رئیس الاحرار“ ہے، سید قوم ہے، مخدوم ملت ہے، شہید راہ حریت ہے و فاکش و فاپرست ہے، رہنما ہے، قائد ہے، ولی ہے، سب کچھ ہے مگر آج سے ایک سال پہلے وہ غدار کے سوا کچھ نہ تھا، فیا للعجب!

کی مے قتل کے بعد اس نے فجأت تو یہ!

سلسلہ پروپیگنڈا | محمد علی کے خلاف جتنا پروپیگنڈا ہوا شاید دنیا میں کم کسی کے لئے ہوا ہوگا، مسلم اخبارات نے اس پر ”النباء العظیم“، ”حدیث الغاشیہ“ اور طرح طرح کے مقالات اقتضائیہ ”سپیکل قلم“ کے اور ہر طرح اس کی قبا ر قیادت کی دھجیاں فضا آسمانی میں بزم خود اڑائیں اور ہندو اخبارات نے اس پر اپنی مشق قلم کی انتہا کر دی، قوم فروش، غدار ملک، بد عقل بد دماغ، بد زبان، دیوانہ ملا اور اس طرح کے بیسیوں خطابات والقباب سے یاد کیا۔

جب وہ کانگریس کا حامی تھا تو مسلم اخبارات اس پر زبان طعن و راز کر رہے تھے، اب اس پر سب دھم کی بوجھا کر رہے تھے اور اسے اسلام و ملت اسلامیہ کا اعدا و بلکہ الدانحصام ثابت کر رہے تھے اور بڑے فخر سے اظہار فرماتے تھے کہ ہم نے محمد علی کی قیادت کا حاتمہ کر ڈالا اور جب اس نے کانگریس سے اختلاف کیا تو سارا ہندو پریس اس کا مخالف ہو گیا، کانگریسی مسلمان اخبارات اس کے دشمن ہو گئے، حتیٰ کہ ایسوسی ایٹڈ پریس اور فری پریس تک نے اس کے متعلق وہ وہ انکشافات کئے کہ دنیا انگشت بنداں رہ گئی، مگر نہ ان خبر رساں ایجنسیوں کو اس کذب مبین کی نشر و اشاعت سے شرم آئی اور نہ ان اخبارات کو جنہوں نے ان خبروں کی نشر و تبلیغ بڑی بڑی ”سنسنی خیز“ سرخیوں کے ساتھ چارچا را اور پانچ پانچ سطروں کے عنوانات کے ساتھ کی، ان خبر رساں ایجنسیوں کا وظیفہ مہیات محمد علی کے

متعلق بے سرو پا خبروں کا اجراء تھا اور ان اخبارات کا مشغلہ تفریح ان کی اشاعت۔
 ہر شخص خوش تھا کہ اس نے محمد علی کا خوب مقابلہ کیا، اور ہر اخبار اعلان کرتا تھا کہ
 محمد علی کی زندگی پر جیسی روشنی ”کتاب وسنت“ کی روشنی میں وہ ڈال سکتا ہے، اور
 کوئی اس کا راہم کو اس حسن و خوبی کے ساتھ نہیں انجام دے سکتا! اور پھر صرف ہندوستان
 ہی میں نہیں، ممالک غیر میں اس کے خلاف پمفلٹ شائع کئے گئے، مضامین لکھے گئے،
 اور طرح طرح کے عجیب و غریب الزامات لگا کر اسے ہر طرح سے دشمن انسانیت ثابت کیا گیا
 اور نہایت اطمینان و مسرت سے بغیر دل کی دھڑک اور قلب کے اضطراب کے!
تہمت تراشیاں | پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا کہ اس کے اور طرح طرح کے الزامات لگائے
 گئے ہوں اور خاموشی اختیار کر لی گئی ہو، اس کو گالیاں دی گئی ہوں اور صبر کر لیا گیا ہو،
 اس کو غدار قوم و ملک ثابت کیا ہو اور اطمینان حاصل ہو گیا ہو، اسے دشمن کا گمراہ یعنی دشمن
 اسلام مشہور کیا گیا ہو اور اس پر قناعت بھی کر لی گئی ہو بلکہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھایا
 گیا، اس پر ہر قسم کے جائز و ناجائز، مناسب اور غیر مناسب، صحیح اور غلط اتہامات لگائے
 گئے، تہمتیں لگائی گئیں، کبھی یہ مشہور کیا گیا کہ وہ امیر افغانستان سے ساز باز کر رہا ہے، اور
 عنقریب ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے، اور اس شبہ کو اتنی تقویت دی گئی کہ سرسید اور
 مالوی جی نے گاندھی جی کو پوری شد و مد سے یقین دلانا چاہا، اور جب انہیں باور نہیں
 آیا تو پھر اس زمانہ کے وائسرائے لارڈ رڈینگ کے مشکوکے معنی تک یہ خبر وحشت افزا پنچا کر
 اپنی مظلومیت اور وفا داری کی واو چاہی گئی اور اس خطرہ کے اسناد کے لئے کسلیسی
 کی توجہ مبذول کرائی گئی۔

کبھی یہ الزام لگایا کہ محمد علی صوبہ سرحد، سندھ اور پنجاب وغیرہ کے اتنے حامی کیوں

ہیں، ہونہ ہو اس میں کوئی اہم بات پوشیدہ ہے اور وہ سوا اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اتحاد اسلامی کی کوشش کر رہے ہیں اور اس طرح جب وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے تو پھر ہندوستان پر کسی اسلامی حکومت کا قبضہ کرا دیں گے اور اگر یہ فرض محال ایسا نہ ہو سکا تو یہ ضرور ہے کہ وہ مسلم راج قائم کریں گے اور ہندوستان کی ”مرکزی حکومت“ کو سخت نقصان پہنچائیں گے، کبھی ازراہ غایت محبت و شفقت نہایت ہمدردی اور انوس کے بیچ میں یہ شائع کیا گیا کہ محمد علی مسلم یونیورسٹی کی پروڈانٹس چانسلرشپ کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں اور عقرب ملت ان کی ”رہنمائی“ سے محروم ہو جائے گی، وہ تو تردید کر رہے ہیں لیکن اخبارات ہیں کہ تردید کے بجائے صل ”افواہ“ مزے لے لے کر شائع کر رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں کہ بڑی قومی خدمت ہم سے انجام پا رہی ہے۔

قیادت کا اعتراف | لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس سخت ترین افتراق و اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی محمد علی کی قیادت کا ہمیشہ سب کو اعتراف رہا، کسی نے بھی ان کی خصوصیات قیادت سے انکار نہیں کیا، منکر سب ہے، لیکن جب کوئی وقت پڑا تو اسی آبر و باحتہ، بد و مانع، بد زبان لیڈر کو بلا لیا گیا، اسی کے دامن تدبیر میں پناہ لی گئی، اسی سے قیادت و رہنمائی کی التجا کی گئی اور جب وہ ”وقت بد“ گزر گیا تو پھر آزاد، پھر بے باک، پھر سب و شتم میں طاق، پھر محمد علی کے مخالف، پھر اس کی قیادت کے دشمن اور پھر خود سب سے بڑے مدبر سب سے بڑے قائد، سب سے بڑے رہنما سب سے بڑے مصلحت شناس اور دور اندیش، ہمدرد قوم اور بہی خواہ وطن، پروانہ شمع حرم، اور اسیر دام بت پر فن۔

اسی طرح جب کوئی نازک مرحلہ پیش ہوا تو محمد علی کی یاد آئی اور جب وہ مصیبت طل گئی تو پھر محمد علی کی مخالفت طرہ امتیاز و افتخار!

کانگریس کی صدارت | محمد علی کے اعتراف قیادت کا سب سے بڑا ثبوت ان کی صدارت کانگریس ہوا اور وہ بھی بالاتفاق بالاجماع۔

کانگریس میں دو تین سال کی شرکت کے بعد یہ ”عہدہ بلند“ کسی کو نہیں ملا لیکن محمد علی نے یہ ”شرف“ حاصل کیا، اور دو ہی تین سال کی قلیل مدت میں باخبر حضرات تھیں ہیں کہ یہ عہدہ کن کن مصیبتوں اور آزمائشوں کے بعد ملا ہے۔ مگر محمد علی بغیر کسی کوشش کے نہایت قلیل عرصہ میں صدر منتخب ہوئے اور وہ بھی اس حالت میں کہ ان کی ”کنوینسنگ“ کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا، اس لئے کہ وہ جیل میں تھے پھر جب رہا ہوئے تو یہ خبر سنی کہ بالاتفاق تمام صوبہ کانگریس کمیٹیوں نے آپ کو صدر منتخب کیا ہے، اور کوئی ہوتا تو۔

بریں فردہ گر جاں فشانم رواست

کھ کر کچھ دیر کے لئے تو ضرور کسی دوسرے عالم میں پہنچ جاتا، لیکن محمد علی کی حالت دوسری تھی، انھوں نے کانگریس کی صدارت قبول کی اور ”لا غالب اللہ“ اور ”بسم اللہ“ سے اپنا خطبہ صدارت شروع کیا، اپنی صدارت ہی کے زمانہ میں انھوں نے یہ اعلان کیا کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے میں ایک فاسق و فاجر مسلمان کو گاندھی جی سے اچھا سمجھتا ہوں جس پر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا، لیکن وہ یہی کہے گئے اور اس اختلاف و مخالفت کی بالکل پروا نہیں کی۔

یڈر گر محمد علی | اس کی ایک طرف تو مخالفت ہوتی رہی، دوسری طرف اس کے قدم لئے جاتے رہے، عقیدت کی آنکھیں اس کی راہ میں بھٹی رہیں، اس کا اقتدار، اس کی شہرت، اور اس کی ہمہ گیر قیادت کا ڈکٹمنج رہا تھا اور ہر شخص اس کے جوہر کمال کا معترف تھا۔

جس زمانہ میں اس کی قیادت کا شباب تھا اس نے سیکڑوں ذروں کو آفتاب بنا کر چھوڑ دیا، سادات بارہہ اور بعض شعرائے دہلی دکھنوں کو اگر یہ افتخار حاصل ہے کہ اول الذکر حضرات جسے چاہتے تھے بادشاہ بناتے تھے اور موزالذکر بزرگ جسے چاہتے ایک نظر کیسا اثر ڈال کر شاعر بناتے تھے، اسی طرح خدا نے محمد علی میں یہ ملکہ ودیعت کیا تھا کہ جس پر انکی نظر گرے وہ خاک سے پاک ہو گیا اور دیکھتے دیکھتے لیڈری کا تمغہ اسے حاصل ہو گیا اور پھر بعد کو اسی نے سب زیادہ محمد علی کی مخالفت کی۔

دشمنوں کا نزعہ | محمد علی اپنی رائے کے اظہار میں، دوستوں کی نکتہ چینی میں، دشمنوں کی سرکوبی میں کسی شخص سے، کسی جماعت سے کسی قوت سے نہیں ڈرتے تھے۔ تقریر میں ان کی زبان تلوار کا کام کرتی تھی، تحریر میں ان کا قلم نیزے سے کم نہ تھا، اس وجہ سے ایک زمانہ انکا دشمن تھا، مقتدر افراد نے با اثر جماعتوں نے، اولعزم حکومتوں نے انھیں بدنام کرنے کی جتنی کوششیں کیں وہ شاید ہی کسی اور کے خلاف کی گئی ہوں۔ ان کی ذات کو ان کے خیالات کو ان کے عمل کو حریفوں نے بیدردی سے مسخ کر کے دکھایا اور آج تک دکھایا ہے۔

پھر بھی عام مقبولیت | ان تمام باتوں کے باوجود محمد علی کی عام مقبولیت بدستور باقی رہی، عوام اب تک اس کی جے کا سے بھرتے ہیں اور اسے اپنا صحیح رہتا مانتے ہیں، ہے خواص تو کچھ حامی، کچھ مخالف، کچھ دعا گو! بہر حال اس منہگامہ میں محمد علی کی شخصیت گم ہو کے رہ گئی۔

لیکن اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو اندازہ ہو گا کہ وہ آخر وقت تک زعم رہا، گو اس کے خلاف سارا جہان صفت آزار رہا، اس نے اپنی قوم کو جو حکم دیا، قوم نے اسکی اطاعت

کی، گزشتہ تحریک کے متعلق چاہے جتنے اعداد و شمار پیش کئے جائیں لیکن یہ واقعہ کہ مسلمان من حیث القوم نہیں شریک ہوئے۔

ان تمام حقیقتوں پر غور کرنے کے بعد عقل اسی نتیجہ پہنچتی ہے کہ محمد علی سب سے زیادہ کامیاب لیڈر تھا۔ لیکن سب سے زیادہ بے نصیب! اس نے جو چاہا وہ ہوا، لیکن جو کہا اس کی مخالفت ہوئی! اس نے جب اپنی قوم کو مصروف عمل کیا وہ مصروف عمل ہوئی، لیکن مخالفین کا گردہ اسے گایاں دیتا رہا! یہ ہے محمد علی کی چند سالہ جدوجہد کا ایک مرقع۔

ورق تمام ہوا اور مرج باقی ہے
سفینہ چاہئے اس بحیرہ بیکراں کیلئے

